U21948.   8-12-07

Title - IFADAAT-E-MEHDI

Creator - Murattiba Mehdi Begum.

Publisher - Sultan Book Dipo (Hyderabad)

Date - 1956

Pages - 342

Subjects - Urdu Adab - Tanqeed; Urdu Adab Mazameen.

تلک آثارنا تدل علینا، فانظروا بعدنا الی الآثار

افاداتِ مہدی

یعنی

نامور انشا پرداز، ایم مہدی حسن مرحوم "افادی الاقتصادی" کا

مجموعۂ مضامین

مرتبہ

"مہدی بیگم"

"مع مقدمہ و سوانح مصنف و ضمیمہ جات"

بفرمائش شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

تعلیمی پریس لاہور میں باہتمام ملک نور الٰہی پرنٹر چھپا اور شیخ مبارک علی نے چھپوا کر شائع کیا

سنہ ۱۳۶۸ھ — طبع چہارم — سنہ ۱۹۴۹ء

دیباچہ

از

مولینا عبدالماجد صاحب بی اے

حضرت "مہدی" کی شخصیت و مرتبۂ انشاپردازی پر جو کچھ عرض کرنا تھا اسے اس تعزیت نامہ میں عرض کرچکا ہوں، جو ان کی وفات پر اخبار "ہمدم لکھنؤ" میں شائع ہوا تھا اور جس کی نقل اس مجموعہ کے آخر میں بھی شامل کردی گئی ہے، یہاں اس مجموعہ سے متعلق مختصراً چند امور گذارش کرنے ہیں،

۱۔ یہ مجموعۂ اوراق کوئی مرتب کتاب نہیں، متفرق مضامین یکجا کردیئے گئے ہیں، اس لئے قدرتاً اس میں ترتیب و تالیف کے وہ خصوصیات مفقود ہیں، جن کی توقع ہر مرتب کتاب سے ہوسکتی ہے، تکرارِ عبارت کی متعدد مثالیں ملیں گی، ایسے مسائل بکثرت ملیں گے جن کی اہمیت ہنگامی اور شہرت وقتی تھی، وقس علیٰ ہذا،

۲۔ تحریر مضامین کا رقبۂ مدت بیس سال تک وسیع ہے، یعنی ۱۸۹۹ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک اس طویل مدت میں انقلاباتِ دہر کے ساتھ خود صاحبِ مضامین

کے خیالات و طرزِ ادا میں انقلاب ہونا ناگزیر تھا، چنانچہ اہلِ نظر کو اس کے شواہد ملیں گے، اور یہ خصوصیت تو بہت نمایاں ہے کہ آخری مضامین صحتِ زبان، لطافتِ خیال، پختگیٔ ترکیب، متانتِ بیان، شوخیٔ ادا، ہر حیثیت سے مضامینِ سابق سے ممتاز ہیں،

۳۔ مضامین عموماً اپنے راقم کے اصلی نام کے ساتھ شائع ہوتے تھے، لیکن اس مجموعہ میں چار ایسے مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو فرضی ناموں کے ساتھ نکلے تھے،

۴۔ بعض مضامین کی شوخیاں سنجیدگیٔ ادب کے حدود سے متجاوز نظر آئیں گی، اس کا کھلا ہُوا جواب یہ ہے کہ حضرت "مہدی" معلمِ اخلاق نہ تھے، ادیب و انشاپرداز تھے، اور جب شاعر کے لئے "برہنہ رقاصی" کا جواز بڑے بڑے ثقات نے تسلیم کر لیا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نثر کے شاعر پر "انشائے عریاں" حرام ہے،

۵۔ مرحوم کے ادبی بلوغ کا زمانہ انیسویں صدی عیسوی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا عشرِ اوّل تھا، جو ہندی مسلمانوں کے دل و دماغ پر مغربیت کے غلبہ و تسلط کا خاص زمانہ تھا، اور "اقبال سرکار"، "برکاتِ تمدن" برکاتِ علوم جدیدہ وغیرہ کا جو صور سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے رفقا پھونک گئے تھے، اس کی گونج تقریباً سارے اسلامِ ہند پر طاری تھی، اس مرعوبیت کے نمونے اوراقِ آئندہ میں جا بجا ملینگے، افسوس ہے کہ مہدی مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی، اگر چند سال اور وہ زندہ رہ جاتے تو مجھے یقین کامل

ہے کہ ان گمراہیوں کا کفارہ وہ خود اپنے قلم سے کر جاتے، ان کے مزاج میں ضد بالکل نہ تھی، جب کسی مسئلہ کی معقولیت ان پر ثابت کر دی جاتی تو اپنی سابق رائے سے رجوع کر لیتے، اور جدید عقیدہ کے اختیار کر لینے میں انہیں مطلق تامل نہ ہوتا،

۶۔ مرحوم کی سب سے نمایاں خصوصیتِ اخلاقی ان کی فراخدلی تھی، خاندانِ ادب میں اپنے بزرگوں کی تعظیم و تکریم تو وہ اپنا فرض سمجھتے ہی تھے، بعض اوقات اپنے خردوں پر اس افراط و فیاضی کے ساتھ عنایت و شفقت کرنے لگتے تھے کہ انہیں محجوب ہونا پڑتا تھا، اس مجموعہ میں کثرت سے ایسے موقعے آئے ہیں جہاں انہوں نے اپنے بعض نومشق و نوآموز معاصرین کا استقبال نہایت گرمجوشی سے کیا ہے، یہ وصف ارباب ادب میں عموماً اس قدر عنقا ہو گیا ہے کہ راقم سطور کے علم میں دورِ حاضرہ کے کسی دوسرے اہلِ قلم کو اس حیثیت سے "مہدی" کا ہمسر نہیں بنایا جا سکتا،

۷۔ غلطیاں اور لغزشیں لازمہ بشریت ہیں، یہ کہنا کہ اوراقِ آیندہ زبان و انشا کی غلطیوں سے پاک ہیں، ایک بے مزہ غلط بیانی کرنا ہے، تاہم اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ کے خدائی قانون کے مطابق انسان کی عظمت کا معیار اس کے محاسن و فضائل کی کثرت ہے، اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس مجموعہ کے مؤلف کو اردو زبان کا ایک قابلِ قدر خدمتگذار اور انشا پرداز ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا" آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" "غیر سنائیتی جنبشِ لب" اس قسم کی کثیر التعداد انگریزی ترکیبوں کو اردو خوان طبقہ کے لئے مانوس بنا دینا ان ہی کا کام تھا،

ذیل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، حسنِ بیان ان پر ناز کرتا ہے، اور لطفِ انشاء ان پر جھومتا ہے،

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی 'اُردوئے خاصہ' کی داد ملتی، جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے، جوانیوں پر آئی ہوئی تجلّی نہیں بیٹھ سکتی تھی، مدتوں شعراء سے گاڑھا اتحاد رہا، بہ اقتضائے سن بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑے، کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا، لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی، بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی، آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول تو یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا، کبھی کبھی دبی زبان سے اُسے یہ کہتے سُنا،

"ارے اُٹھ جاؤں گی میں صحنک سے"

لیکن دفعۃً اس کی حالت نے پلٹا کھایا، کثرتِ فواحش باعثِ سنجیدگی ہو گئی، اچھے دن آئے ہیں تو بگڑی بنجاتی ہے، اب وہ مقدس علماء کی کنیزوں میں داخل ہے، لیکن سنا گیا کہ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب ان ہی کے تصرف میں رہتی ہے" الندوہ" اسی تعلق کا ایک ثمرِ پیش رس ہے"۔ (ص ۹۷ تا ۹۸)

علم کلام کو عباسی دور کے دماغی ترقیات کے لحاظ سے "یادِ ایام" سمجھیے، جو عقاید اسلام

اور فلسفۂ قدیم کے گزشتہ اختلاط کی ادبی تاریخ ہے، لیکن اس زمانہ میں اسلام کو صرف فلسفہ یعنی ایک حد تک محض اصولِ نظری سے سابقہ تھا، اس لئے جس طرح لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا اور کچھ ابرہ سے اور دونوں کا جھول جھال لے کر برابر کر دیا، دونوں حریف جو چھری کٹاری ہو رہے تھے گلے ملوا دیئے گئے، لیکن آج مذہب کو اپنے دشمنِ ازلی یعنی سائنس کا مقابلہ کرنا ہے جو قوی تر حریف ہے اور جو اپنے سوا دُنیا میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا، مذہب کے اولیات کا انحصار کلیۃً امورِ غیر مادی یعنی ایسی چیزوں پر ہے جو سرے سے مدرکاتِ انسانی سے باہر ہیں، یعنی ہمارے قوائے فطری ان کے سمجھنے بوجھنے سے عاری ہیں، اور سائنس صرف مادیت سے غرض نہیں رکھتا بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ عالمِ غیر کا خیر سے وجود ہی نہیں جس پر ہم آپ اس قدر مٹے ہوئے ہیں، بہر حال فلسفہ پھر بھی اتنا بُرا نہیں کہ "سُنی سُنائی" بھی کبھی مان لیتا ہے، لیکن سائنس اتنا کٹر ہے کہ جب تک "آنکھوں دیکھی نہ ہو ہزار کہئے، کتنے ہی بڑے بڑے جبہ و دستار پیش کیجئے، مذہب کی دہائی دیجئے، ایک نہیں سنتا، ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کافر بر خود غلط کسی "شریعت سہلہ" کی گرفت میں کہاں تک آسکتا ہے؟ (صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۰)

"جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے، اُردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں، اور گو اس مسئلہ پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہو لیکن آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے، جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا، جن حضرات کی نگاہیں دلی، لکھنؤ کے اختلافات تک محدود ہیں،

یا جن کی قاصر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے، اگر میں بلا خوفِ تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر "آزاد" کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفۂ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے، آسان نہیں ہے، اس لئے کسی اختلافی بحث کا چھیڑنا "گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوگا، " سرسید" سے منقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، "نذیر احمد" بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، "شبلی" سے "تاریخ" لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ "حالی" بھی جہاں تک "نثر" کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن "آفتابِ اردو" یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں، جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں، اسی لئے واقعات بھی انہوں نے جس قدر لکھے ہیں، "قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں، جنہیں "افسانۂ یارانِ کہن" سمجھئے۔" (ص ۲۲۷)

"سچ کہئے" "عذرا" واقعی بہت حسین ہے، حسین تو ایک معمولی اور سرسری لفظ ہے، عورتیں سبھی اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں، لیکن میں اپنے تخیل میں اوروں سے اس قدر مختلف ہوں کہ صرف گوشت پوست سے کام نہیں چلتا، عذرا میری عذرا! تو نظمِ زندگی یعنی پوری شاعری ہے، اس کی آواز کامل موسیقی، اس کا تبسم میرا عنصرِ حیات ہے، وہ قطعاً توبہ شکن ہے توبہ شکن اور کافر ایمان! ناممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اس پر قابو حاصل کرنے کو جی نہ چاہے، جہاں آنکھیں ملیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام جسم میں بجلی دوڑ گئی، مدت ہوئی جب میں پہلی نظر میں شہید ہوا، دل سے آواز آئی "خدایا خیر!" جس کا نتیجہ آج تک بھگت رہا ہوں،

مجھ پر اتنا سخت وار کبھی نہیں ہوا، کچھ تو ہے جس کی وجہ سے مٹا ہوا ہوں، میری
آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے، لیکن خود مجھے معلوم نہیں کس ادائے خاص کا
دلدادہ ہوں، پچھلی دفعہ بہت اتری ہوئی حالت میں دیکھا، پھر بھی ایک بات تھی،
آج تک عالمِ تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے!" کیا عذرا آپ کے دل کا راز جانتی ہے؟" ہاں
ہاں خوب جانتی ہے کہ میں اس پر مٹا ہوا ہوں، لیکن تم کو ہندوستانی سوسائٹی کی حالت
معلوم ہے! ہمارے ہاں جائز عشق کا پتہ نہیں، نہ جذبات قوت سے فعل میں آسکتے
ہیں، یہ بات مہذب اقوام میں ہے کہ عقد سے پہلے بیگانگی نہیں رہتی، اس کا افسوس
ہے کہ میں نے عذرا کے لئے ایک نئی خلش پیدا کردی، اور ایک ایسی فضائے بسیط
پیشِ نظر کردی جس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں، برسوں کے فتنۂ خوابیدہ کو چھیڑ
دے دے کر جگانا صریحی ظلم تھا۔ حصولِ آرزو جسے شعرا اپنی اصطلاح میں "وصل" کہتے
ہیں ایک طرح کی خود غرضی ہے، انتظار و ناکامی میں ایک لذتِ خاص ہے، اور
چونکہ مجھ کو عذرا کے ساتھ خاص رُوحانی تعلق ہے، اس لئے گو وہ مجھے گلے کا ہار نہ
بنا سکے تاہم میں اس کی پرستش سے جیتے جی کبھی دست بردار نہ ہو سکوں گا، وقت
گذر جائے گا، قصے رہ جائیں گے" (صفحہ ۵۸ تا ۵۹)

اگر یہ عبارتیں حسنِ انشا کا بہترین نمونہ نہیں تو مجھے نہیں معلوم انشا پردازی
کا اطلاق کس شے پر ہوگا،

۸۔ انسان کے بننے اور بگڑنے میں بہت بڑا دخل گرد و پیش کے ان حالات و

واقعات کو ہونا ہے جنہیں عموماً "تقدیر" ہی کہا جاتا ہے، مہدی مرحوم کو شروع سے آخر تک حالات مخالف و ناموافق سے سابقہ رہا، سرکاری ملازمت کے قیود، انتظامی عہدوں کی ذمہ داریاں، علمی مرکزوں سے بعد مسافت، علمی صحبتوں کا قحط، یکسوئی و اطمینان کا فقدان، ان تمام حالات نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے فطری جوہر کو پوری جلا دے سکیں ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو کے لئے "آزاد" ثانی پیدا ہونا ناممکن تھا؟

۹۔ مجموعۂ ہذا کی نظرِ ثانی تو الگ رہی، اس کا تو مصنف کی موت نے امکان ہی نہیں باقی رکھا تھا، ترتیب، کتابت وغیرہ سے متعلق بھی افسوس ہے کہ متعدد نقائص باقی رہ گئے ہیں، جنہیں مصنف مرحوم کی نفاست پسندی ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں برداشت کر سکتی تھی، لیکن اس علم کے بعد کہ یہ سارا کام ایک غمزدہ پردہ نشین خاتون نے انجام دیا ہے کسی قسم کی نکتہ چینی کی ہمت نہیں باقی رہ جاتی، بلکہ سچ یہ ہے کہ اپنی ہمتِ مردانہ سے اتنا بھی جو انہوں نے کیا، توقعات سے بہت زائد کیا ہے،

۱۰۔ آخر میں بشری کمزوریوں سے واقفیت رکھنے والے خدائے کریم سے دعا ہے کہ وہ اپنی رحمتِ کاملہ کے سایہ میں مرحوم کو جگہ دے، اور اُن کے نام کو بھلائی کے ساتھ روشن رکھے۔"

دریاباد۔ ۸ جون ۱۹۲۳ء
بارہ بنکی

عبدالماجد، بی، اے
(مصنف، فلسفۂ جذبات)

"اُن کی یاد"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"جو اپنی ہی تری یاد ہے، جو شفیق ہے دلِ زار ہے"

آہ! کیا معلوم تھا کہ ایک روز یہ روح فرسا اور دلخراش فرض میں اپنے قلم سے ادا کروں گی،

یادش بخیر، اب سے ۸-۹ مہینے پہلے میں اُن خوش نصیب بیویوں میں تھی جن کا وجود دنیا میں بہت کم ہے، ہم دونوں کی صاف ستھری زندگی اور خاص طرح کی نفاست سے ایک چھوٹا سا شیش محل معلوم ہوتا تھا، جس کے اندر ۲۴ گھنٹے شریفانہ مشاغل مجھے مصروف رکھتے تھے،

"اُن" کی نفاست پسندی کا ساتھ دینا آسان نہ تھا، لیکن میں اُن کے اس خیال کی دل سے عزت اور قدر کرتی تھی، اس لئے ان کی کتابوں اور خاص خاص فرنیچر کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتی، اپنا فخر سمجھتی تھی، اور اپنی تمام تر کوشش انہی باتوں پر صرف کرتی رہتی تھی، یہاں تک اہتمام رکھتی تھی کہ کم سے کم اُن کی موجودگی

ہیں تمام گھر میں یعنی صحن میں بھی ایک تنکا کہیں نظر نہ آئے (اور ماشاءاللہ چھوٹے بچوں کے ہوتے) ہر چیز قاعدے سے اپنی اپنی جگہ مقررہ پر رکھدی جاتی تھی، چائے بھی اپنے لوازم کے ساتھ پہلے ہی سے ایک چھوٹی میز پر لگادی جاتی تھی، کیونکہ "وہ" مجھے کاموں میں زیادہ مصروف دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے شام کے چار بجتے بجتے، ان سب سے فارغ ہوکر، میں ان کے ساتھ چائے میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو جاتی تھی،

کچہری سے واپسی کے بعد گھر میں قدم رکھتے ہی کھل جاتے تھے، اور وہ نہایت قیمتی اور معنی خیز تبسم میری تمام جسمانی اور دماغی محنتوں کا بہترین صلہ تھا، جو ایک مہذب اور فدائی شوہر سے ایک شریف جان نثار بیوی کو مل سکتا تھا،

اس راز کو ہم دونوں اپنی اپنی جگہ سمجھتے تھے، میں یہ جانتی تھی کہ میں دنیا سے محروم جاتی اگر مجھ کو ان کی ہم خیالی اور ان کی با اصول شائستگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملتا، یہ ضرور ہے کہ مجھ میں فطری مادہ موجود تھا، لیکن جب میدانِ عمل نہ ہو تو اچھی سے اچھی صفت بھی قوت سے فعل میں نہیں آسکتی، میں خوش تھی کہ میری زندگی کا مقصد صرف اس لائق پرستش ہستی کی خواہشات کا پورا کرنا ہے، اور جہاں میں ان کی زندگی کے تمام صیغوں میں حصہ لیتی رہتی تھی، میں ان کی توقعات کی پوری کر سکی، جو بحیثیت ایک وفادار بیوی کے میرا بہترین سرٹیفکیٹ تھا، اور "وہ" بھی خوب سمجھتے تھے کہ مجھے کس حد تک ان کے صرف حقوق ہی کی نہیں بلکہ "ان" کی نفاستوں اور نزاکتوں کی رعایت بھی مدِ نظر تھی،

آہ! مجھے اس کھوئی ہوئی زندگی کی ایک برقی رو کہاں سے کہاں لیجا رہی ہے،

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

آہ! اُس لائقِ رشک زندگی کی تمام دلچسپیاں، اور وہ میری اصلی خوشیاں جس ذات سے وابستہ تھیں، اُس دم کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں، اور اب خدا کی بھری دُنیا میں میرے حصّہ کا کچھ نہیں!

آہ! اس قدر جلد موت کے ظالم ہاتھ نے ہم دونوں کو جُدا کر دیا،

لیکن رُوح کی طرح محبت بھی غیر فانی ہے، اس لئے اب بھی اس غیر فانی رُوح کی دائمی پرستش، جیتے جی میرا بہترین مشغلہ ہستی ہے،

لیکن جن کے خمیر میں فطرت نے جذبات کے احساس کا مادّہ، سرے سے رکھا ہی نہیں، وہ اس دردِ دل کو کیا سمجھ سکتے ہیں،

اب میں ان کے منتشر مضامین کا مجموعہ شائع کرانا چاہتی ہوں، اسی کے ساتھ ان کی ایک مختصر سوانح عمری لکھ کر اپنی چند سطریں بھی ان کے قیمتی لٹریچر میں شریک کرنا چاہتی ہوں تاکہ مرنے کے بعد بھی اس حیثیت سے ایک یادگار دنیا میں باقی رہ جائے،

گو بزرگوں میں اب کوئی باقی نہیں رہا، اس لئے ان کی پیدائش کا صحیح سنہ و سال، یا بچپن کے زیادہ تر حالات معلوم نہیں ہو سکتے تاہم جو کچھ وقتاً فوقتاً ان کی زبانی سُنا، یا کبھی کبھی بڑوں سے سُنی سُنائی باتیں، جہاں تک ذہن میں محفوظ ہیں، اور اپنی حالتِ موجودہ کے لحاظ سے جو کچھ ممکن ہے لکھوں گی،

وطن اور خاندان "وہ" خاص گورکھپور کے ایک اچھے شریف خاندان سے تھے، ان کے والد شیخ حاجی علی حسن صاحب مرحوم، کورٹ انسپکٹر تھے، نہایت دیانتدار اور ایک معزز با اثر شخصیت رکھتے تھے، انگریز حکام میں آپ کو بہت کچھ رسوخ تھا، اور آپ ایک زبردست مذہبی شخص، یعنی سچے مسلمان تھے،

آپ کے بہت سی اولادیں ہوئیں، لیکن صرف "وہ" اور ایک بہن ان سے چھوٹی، یہی دونوں بھائی بہن زندہ بچے، آپ کی دوسری بیوی سے بھی ۲ لڑکے ہوئے، بڑے ظفر حسن اور چھوٹے حامد حسن، لیکن ظفر حسن نے کوئی تیس ۳۰ برس کی عمر میں وفات پائی،

ان کے بچپن کے مختصر حالات "وہ" فطرۃً صفائی پسند اور شریف النفس واقع ہوئے تھے، کوئی کھیل کبھی ایسا جس سے کپڑے یا جسم آلودہ ہو نہیں کھیلتے تھے، اور عام بچوں کی طرح کی ضد، ہٹ، بات بات پر مچلنے سے بھی نفرت تھی، بلکہ خاندان کے دوسرے بچوں کو یہ کرتے ہوئے حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے،

ابتدائی تعلیم اُن کے والد مرحوم نے مکتب کے بعد عرصہ تک ان کو گھر ہی پر مکتب میں عربی اور فارسی کی بلند مدارج تک تعلیم دلائی،

(آہ! مردانہ کا وہ برآمدہ آج تک مکتب کے نام سے موسوم ہے)

انگریزی تعلیم اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کئے گئے، اسی کے ساتھ ایک انگریزی معلم بھی مقرر کئے گئے جو گھر پر آکر پڑھاتے تھے، اسی سلسلہ میں کچھ دنوں علی گڈھ بھی رہے،

چونکہ قوتِ ذہنی زبردست تھی، اور علم سے ایک خاص مناسبت اور غیر معمولی ذوقِ سلیم تھا، اس لئے سن کی ترقی کے ساتھ ساتھ علمی معلومات میں یہاں تک اضافہ ہوتا گیا کہ ان کی سرسری جنبشِ قلم کی طرف بڑے بڑے قابل حضرات اور اہلِ کمال کی آنکھیں لگی رہتی تھیں، ان کے "لٹریچر" یعنی خاص طرح کی خوش بیانی اور پاکیزہ خیالی نے ملک کے ادبی حلقوں کو ان کا گرویدہ و مفتون بنا دیا تھا،

ابتدائی تعلیم کے زمانہ کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ میرے یہاں بلند شہر کے ایک نواب صاحب مہمان آئے ہوئے تھے، ایک روز قبلہ حاجی صاحب سے ملنے کیلئے آپ کے مکان پر بھی تشریف لائے، نواب صاحب کو جو ان کے علمی شوق کا حال معلوم ہوا تو آپ نے کوئی فارسی نظم پڑھنے کی فرمائش کی، انہوں نے اس کی فوری تعمیل کی، بالطبع ان کی آواز میں ایک خاص طرح کا درد تھا، اور ہر نظم کو اس کی بحر کی رعایت سے ادا کرنا ان کا حصہ تھا،

نواب صاحب سن کر بہت متاثر ہوئے، اور اسی جوش میں آپ نے پچیس ۲۵ روپئے جیب سے نکال کر انعام کے طور پر ان کے سامنے بڑھائے، لیکن انہوں نے نہایت ادب سے سلام کیا، اور شکریہ کے ساتھ روپیے واپس کئے اور کہا کہ "اگر آپ واقعی مجھے کچھ دینا چاہتے ہیں، تو کوئی اچھی سی کتاب میرا بہترین انعام ہوگی"

اتفاق سے اس وقت نواب صاحب کے پاس ایک جلد تہذیب الاخلاق کی موجود تھی، وہی آپ نے دی اور فرمایا کہ "باقی جلدیں مکان سے بھیجوں گا"

"وہ" اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ "صرف اسی تہذیب الاخلاق

نے اچھے آدمی بنایا"

بچپن میں اوقات کا لحاظ اور نفاست

چونکہ بچپن ہی سے مزاج میں صفائی اور نفاست بہت تھی، اور ہر اچھی چیز سے انس، ایک چھوٹا سا خوبصورت کمرہ شیشوں کے دروازوں کا، لب سڑک قبلہ حاجی صاحب نے خاص ان ہی کے لئے مخصوص کر دیا تھا؛ اس کے اندر ایک چھوٹا سا غسلخانہ بھی ہے، اس کمرے کو "وہ" نہایت خوش سلیقگی سے ٹھیک ٹھاک رکھتے تھے، قبلہ حاجی صاحب کے ملنے والوں میں اکثر اصحاب خاص کر ان کے کمرہ میں جاتے، اور ان کی ایک ایک چیز کو دلچسپی سے دیکھتے، اور اس کی داد دیتے،

پڑھنا، لکھنا، کھانا، ناشتہ، غسل، تفریح وغیرہ وغیرہ، ان سب میں وقت مقررہ کی پابندی کا بہت خیال رکھتے تھے،

شادی اور ملازمت

جب وہ کوئی ۱۸-۱۹- سال کے تھے، اس وقت وطن ہی میں ایک خاندانِ سادات کی لڑکی سے شادی ہوئی،

شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ملازمت کا سلسلہ ۱۸۹۶ء میں شروع ہوا، کچھ دنوں عاملانہ عہدوں پر، چنار اور مرزاپور وغیرہ میں رہے، اس کے بعد نائب تحصیلداری کے عہدہ پر مقرر ہو کر بنارس آئے،

بیوی کی وفات اور بچوں کی پرورش

مرحومہ نے ۲- اپریل ۱۹۰۳ء کو وفات پائی، اور تین اولادیں چھوڑیں، ۲ دو لڑکیاں، اور ایک لڑکا، بڑی لڑکی چھ برس کی تھی، اور دوسری ۴ برس کی، لڑکا احمد ۲ دو برس کا تھا،

یہ حادثہ ان کے لئے کوئی معمولی نہیں تھا، اس پر ننھی جانوں کی پرورش، لیکن جس جاں نثاری اور وفاداری سے انہوں نے، یادگاران رفیق کی پرورش اور اعلیٰ تربیت کی، اس کی نظیر اپنے وطن میں کیا، دس پانچ شہروں میں بھی شاید ہی ملے، ان کی اس صفتِ زندگی کے محاسن کو لفظوں میں ادا کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے،

اس واقعہ کے بعد ۱۹۰۳ء میں بنارس سے تبدیل ہوکر الٰہ آباد آگئے، اور ۵ ۶ برس تک برابر صدر تحصیل میں رہے،

تحصیلداری کا سلسلہ اور الٰہ آباد کی بڑی نمایش

۱۹۰۹ء میں تحصیلداری کی قائم مقامیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور الٰہ آباد کی بڑی نمایش کے زمانہ میں چھ مہینے تک مسلسل صدر تحصیلدار رہے، اس زمانہ میں گورنمنٹ کے بڑے بڑے مہمان آگئے، اور انتظام کا جس قدر حصہ ان کے ہاتھ میں تھا، اُسے نہایت خوش سلیقگی، اور عمدگی سے انہوں نے انجام دیا،

اسی زمانہ میں ولی عہد جرمنی بھی آئے تھے، اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنے حُسنِ خدمات کے صلہ میں شاہزادہ جرمنی سے ایک طلائی تمغہ بھی پایا تھا،

تعلقات احباب

ان کو بالطبع غیر شریفانہ مشاغل سے دلچسپی نہیں تھی، اس لئے عام لوگوں سے علیحدگی رہتی تھی،

وہ صرف ایسے شخص سے دوستی رکھ سکتے تھے، جو اصولاً، اخلاقاً، عقلاً، اس قابل ہوتا، اسی کے ساتھ اس کا علم دوست بھی ہونا ضروری تھا، اسی وجہ سے وطن میں بھی

ان کا دائرۂ احباب وسیع نہیں تھا، تاہم کافی تھا، "وہ" اپنے دوستوں کے ساتھ ہمیشہ خاص طرح کا خلوص، وضعداری اور یکرنگی رکھتے تھے، جسے آخر وقت تک نباہا،

علمی اور پاکیزہ لٹریچر سے خاص اُنس

انگریزی کے ساتھ عربی اور فارسی کے بھی بڑے شائق تھے، اسلامی لٹریچر اور متعلقات پر یورپ میں جو تصانیف انگریزی یا کسی مشرقی زبان میں شائع ہوتی تھیں، وہ خصوصیت کے ساتھ ان کے پیشِ نظر رہتی تھیں،

آج اُن کی لائبریری بہترین لٹریچروں کا مجموعہ ہے، اس کے ہمیشہ متلاشی رہتے تھے کہ کون کون سی کتابیں نئی چھپنے والی ہیں،

اس کا بہت اہتمام رہتا کہ نئی تصانیف سب سے پہلے ان کے پاس پہنچیں جس کے لئے بڑی بڑی دکانوں، اور بک ایجنسیوں میں اُن کا آرڈر پہلے ہی سے رہا کرتا تھا، کوئی مہینہ ایسا نہیں گذرتا تھا کہ اُن کی تنخواہ کا ایک معقول حصہ کتابوں کی خریداری اور اس کی جلد بندی وغیرہ میں صرف نہ ہوتا ہو، بقول بھائی عبدالماجد صاحب کے "ان معاملات میں مرحوم وہ اہتمام کرتے تھے، جو خود مصنف سے بھی نہ بن پڑتا"!

نائب تحصیلداری کے زمانہ میں بھی انھوں نے اپنے اس شوق کو خوبی کے ساتھ نباہا،

اُردو لٹریچر کا نہایت لطیف اور صحیح مذاق رکھتے تھے، اور انشا پردازی تو گویا اُن کا حصہ تھی،

کتب بینی

کتب بینی اُن کے لئے شرطِ حیات تھی،

معمولاً شب کے چند گھنٹے پڑھنے میں ضرور صرف کرتے، اور اُسے تمام دن کی دماغی محنتوں کا بہترین معاوضہ سمجھتے تھے،

جس روز کوئی نئی کتاب نہ ہوتی، تو پرانی ہی کتابوں کو دیکھتے،

ان کی لائبریری میں جتنی کتابیں ہیں، وہ سب بار ہا ان کی نگاہ سے گذر چکی ہیں، تواتر مطالعہ سے کتابوں کے خاص خاص حصے ان کو حفظ ہو گئے تھے،

پڑھنے کی رفتار بہت تیز تھی، ضخیم سے ضخیم کتاب دو نشست میں ختم کر دیتے تھے، کتابیں اس قدر انکو عزیز تھیں کہ زمانہ علالت میں بھی وہ ان سے قطع نظر نہیں کر سکتے تھے،

لکھنؤ میں جیسے ہی طبیعت ذرا سنبھلی، انہوں نے پہلی درخواست جو اسپراسن صاحب سے کی، وہ یہ تھی "کیا اب میں کتابیں پڑھ سکتا ہوں؟" اس پر صاحب بے اختیار ہنس پڑے، اور جواب ان کی خواہش کے مطابق دیا، جس سے ان کو خاص مسرت ہوئی،

اس حالت میں بھی وہ ایک بکس منتخب کتابوں کا ڈیرا پور سے اپنے ساتھ لائے تھے، لیکن وہ یہیں چھوڑ دی گئی تھیں،

اجازت ملتے ہی انہوں نے دوسرے ہی روز ایک خاص آدمی وطن بھیجکر اس بکس کو منگوایا،

وارڈ کے کمرے میں اُن کے پلنگ کے قریب ایک الماری پر قاعدہ سے وہ کتابیں رکھ دی گئیں، دونوں وقت حسب دستور صاف کی جاتیں، اسی کے

ساتھ وہ برابر ان کی ترتیب بھی بدلواتے رہتے تھے، اور انہیں دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے،

روزانہ صبح کو ایک ملازم کو امین آباد پارک اخباروں کی خریداری کے لئے بھیجتے تھے، اور اس کی واپسی کا ان کو بے چینی کے ساتھ انتظار رہا کرتا تھا،

چونکہ زیادہ پڑھنے کی اجازت نہیں تھی، اس لئے صرف خاص خاص حصّے خود دیکھتے، باقی احمد سے یا مجھ سے پڑھا کر سُنتے تھے،

انشا پردازی کا شوق اور مشاہیر مصنفین کے ساتھ خاص ارتباط

جہاں تک پتہ چلتا ہے، اُن کے مضامین کی پہلی قسط "تمدنِ عرب پر ایک کھلی چٹھی" کے عنوان سے فروری ۱۸۹۹ء میں ریاض الاخبار گورکھپور میں شائع ہوئی، اس کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں اور اخباروں میں اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے،

اسی سلسلہ میں مولانا نذیر احمد صاحب، مولانا محمد حسین صاحب آزاد، مولٰنا حالی صاحب، مولٰنا شبلی صاحب مرحوم سے خط و کتابت شروع ہوئی، سر سید مرحوم سے بھی تھی، مگر کم،

لیکن مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ باہمی تعلقات خاص طور پر گہرے تھے، ۱۸۹۰ء سے مولانا شبلی مرحوم سے یہ سلسلہ شروع ہوا، اور تعلقات کی تدریجی رفتار کے ساتھ تحریر کا لب و لہجہ بدلتا گیا، مولانا فرطِ خلوص سے اُن سے کوئی راز نہیں رکھتے تھے،

مولانا مرحوم اپنے ایک خط میں اُن کے دو مضامین کی داد یُوں دیتے ہیں:-

"البشیر میں ایک مضمون دیکھا، نیچے تمہارے نام کے دستخط تھے، حیرت ہوئی

کہ یہ وہی مرزاپوری دوست ہیں، یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے، کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا، دو ہی نین مفتے ہوئے، وہی برق ایک اور افق پر چمکی، یہ اُس سے بھی زیادہ ہوش رُبا اور خیرہ کن تھی"

ایک دوسرے خط میں لکھتے "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے، دائرۂ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو، یقین کرنے کی بات نہیں،

جب وہ الہ آباد تبدیل ہو کر آئے، تو مولانا بہت خوش ہوئے اور لکھا کہ آپ کے الہ آباد آجانے نے مجھ کو الہ آباد کے سفر پر فوراً آمادہ کر دیا، اب میرے سفر کی تعداد میں ضرور اضافہ ہو جائے گا،

جب مولانا شبلی مرحوم الہ آباد تشریف لاتے تھے، تو اپنے زمانۂ قیام میں ایک دن بھی بغیر اُن کے دیکھے مولانا کو چین نہیں آتا تھا، اور مولانا کی مانگ ہر طرف کثرت سے رہتی تھی، میرے ہاں ایک روز سے زیادہ مہمان نہیں رہنے پاتے تھے، تاہم جہاں مولانا ہوتے تھے، وہ روزانہ ان سے ملنے کے لئے جاتے تھے،

الہ آباد میں بھی رفتہ رفتہ اعلیٰ طبقہ کے احباب کی ایک اچھی خاصی پارٹی اُن کی تیار ہو گئی، جن میں زیادہ تر تعداد ذی علم اصحاب کی تھی،

موجودہ اربابِ علم کیساتھ ان کے مراسم

مولانا شبلی مرحوم کے بعد آپ کے لائقِ فخر شاگردوں سے بھی اُن کے تعلقات کچھ کم نہ تھے، اُن ندوی احباب میں مولانا سید سلیمان صاحب، مولوی عبد الباری صاحب، مولوی عبد السلام صاحب کے ساتھ خاص خلوص اور دلچسپی تھی، نسبتہً سید سلیمان صاحب سے زیادہ جیسا کہ سید

سلیمان صاحب نے خود تعزیت نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے اُن کا رابطہ محبت اپنے استاد مولانا شبلی مرحوم سے وراثتہً پایا تھا"

وفات سے دو ایک سال قبل مولوی عبدالباری صاحب ندوی سے بھی تعلقات (بذریعہ تحریر) بہت زیادہ قائم ہو گئے تھے،

وہ ان اصحاب کے علمی مذاق کے بہت گرویدہ تھے، دل سے قدر اور محبت کرتے تھے، اور اس ارتباط کو انہوں نے آخری وقت تک نبایا،

اپنے موجودہ ادبی احباب میں، جن کی لٹریری اور علمی قابلیت کے وہ دلدادہ تھے، مولانا عبدالماجد صاحب بی اے کا نام نامی سرِ فہرست درج ہونے کے لائق ہے آپ کے ساتھ انہیں سچا خلوص اور دلی تعلق تھا،

آپ کے خطوں کا ان کو بے چینی کے ساتھ انتظار رہا کرتا تھا، جس روز ڈاک میں آپ کا خط ہوتا، انہیں بے حد مسرت ہوتی تھی، خدا جانے کتنی مرتبہ اسے پڑھتے تھے، اور سیری نہیں ہوتی تھی، کبھی جوش میں کھڑے ہو جاتے اور ٹہل ٹہل کر خط کو پڑھتے تھے،

اکثر آپ کی نسبت فرطِ خلوص اور محبت سے کہا کرتے تھے کہ "ایک دن یہ موجودہ زمانۂ ہند کا آفتابِ علم ہو کر رہے گا"

جناب مولانا عبدالماجد صاحب نے ان کی وفات پر جو تعزیت نامہ ہمدم میں شائع کرایا تھا، اس کا ایک ایک حرف بجائے خود باہمی خلوص اور سچی محبت کا بہترین ثبوت ہے،

سید ناصر علی صاحب (ایڈیٹر صلائے عام) مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری (مصنف البرامکہ) مولانا ابوالکلام صاحب آزاد، مولانا محمد علی صاحب آکسن، شاہ دلگیر صاحب اکبرآبادی، ان سے بھی خاص مراسم تھے،

الہ آباد میں کبھی کبھی مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ، مولانا ابوالکلام صاحب آزاد بھی میرے ہاں مہمان ہوا کرتے تھے،

لیکن ادھر مدت سے آپ لوگوں کے ساتھ بوجوہ ان کا سلسلۂ مراسلت قریب قریب منقطع تھا،

خط و کتابت | چونکہ زندگی بحیثیت مجموعی بہت با اصول تھی،

یہ صیغہ بھی باقاعدگی سے خالی نہ تھا، بلکہ مراسلت اُن کی زندگی کا ایک نہایت ضروری جزو تھی،

ڈاک کا ان کو روزانہ سخت انتظار رہا کرتا تھا، ڈاک عموماً زیادہ ہوا کرتی تھی، اخبار، رسالے، دوستوں اور عزیزانِ خاندان کے خطوط، دو کانوں کی فہرستیں برابر آتی رہتی تھیں،

جس روز اردو کا کوئی نیا رسالہ (خصوصاً معارف) ہوتا، اس روز انہیں روحانی مسرت ہوتی، یا جب ان کے لٹریری دوستوں میں سے کسی کا خط آتا، تو بہت خوش ہوتے، اور اس خط کو بار بار پڑھتے،

خود خط لکھنے، اور دوسروں کے خطوں کا جواب دینے میں بہت باقاعدہ تھے، خط کا جواب نہ دینا، اُن کے خیال میں ایک اخلاقی جرم تھا، جس کے وہ

کبھی مرتکب نہیں ہوئے،

خط خواہ کسی شخص کا ہوتا، جواباً ضرور اس کو لکھتے تھے،

یہانتک کہ زمانۂ علالت میں بھی مراسلت کا سلسلہ بدستور جاری رہا، آپ نہیں لکھ سکتے تھے، تو احمد سے لکھواتے رہتے اور خود بولتے جاتے تھے،

عیادت کے خطوط جو روزانہ آتے رہتے تھے، ان کا جواب جب تک نہ جاتا، ان کو بے چینی رہا کرتی تھی،

آہ! اخیر وقت تک انھیں اس کا بہت خیال تھا کہ ان سے کوئی جواب خط نہ پانے کا شاکی ہو،

عین وفات کے روز بھی کوئی دو بجے دن کو انہوں نے کئی خط لکھوا کر بھیجے، احمد اس وقت اپنے کسی کام سے باہر جانا چاہتے تھے، اس لئے خط کو ٹالنا چاہا، کہا کہ "ابّا جان! اب کل لکھیں گے"۔ اس پر انہوں نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ "نہیں بیٹا! آج ہی لکھو، جب میں دنیا میں نہیں ہوں گا، اس وقت یہ باتیں تم لوگوں کو بہت یاد آئیں گی کہ تمہارے باپ کی باقاعدگی نے آخری سانس سے پہلے انکا ساتھ نہیں چھوڑا!"

اُن کے خطوں میں ایک خاص ادا ہوتی تھی، عبارت حشو و زوائد سے بری ہوتی تھی، اور طرزِ انشا میں وہ اپنا ایک جداگانہ رنگ رکھتے تھے، یعنی کسی کے مقلد نہیں تھے، بلکہ خود درجۂ اجتہاد رکھتے تھے،

خطوط روزمرّہ کی بول چال میں نہایت بے تکلّف اور بے ساختہ ہوا کرتے تھے،

اُن کے مکتوبات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی تحریر گمنام بھی ہو، ناممکن

ہے کہ دو سطریں پڑھنے کے بعد پڑھنے والا سمجھنے میں غلطی کرے، اسی کے ساتھ شانِ
خط نہایت صاف اور دلفریب، یہ دونوں باتیں بہت کم لوگوں کے حصّہ میں آتی ہیں،
ان کے اہلِ قلم احباب، ان کے خطوط کی بڑی قدر کرتے تھے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ
ان کے ہر ملنے والے کے پاس، ان کے خطوں کی ایک معقول تعداد، بقول مولانا
سید سلیمان صاحب ندوی کے "تعویذِ ادب بن کر حرزِ جان کی حیثیت سے محفوظ ہیں"،
میرا ارادہ مکاتیب کے بھی شائع کرانے کا ہے، جس سے اُردو لٹریچر میں
ایک قیمتی اضافہ ہوگا،

ظرافت میں اختصار

ایک مرتبہ سید عبدالرؤف صاحب بیرسٹرایٹ لاء الٰہ آباد، جو اب
پنجاب ہائی کورٹ کے جج ہیں، ان کے ہاں مولانا شبلی مرحوم کی دعوت تھی،
اسی سلسلہ میں اور بھی بہت اصحاب شریک تھے، عبدالرؤف صاحب ان کے
علمی اور سنجیدہ مذاق کی بہت قدر کرتے تھے، خاص کر ایسے موقعوں پر بیرسٹر صاحب
ان کو ضرور پکڑتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ "بھائی بغیر آپ کے میز پر لطف نہیں آتا"،
اس دعوت میں باہر کے ایک رئیس صاحب بھی شریک تھے، آپ نے جو ایک
نائب تحصیلدار کو اس قدر باقاعدہ کپڑوں میں دیکھا، اور اس پر مولانا اور بیرسٹر صاحب
کی خاص توجہ، تو آپ کی طبیعت نے نچلے نہ بیٹھنے دیا،
رئیس صاحب نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، کیا آپ براہِ مہربانی مجھے
یہ بتا سکتے ہیں کہ انسان جنٹلمین کس طرح بنتا ہے، وہ سُن کر ٹال گئے،
دوبارہ پھر بھی سوال کیا، اب بھی وہ خاموش رہے، لیکن جب تیسری مرتبہ

رئیس صاحب نے اس کا اعادہ کیا، تب انہوں نے نہایت سنجیدگی سے بغیر اُن کی طرف دیکھے ہوئے جواب دیا "معاف کیجئے گا، جنٹلمین بنتے نہیں، ہوتے ہیں" ان کا یہ کہنا تھا کہ ہر طرف کے قہقہوں کی آواز سے ہال گونج اٹھا، اور بیچارے رئیس صاحب جھینپ گئے، عبدالرؤف صاحب سے ضبط نہ ہو سکا، جوش میں فوراً اُٹھے اور ان سے لپٹ گئے،

اس قسم کے اور بھی بہتیرے واقعات ہیں،

اخلاقی جرأت وہ اپنی رائے کے اظہار میں کبھی کسی کا خیال نہیں کرتے تھے جس طرح اپنے گھر میں پانچ کے دوستوں میں آزاد تھے، اسی طرح بڑی سے بڑی پارٹی اور جلسہ میں بھی بے باکانہ اظہارِ خیال کرتے تھے،

قوتِ فیصلہ کسی سے صرف ایک بار ملنے کے بعد، قیافہ سے اس کی نسبت نہایت صحیح اور بہت جلد رائے قائم کر لیتے تھے، جو اکثر بالکل ٹھیک ہوتی تھی، اس پر دوسروں کو حیرت ہوتی تھی،

خودداری وہ جہاں خلیق تھے، وہاں خوددار بھی حد درجہ کے تھے، وہ اپنے سے کم رتبہ شخص سے ملنے اور بازدید کے لئے اس کے گھر بے تکلف جاتے تھے لیکن کسی کے ہاں وہ گئے، اور وہ بازدید کو نہ آئے، چاہے کتنا ذی مرتبہ کیوں نہ ہو، پھر دوبارہ اس سے ملنے نہیں جاتے تھے،

صداقت اور صاف دلی وہ نہایت نیک نیت تھے، اور صداقت ان کی طبیعت کا ایک زبردست جزو تھی، خصوصاً دل تو سینہ میں ایک شفاف آئینہ تھا،

ناممکن تھا کہ اپنے متعلقین میں کسی کی طرف سے ہو، اور کسی حیثیت سے ہو، ذرا سا میل اس پر آجاتا، تو وہ اُسے برداشت کر سکتے، طبیعت میں ایک ایسی بے چینی پیدا ہو جاتی تھی، جس سے رات کو چین سے سو بھی نہیں سکتے تھے، جبتک کہ اس سے صفائی نہ کر لیتے اور جس کے ساتھ جتنا ہی گہرا تعلق تھا، اتنا ہی زیادہ اس کا اثر بھی قبول کرتے تھے،

عقل اور جذبات کا صحیح استعمال

وہ مجسّم جذبات تھے، لیکن اُسی کے ساتھ ان کا ہر فعل نہایت عاقلانہ اور با اصول ہوا کرتا تھا، جہاں جذبات کا موقع ہوتا تھا، عقل ایک حد تک مغلوب ہو جاتی تھی، اور جہاں عقل کی ضرورت ہوتی تھی، وہاں جذبات کا کوسوں پتہ بھی نہیں ہوتا تھا، اور کبھی کبھی یہ دونوں حالتیں ان پر ایک ہی وقتِ خاص میں، اور ایک سکنڈ کے اندر طاری ہو جاتی تھیں،

لباس میں خاص تصرفات

وہ جتنا اچھے کپڑوں کے شائق تھے، اتنا ہی اس کی تیاری میں بھی اہتمام رکھتے تھے،

اچھی سے اچھی انگریزی دُکان پر بہتر سے بہتر سینے والوں کو بھی اپنے کپڑے اس وقت تک سینے کو نہیں دیتے تھے، جب تک کہ ان کو اس کی تراشش میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے، خاص خاص ناپ خود بتاتے تھے، کانپور کے ایک مشہور درزی سے ضبط نہ ہو سکا، اور اس نے ایک موقع پر کہا کہ "حضور! مجھے بڑے بڑے صاحبوں کے کپڑے سینے کا اتفاق ہوا، اور اسی میں عمر گذر گئی، لیکن ایسی ایسی باریکیاں حضور کی بدولت معلوم ہوئیں، کہ تا بعدار زندگی بھر بھول نہیں سکتا"، اسی طرح

ہر چیز کی تکمیل کا بہت خیال رہتا تھا، ایک جوڑی جوتا بھی پیکسٹن اینسے، بغیر اُن کی خاص ہدایت کے، ان کی مرضی کے لائق تیار نہیں کر سکتے تھے،

سگریٹ اور حُقّہ | سگرٹوں کے بہت شائق تھے، اور اعلیٰ سے اعلیٰ پیتے تھے، علی گڈھ کلب کی سگریٹ خصوصیّت سے منگواتے تھے، اس خیال سے کہ اس میں ترکی کا تنباکو ہوتا تھا، لیکن ادھر کچھ دنوں سے وطن کے اعلیٰ تنباکو نے حُقّہ کا شوق پیدا کر دیا تھا، حقّہ بھی نہایت تکلّفی ہوتا تھا، خاص طرح کے نیچے فرمایشی بنوائے جاتے تھے، اور ایک کو پندرہ روز سے زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے، تمبا کو عنبری ہوتی تھی، جبتک مردانہ میں کام کرتے رہتے، ہر پندرہ[۱۵] بیس[۲۰] منٹ کے بعد چلم بدلی جاتی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ برابر تازہ بھی کیا جاتا، اور فرشی کپڑے سے خشک کر کے چمکائی جاتی تھی،

غذا | مقدار بہت کم ہوتی تھی، لیکن جہانتک ممکن تھا بہتر سے بہتر اور لطیف، ثقیل چیزوں سے پرہیز کرتے تھے، ترکاری زیادہ کھاتے تھے، اور وہ خاص طرح پر پکائی جاتی تھی، یعنی اس کا جوہر فنا نہ ہونے پائے، اور مچھلی بہت ہی پسند تھی، اور انڈوں سے بے حد شوق تھا، خاصکر صبح کی چائے پر لازماً ہوتے تھے،

ہر اچھے اور لطیف پھل سے شوق تھا، نسبتہً آموں سے زیادہ، خاص کر لنگڑے آموں سے، خشک میوے یوں پسند نہیں تھے، صرف ان کی لوزیات کھاتے تھے،

صحت کا خیال اور وقت کی پابندی | جاڑوں میں ۷ بجے، اور گرمیوں میں ساڑھے چھ بجے صبح کو چائے اپنے لوازم کے ساتھ سامنے آجاتی تھی، اور ساڑھے سات بجے

وہ اپنے دفتر کے کمرے میں جاکر بیٹھ جاتے تھے، پھر ساڑھے دس بجے غسل اور گیارہ بجے کھانا، اس کے بعد دو گھنٹے آرام، لیکن دن میں سوتے کم تھے، ایک بجے سے ڈاک دیکھنی شروع کرتے، پہلے نج کی خاص خاص، پھر سرکاری تھیلے کی دیکھ بھال کے بعد، دو بجے تازہ غسل کے ساتھ کچہری جاتے، اور ۴ بجے واپسی پر چائے سے فارغ ہو کر صحن میں جاکر بیٹھتے، اور ڈیڑھ دو گھنٹے ملنے جلنے والوں کا سلسلہ رہتا، پھر کچھ دیر ادھر اُدھر ٹہلتے، ۸ بجے شب کو کھانے پر بیٹھ جاتے، اس کے بعد صاف ستھرے لیمپ کی تیز روشنی کے سامنے اس روز کے آئے ہوئے نئے اخبار اور رسالوں کو کچھ دیر دیکھتے، ۱۱ بجے سو رہتے تھے، پھر وہی صبح جس کا خاکہ شروع میں کھینچ چکی ہوں،

بڑے تو خیر، چھوٹے بچوں کے بھی سال میں ایک، یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ زکام تو البتہ ہو جاتا تھا، ورنہ برسوں خدا کے فضل سے حرارت بھی نہیں آتی تھی اور یہ صرف اسی باقاعدہ زندگی کا ثمر بیش رس تھا،

خلاصہ | زندگی نہایت صاف ستھری تھی، اور جتنے صیغے تھے، سب میں متوازی ترقی کی کوشش رہتی تھی،

سچ یہ ہے کہ انسان کی غایتِ ہستی ظاہر احسن معاشرت کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتی، اور جدید طرزِ معاشرت میں اوّل درجہ کا معیارِ زندگی کچھ ناگزیر سا تھا، جس سے ان کی سی طبیعت کا انسان قطع نظر نہیں کر سکتا تھا،

اصلی جذبۂ ہمدردی | اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ کچہری میں بیٹھے مقدمہ کر رہے ہیں، اور

بڑے بڑے وکیل اجلاس پر موجود ہیں، سارا کٹھرا گواہوں سے بھرا ہوا ہے، اور وہ نہایت مصروفیت سے اپنے فرائضِ منصبی کو انجام دے رہے ہیں کہ اتنے میں ایک فقیر کی آواز کانوں میں آئی اور انہوں نے دیکھا کہ اجلاس کے سامنے میدان میں وہ کھڑا ہے، اسی وقت اُن کا قلم رُک جاتا، اور اردلی کی طرف دیکھتے، چونکہ اردلی ان کی اس حالت سے واقف رہتا تھا، فوراً وہاں سے روانہ ہوتا، لیکن جب تک وہ دروازے پر آکر اطلاع کرتا، اور پھر یہاں سے واپس جاتا، اور فقیر کو دے کر رخصت نہ کرلیتا، اس وقت تک اپنا کام نہیں کرسکتے تھے، یا کبھی ایسا ہوتا کہ گھر پر ان کی موجودگی میں فقیر نے صدا دی، اور اس کی پہلی یا دوسری آواز پر فوراً بھیک نہ دی گئی، تو اتنی سی تاخیر اُن کو ناگوار ہوتی تھی،

اور یہ تو ان کے ہاں سخت جرم تھا کہ کسی کام کے لئے بیگار پکڑ آئے، اور پھر بغیر کچھ اجرت پائے چلا جائے، اس کی بہت نگرانی رکھتے تھے،

اگر اتفاق سے کبھی اردلیوں کی غفلت سے ایسا ہوجاتا، تو وہ سب تقصیریں معاف کرسکتے تھے، لیکن نہیں معاف کرتے تھے تو اس ایک قصور کو،

خدا کے ساتھ سچی عقیدتمندی

وہ نماز پابندی سے تو نہیں پڑھتے تھے، لیکن اکثر تازہ غسل کے بعد جب ان کا دل چاہتا تھا پڑھ لیتے تھے، اور مفصل کی تحصیلوں میں عید بقرعید کی نماز بھی اکثر گھر ہی میں پڑھتے تھے لیکن جس وقت قاعدے سے نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے، اس وقت وہ صحیح معنی میں مجسم تصویر عبودیت ہوتے تھے، جس خلوص اور عاجزی کے ساتھ ارکان نماز ادا کرتے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ

اس وقت وہ اپنے معبودِ حقیقی کو نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں، اور بعد نماز دعا کا انداز تو ایسا تھا کہ جتنے ان کے شریکِ نماز رہتے تھے، ناممکن تھا کہ سب کی گھگھی نہ بندھ جاتی،

موت کا خیال پیشِ نظر | کوئی ہفتہ ایسا نہیں گذرتا تھا کہ جس میں وہ موت کا ذکر تفصیل کے ساتھ نہ کرتے رہے ہوں، اور اگر اس وقت کوئی اتنا بھی کہہ دیتا کہ اب اس ذکر کو جانے دیجئے، تو فوراً بگڑ جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ "دوسرے" یہ جاننے کے بعد بھی کہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور پیش آکر رہے گی، پھر بھی اپنے نفس کو دھوکا دینے کے لئے اس خیال کو ٹالتے رہتے ہیں، لیکن میں اوروں کی طرح بنا ہوا آدمی نہیں ہوں، اس لئے سمجھتا ہوں کہ زندگی غیر اختیاری اور اتفاقی ہے، لیکن موت لازمی اور قطعی ہے،

اولادیں اور آپس کے تعلقات | دونوں لڑکیوں کی شادی ان کی حیات ہی میں ہو چکی تھی، اور اپنے اپنے گھر سے خوش ہیں،

بڑا لڑکا احمد حسن، علی گڑھ میں بی، اے کے پہلے درجہ میں پڑھ رہا ہے، اور دو لڑکے مجھ سے ہیں، بڑا شاہد حسن ۹ برس کا، اور چھوٹا ناقد حسن ۷ برس کا،

جب کبھی ہم سب پردیس میں یا وطن میں ایک جا ہوتے تھے، تو کچھ عجیب لطف رہتا تھا، آپس میں خاص طرح کے تعلقات، باہمی خلوص، یکرنگی اور یکجہائی کے ساتھ کی وہ معصوم خوشیاں، اور اس میں بالتخصیص اُن کی شرکت،

تحریر کی طرح ان کی تقریر بھی نہایت جامع اور مانع ہوتی تھی، اس پر وہ ان کی خاص طرح کی ظرافت،

بعض وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہم سب اس دُنیا سے تعلق نہیں رکھتے،

اور یہ وہ راز تھا جس کو ہم چند ہستیوں کے سوا دُوسرے سمجھ بھی نہیں سکتے تھے، حیرت ہوتی ہے کیا ہم سب وہی ہیں؟ بے شک! لیکن اب وہ رُوح باقی نہیں رہی، آہ! وہ فخرِ خاندان، رونقِ خاندان، بلکہ اقبالِ خاندان، دُنیا سے رخصت ہوگیا،

آخری علالت کا سلسلہ

اگست ۱۹۲۱ء میں ڈبرا پور میں (کانپور کی ایک تحصیل) ان کی طبیعت کچھ خراب ہوئی، وہیں تحصیل کے ڈاکٹر کا علاج ہوتا رہا، جب کچھ فائدہ نظر نہ آیا، تو پھر کانپور کے ڈاکٹر سے مل کر اُن کا علاج شروع کیا، لیکن اس میں بھی کچھ کامیابی نہیں ہوئی، تب وطن کا خیال آیا، اور یہاں پہنچتے ہی اسسٹنٹ سرجن جو نہایت ہوشیار اور قابل ڈاکٹر ہیں، فوراً بلائے گئے، اور باقاعدہ علاج شروع ہوا، لیکن یہاں بھی بجائے ترقی کے حالت اور بگڑتی ہی گئی، پھر ڈاکٹر کے مشورہ سے لکھنؤ لے گئی، اور میڈیکل کالج میں ۲ دو مہینے مسلسل کرنل اسپراسن صاحب کے زیرِ علاج رہے،

وہاں پہنچنے کے تھوڑے دنوں بعد اُن کی طبیعت سنبھلنی شروع ہوئی، اور رفتہ رفتہ اتنے اچھے ہوگئے کہ غذا بھی کافی ہونے لگی، اور اچھی طرح سب سے باتیں بھی کرنے لگے، کچھ دیر اخبار یا کوئی کتاب بھی ڈاکٹر کی اجازت سے دیکھنے لگے، ظاہرا بیماری کی بہت سی علامتیں بھی دُور ہو چکی تھیں، اسپراسن صاحب بہت خوش تھے، اور کہا کرتے تھے کہ آپ نے بہت جلد ترقی کی، لیکن اس درمیان میں اسپراسن صاحب خود علیل ہوگئے، گو دُوسرے ڈاکٹر ۲ دو وقت آتے تھے، مگر صاحب پھر اُن کی زندگی میں اسپتال نہیں آسکے،

اسی دوران میں ۱۹ نومبر کو اُن کی طبیعت پھر کچھ خراب ہوئی، لیکن ایسی نہیں کہ جس سے خطرہ کا احتمال ہوتا، اس دوبارہ خرابی طبیعت کے ساتھ اشتہا میں پھر کمی ہوگئی،

۲۱ نومبر کو ۸ بجے شب میں صرف ڈو نیم برشت انڈے، اور تھوڑا شوربہ کبوتر کا بھی غذا ہوئی، اس کے بعد حسب معمول مجھ سے کچھ باتیں کر رہے تھے کہ دفعتہً ایک گھبراہٹ کے ساتھ سر کو تکیہ پر رکھدیا، اور ایک سکنڈ میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، بس وہ کیسا منظر تھا؟ اور کیا گزر گئی؟

آہ، ظالم اور بے رحم موت! تُو نے ایک کو ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سلا دیا، اور دوسرے کو نیم بسمل، زندگی بھر تڑپنے کے لئے چھوڑ گئی،

وفات اور سببِ موت | فوراً ڈاکٹر نے آکر دیکھا، اور کہا کہ حرکتِ قلب رک گئی، اور افسوس کے ساتھ اظہارِ حیرت کی، کہ اس مرض میں مشکل سے سَو میں دو چار بدنصیبوں کو یہ صورت پیش آتی ہے" افسوس کہ آپ اُن ہی میں سے ایک تھے"

عمر کوئی ۴۶، ۴۷ کے قریب تھی لیکن اتنی بھی اُن کی صورت یا اُن کے کسی انداز سے معلوم نہیں ہوتی تھی،

وہ فطرۃً خاص طرح کے زندہ دل، شگفتہ مزاج، اور خوش مذاق آدمی تھے،

ضبط اور استقلال | اتنے طویل زمانہ علالت میں بھی اتنا ہی ضبط اور استقلال کا ثبوت انہوں نے دیا، جتنا کہ ایک کمزور انسان دے سکتا ہے،

اگر کوئی کچھ تسکین کا فقرہ کہتا تھا، تو وہ شگفتہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ بعض وقت

ہنس دیتے تھے، اور کہتے تھے کہ تم لوگوں کے یہ اُمید افزا خیالات صرف تمہارے دل کی تسکین کے لئے ہیں، لیکن جو ہونے والا ہے اُسے میں خوب سمجھتا ہوں، اور میری حالت خود غمازی کرتی ہے، اس خیال کے ساتھ بھی جب کوئی ان سے ملنے آتا تھا تو "وہ" اپنی اسی پہلی شگفتگی کے ساتھ اس سے ملتے تھے،

ان کی وفات سے چھ روز پیشتر جناب عبد الماجد صاحب بی، اے اُن کی عیادت کے لئے آئے تھے، ان سے وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملے، اور اسی زندہ دلی کے ساتھ دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے، خاص کر دار المصنفین کے متعلق ایک ایک کے حالات دریافت کرتے رہے،

اور خاص اسی دن، اور مشکل سے وفات سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے عبد القادر خان صاحب ڈپٹی کلکٹر ان سے ملنے کے لئے آئے، اور وہ ڈپٹی صاحب سے بھی اسی طرح ملے اور ایک ایک کی خیریت تفصیل کے ساتھ دریافت کی،

تجہیز و تکفین | حادثہ لکھنؤ میں ہو چکا تھا، لیکن پردیس میں چھوڑنے کو کسی طرح دل نے گوارا نہیں کیا، اس لئے وطن لائی، اور خود بھی تمام شب مال گاڑی میں پلنگ سے لگی بیٹھی رہی۔

آہ! جس وقت ۶ بجے صبح کو وطن کے اسٹیشن پر گاڑی رکی ہے، وطن کے کوئی ڈیڑھ دو سو معززین شرفاء اور رؤسا سے تمام پلیٹ فارم بھرا ہوا تھا، علاوہ عزیزان خاندان کے،

دل سے آواز آئی "کاش وہ زندگی اور تندرستی کے ساتھ آئے ہوتے، اور

یہ اصحاب ان کے خیر مقدم کے لئے جمع ہوئے ہوتے

اس وقت کی اپنے دل کی دھڑکن اور بیقراری کا قلم سے ادا کرنا کس قدر ناممکن ہے،

آہ! اس وقت جو چیخ میرے دل سے نکلنا چاہتی تھی، وہ قطعاً ایک بار عرش کو بھی ہلا دیتی، لیکن جو کچھ دل پر گذر گئی، اُسے رفیقِ زندگی کے پاسِ عزت نے لب تک نہیں آنے دیا،

آہ! اس خیال سے اور بھی دل کے ہزاروں ٹکڑے ہوئے جاتے تھے کہ یہ جسم بے جان جو مجھے اب بھی اپنی جان سے کہیں زیادہ عزیز ہے، اور جس کو اس حالت میں بھی میں نے ۲۴ گھنٹے اپنے سے، سوا آخری غسل اور آخری لباس پہنانے کے، ایک منٹ بھی جدا نہیں کیا، اُسے اب یہ لوگ مجھ سے جدا کرنے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری نگاہوں سے پنہاں کرنے کے لئے آئے ہیں،

غرض یہاں اُن کے مردانہ کے صحن میں جہاں ایک رات پیشتر ہی سے اُن کے لئے گھر بنا تیار تھا، اسی میں وہ جسمِ خاکی سپردِ خاک کر دیا گیا، إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

اصل فانی انسان ہیں، جہاں بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں، وہاں اس میں چند کمزوریاں بھی رہتی ہیں، لیکن ایک انسان کی بہت سی اچھائیاں اس کے عیبوں کو ڈھانک لیتی ہیں،

بے شک! وہ بھی فرشتہ نہیں تھے، مگر فرشتہ صفت ضرور تھے،

بہر حال اس کا تعلق جہاں تک نفس الامر سے ہے، لائقِ عزت و احترام ہے، لیکن جہاں تک میرے قلم سے ہے، ان چند ناچیز سطروں کو اس دعا پر ختم کرتی ہوں:-

او خدا! انسانی کمزوریوں کا صدقہ، ہر شریف اور پاکدامن بیوہ کی حفاظت کیجیو۔ دنیا بری جگہ ہے، لیکن تو اس کے اخلاق و خصائل کو اس قدر مستحکم کر سکتا ہے کہ وہ اپنے رفیقِ زندگی کے بعد بھی، اس کی لائقِ پرستش عزت پر قربان ہو سکے، اور اسکی آنکھیں اس غیر فانی روح سے اور تجھ سے کبھی نیچی نہ ہوں، اور جب وقت آ جائے وہ سرخروئی کے ساتھ تیری حضوری کا شرف حاصل کر سکے۔ بس

یہ سینہ میں تازہ زندگانی رہے گا
ترا داغ دل میں نشانی رہے گا

بسنت پور۔ گورکھپور
جون ۱۹۲۲ء

(سوگوار) مہدی بیگم

حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر

نمبر (۱)

سقراط

(یہ مضمون فرضی نام سے شائع ہوا تھا)

یونان کے مشہور اور نامور حکماء سے تھا، ایتھنس میں پیدا ہوا، یہ شہر کسی وقت میں یونان کا دارالسلطنت تھا، اس میں یونیورسٹی بھی تھی، سقراط کا باپ ایک بت تراش تھا، آبائی پیشہ کی رعایت سے اس وحید عصر نے بھی سنگ تراشی میں مشق بہم پہنچائی مگر آخر میں اسے فلسفہ کی تحصیل کا شوق ہوا، چونکہ طبیعت میں قدرتی طور پر اعلیٰ درجہ کی صلاحیت موجود تھی، اس نے نہایت تیزی کے ساتھ فلسفہ کا اثر قبول کیا،

اوائل عمر میں باقتضائے آئین ملکی اسے فوج میں داخل ہونا پڑا، کئی لڑائیوں میں اس نے بڑے بڑے کارنمایاں کیے، **ذنوفن اور ایلسی بایڈیز** سے لائق شخصوں کی جان اسی نے بچائی، اسی وجہ سے ان دونوں کو بھی اس کے ساتھ بہت محبت تھی، ذنوفن فوج کا ایک سردار ہونے کے سوا صاحب تصنیف بھی تھا، اس کی تصنیفات خاص پایہ کی ہیں، ایلسی بایڈیز ایک امیر کا بیٹا تھا، یہ بہت ہی

حسین تھا، ایتھنس کی نوخیز لیڈیاں چاہتی تھیں کہ اپنے صاف شفاف سینہ کو اس کا بستر بنائیں، مگر ایلسی بایڈیز اُن کا فرادوں کی طرف جن کے سینہ کا ابھار محض اسکے خیر مقدم کے لیے تھا، بالکل متوجہ نہیں ہوتا تھا، یا وہ شباب سے بھرے ہوئے دو قدرتی کنٹر جو آنکھوں آنکھوں میں پی جانے کی چیز تھے، اس کے لئے بالکل بے اثر تھے، وہ جذب مقناطیسی کچھ کام نہ دے سکتا تھا، نہ وہ امنگیں جن کو شباب ایک دوسرے پیرایہ میں کسی کے چھپے ہوئے لباس سے نمایاں کرتا ہے، اور جو ہلکے باریک ڈوپٹہ کی اوٹ میں بمشکل حسن عریانی چھوڑ سکتی ہیں، ایلسی بایڈیز کے ہاتھوں سے ان کا خون ہوتا رہتا تھا، اس کی بے پروائی کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ تمام زمانہ کے عشاق کا عوض صرف مہوشانِ ایتھنس سے لینا چاہتا ہے جو اس پر ہزار جان سے عاشق تھیں اور چاہتی تھیں کہ خود کو نذرِ شباب کر دیں، کیونکہ اُن کے خیال میں ایلسی بایڈیز کے حُسن کا یہ ایک ادنیٰ ٹیکس تھا، لیکن ایلسی بایڈیز کے سچے اخلاق اس کو معصیت سے ہمیشہ علیحدہ رکھتے تھے، ہر قسم کے اوصاف اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے، حسنِ صورت کے ساتھ اعلیٰ حسنِ سیرت سونے میں سہاگے کا رتبہ رکھتا تھا، اس کا جادو سقراط پر بھی چل گیا اور وہ اُسے پیار کرنے لگا،

لڑائی سے فراغت کے بعد سقراط نے اپنی پہلی وضع تبدیل کر دی، کھانے کپڑے میں سادگی برتی، فلسفیانہ تحریریں شائع کیں، ہموطنوں کو پابندیٔ مذہب کی تاکید کی، رفتہ رفتہ حکیموں کی ایک کثیر جماعت اس کے خیالات سے فائدہ اٹھانے لگی، پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہوا، مختلف باغوں اور دریا کے کنارے

پر یہ اپنے شاگردوں کو حکمت و فلسفہ کے نازک مسئلے سمجھایا کرتا، یہ طبیعت کا بہت آزاد تھا، اور انتہا درجہ کا خوش تقریر بھی، اس کی فلسفیانہ نکتہ سنجیاں آخر میں اس کے ہموطنوں کے لئے رشک و حسد کا باعث ہوئیں، ایک شاعر نے اس کی ہجو لکھی، جس کا منشا یہ تھا کہ سقراط نوجوانانِ ایتھنس کے اخلاق کو خراب کرتا ہے اور لڑکوں کو سکھلاتا ہے کہ اپنے والدین کی اطاعت سے انحراف کریں، عدالت نے اسی بنا پر سقراط کو مجرم ٹھہرایا، تحقیقات کی گئی، نتیجہ اس کو صرف گردن زدنی ثابت کرتا تھا، یہ حراست میں لیا گیا، اس کے احباب نے رہائی کی بہتیری صورتیں نکالیں، خود داروغہ جیل اس کے بھاگ جانے پر راضی ہوا، مگر سقراط کو جس وقت اس ارادے کی خبر دی گئی، اس نے اختلاف کیا، اور نہایت استقلال سے یہ بات کی کہ "میں موت سے بھاگنا نہیں چاہتا"، جیل میں اُسے زہر کا پیالہ دیا گیا، اس نے بے تکلف اپنے ہونٹوں سے لگالیا، اور اپنی جان دی!

سقراط کے خونِ ناحق سے اہلِ ایتھنس کو بعد میں سخت پشیمانی ہوئی اور اس کے دشمنوں کو نہایت ذلت کے ساتھ اپنی نالائقی کے خمیازے کھینچنے پڑے، سقراط کی سوانح عمری ژنوفن اور افلاطون نامی اس کے شاگردوں نے لکھی ہے، ان دونوں نے اس کے اقوال کی علیحدہ علیحدہ ترتیب دی ہے، جو واقعی دیکھنے کے لائق ہے،

سقراط نے شادی بھی کی تھی، اس کی بیوی بہت ہی بدمزاج تھی، سقراط کے ساتھ اس کے برتاؤ سخت تھے لیکن ہمیشہ اس سے نرمی کے ساتھ پیش آتا

تھا، اس نے اپنی بیوی کی بدمزاجی سے فائدہ اٹھایا، اس کی کچی پکی سہہ لینے سے یہ انتہا درجہ کی برداشت کا خوگر ہوگیا، ۴۶۸ برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہوا اور ۳۹۹ برس قبل وفات پائی،

سقراط کی رائے میں موجودہ وقت کو کسی آنے والے دن کی امید پر رائگاں دینا بڑی غلطی ہے، وہ کسی چیز کا پس انداز کرنا اسی لئے ایک سرے سے فضول سمجھتا ہے، اکتساب علم کے لئے اس کے خیال میں کسی وقت خاص کی قید نہیں، عمر کا ہر حصہ انسان کی معلومات کو ترقی دے سکتا ہے، اس کی رائے میں کتب بینی ہی ایک عیش ہے جو ہر شخص کا اختیاری امر ہے، وہ ایک جاہل کو واجب الرحم سمجھتا ہے، مگر اس سے بھی زیادہ اس شخص کی ہمدردی کرتا ہے جس کا مربی کوئی بدتہذیب اور تاریک خیال کا آدمی ہو، وہ کہتا ہے عالی ظرف کی پہچان یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی معززانہ برتاؤ ہوں، زیادہ سے زیادہ کوششیں اسکی یہیں تک محدود ہوں کہ دشمن کی تکلیف دینے سے محفوظ رہ سکے، غیبت کرنے والوں یا ایسے لوگوں کو جن کو دوسروں کی برائی میں دلچسپی ہوتی ہے، وہ شریف نہیں سمجھتا ان کے ساتھ انتہائی رعایت یہ ہے کہ ان کو کمینہ کہا جائے، آخر میں وہ ہر شخص کو اپنی کانشنس کی پیروی کی تاکید کرتا ہے، اس نے زور دے کر یہ بات بتائی ہے کہ صرف اصلیت پر نظر ہونی چاہیئے، اس سے غرض نہیں دوسرے کیا سمجھتے ہیں، وہ عام مقبولیت کی خواہش کو ایک طرح کا جنون سمجھتا ہے،

ایک مقام پر اس نے بہت ہی چبھتی ہوئی بات لکھی ہے، کہتا ہے کہ "میں

نہیں سمجھتا کیونکہ لوگ عقل کی مخالفت کو جائز رکھتے ہیں، کسی بات کی صحت پر
ان کو یقین کامل ہوتا ہے، تاہم وہ اس پر کاربند نہیں ہوتے، شاید کوئی خارجی
اثر وجہ مزاحمت ہو، مگر میں تو سمجھتا ہوں، ان کے ارادہ ہی کا یہ نقص ہے، مجھے
آج تک کوئی بات ایسی نہ ملی جس کی سچائی کا یقین ہو، اور نہ کر گزرا ہوں، لوگ
کچھ ہی سمجھا کریں، مجھے ان کی مخالفت کی قطعی پروا نہیں، اس لئے کہ میں ان کو
داخل جمادات سمجھتا ہوں۔"

تمدّنِ عرب
پر
ایک کھلی چٹھی

میرے پیارے ریاض! گورکھپور کے ایک دوست کے خط میں میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا کہ ریاض الاخبار میں تمدّنِ عرب کی نسبت جو نوٹ لکھا گیا تھا، اس سے وہاں کے لوگ بدظن ہو گئے ہیں، وہ استصواباً مجھ سے دریافت کرتے ہیں، کہ "ریاض کا ریمارک کہاں تک صحیح ہے"۔

مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ کا نوٹ اس وقت میرے پیشِ نظر نہیں ہے، لیکن جہاں تک یاد آتا ہے آپ نے کسی اخبار کے حوالہ سے جو لکھا تھا، اس کی تفصیل غالباً یہ ہے، (۱) شمس العلماء مسٹر سید علی بلگرامی نے تمدّنِ عرب میں حیدرآباد کی پالٹیکس پر حملہ کیا اور یہ امر اس تعلق کے لحاظ سے، جو ممدوح کو ریاست سے ہے، کسی قدر ناموزوں تھا، (۲) اسی ضمن میں ترجمہ یا ترجمہ کی زبان کی بھی شکایت تھی، جو آپ نے کسی ہمعصر کے حوالہ سے لکھی تھی،

تمدّنِ عرب کے صفحے میرے سامنے ہیں، اور میں حیرت میں ہوں کہ باوصف

کوشش، الزام اوّل کا کوئی ماخذ اس وقت تک نہ مل سکا مجھے خوف ہے آپ نے جو کچھ لکھا محض ایمان بالغیب کی حیثیت سے تھا، کیونکہ باوصف اس اعزاز کے جس کے آپ مستحق ہیں میں مجبوراً اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ آپ نے بنفسِ نفیس کتاب کے کسی حصّہ کے دیکھنے کی تکلیف نہ اٹھائی ہوگی، اس لئے آپ کی طرف سے کسی رائے کا اظہار محض کسی غیر و قیع ہمعصر کی لغزشِ خیال کی پیروی تھی جو آپ کے لئے "ہوئے بس است" سے زیادہ گئی گذری ثابت ہوئی،

جس امر کا الزامی حیثیت سے ابتداءً کسی پرچہ نے نوٹس لیا، اور باتباعِ سنت آپ نے بھی اظہارِ خیال کی ٹھہرادی، وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ مترجم نے دیباچہ میں جہاں ترجمہ کی مشکلات کا ذکر کیا ہے، کسی فروگذاشت کے لئے اس بناء پر چشم پوشی کی خواہش کی ہے کہ ایک دیسی ریاست کے ملازموں کے لئے جہاں آئے دن کی درباداریوں اور انقلابات سے فرصت نہیں ملتی، اپنے فرائضِ منصبی کے علاوہ بہت مشکل ہے کہ وہ اتنی بڑی ضخیم تالیف کے بارے تھوڑی سی مدّت میں بوجہ احسن سبکدوش ہوسکے، یہ ہے اصلیت اس الزام کی جس کو میں زیادہ سے زیادہ صرف "مولفانہ گریز" کہوں گا۔

زبان کی نسبت آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ اردو اس ابتدائی حالت میں نہیں ہے، جب شعرا کا ایک خاص فرقہ (جن کو میں نہیں جانتا ناظم کہہ سکتا ہوں یا نہیں) جس کے دل و دماغ کے نتائج انتہائی پروازِ فکر کے ساتھ بھی صرف دو مصرعوں کی صنعت تک محدود ہوتے تھے، خود کو اردو کا مربی سمجھتا تھا، ایک

شکمی زبان کے لیئے جو کوئی مستقل حیثیت نہ رکھتی ہو، جس کا رسم خط آج تک ٹھیک نہ ہو، بد نصیبی سے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ زبان کے ساتھ خط کو کوئی مناسبت طبعی نہیں ہے، یعنی زبان میں فطرۃً جو اصوات ہیں ان کو یہ بخوبی ادا نہیں کرسکتا، بالفاظ دیگر ہر لکھا ہُوا لفظ ایک خاص خیال کی تصویر ہے، جس کی آواز کو اس کے اجزائے ترکیبی سے چنداں تعلق نہیں ہے، یعنی حرکات یا لحروف کی جگہ صرف چند اختراعی علامات کی وجہ سے جو سمیاطیقی زبان کے نقصائص میں سے ہے، ہم اُردو کو جو آرین خاندان سے ہے صحیح نہیں پڑھ سکتے، اور اس لیئے لازم سا ہے کہ کسی لفظ کے پڑھنے سے پہلے ہم اس کے مفہوم سے واقف ہوں، ورنہ بے علمی میں صحیح تلفظ ناممکن ہوگا، غرض یہ کہ ایسی زبان کے لیئے جس کا املا تک صحیح نہ ہو، منقدمین کی کوششیں کسی حیثیت سے ہوں، ہر طرح لائق ادب ہیں، لیکن زمانہ کا ہر قدم آگے ہے، ہم کو نری تُک بندیوں کے سوا کچھ اور بھی کرنا ہوگا!

میرا خیال ہے کسی مفتوح قوم کے لیئے اپنی قومی زبان کو ترقی دینا صرف اس اصول پر ممکن ہے کہ زمانہ کی روز افزوں ترقی کے لحاظ سے اس میں وہ وسعت پیدا کی جائے جو قوم فاتح کے لٹریچر اور اس کی مختلف شاخوں سے مل سکتی ہے، یعنی زبان کو علوم نظری اور فلسفہ کے اکثر نہیں تو بعض اجزا سے مانوس کیا جائے اور گو یہ ممکن نہیں کہ ابتداءً علم کی اکثر شاخ میں متوازی ترقی ممکن ہو، تاہم بعض اجزاء جن سے قوم کے اکثر افراد کو فطرۃً یا اکتساباً مناسبت ہو، اس قابل ہیں کہ وہ ہمارے ملکی لٹریچر میں جذب کرلیئے جائیں جس سے اردو زبان بھی علمی حیثیت سے یورپ کی زبانوں

سے ہم ردیف ہو، اس لئے ہماری کوششوں کا رجحانِ طبعی جہاں ہم علومِ جدیدہ کو اصلی زبانوں سے حاصل کر سکتے ہیں، ملک کے عام فوائد کے لحاظ سے یہ بھی ہونا چاہئے کہ یورپ کے فلسفہ کی کسی شاخ کو جو ترتیباً ہمارے لئے موزون اور مفید ہو، اپنی زبان میں وقتاً فوقتاً منتقل کرتے رہیں، لیکن میں پہلے دیکھوں گا، آیا ہم میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ ترجمہ کی حیثیت سے ہماری پیش دستیاں طفلانہ کوششوں سے کچھ زیادہ وقیع ہوں،

ترجمہ، اگر میں غلطی نہیں کرتا، تو بعض حالتوں میں کسی مستقل تصنیف سے زیادہ مشکل ہے، جس کی غایت اصلی یہ ہوتی ہے کہ مصنف نے اپنی زبان میں جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے، مترجم بجنسہٖ ان خیالات کے سانچہ میں اپنے الفاظ سے کام لے، لیکن زورِ بیان ہاتھ سے نہ جائے، اس پابندی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ دیکھیں گے ہر زبان کے خصائص نوعی مختلف ہیں، جس طرح ایک روزمرّہ یا محاورہ، استعارہ یا تلمیح میں ایک خیال کو ادا کر سکتے ہیں، یہ ضرور نہیں کہ دوسری زبان میں بھی اسی قبیل کے الفاظ موجود ہوں، اس سے بھی زیادہ مشکل اصطلاحات کی ہے: صرف ایشیائی یا یوروپین زبانوں سے اگر ایک کا ترجمہ دوسری زبان میں ہو تو بہتیری اصطلاحات بجنسہٖ یا کسی قدر تصرف کے ساتھ کارآمد ہو سکتی ہیں، اور اکثر ایسی مشترک خصوصیات ملیں گی جن سے ترجمہ میں نہایت آسانی ہوگی، لیکن یورپ کے فلسفہ کو اگر ہم ایشیائی زبان میں لینا چاہیں تو ہماری دشواریوں کی کوئی حد نہیں رہتی، خاصکر اردو جو بجائے خود مستقل زبان نہیں ہے، تاوقتیکہ عربی مصطلحات سے مدد نہ لی جائے، علمی حیثیت

سے کسی ترجمہ کی کفیل نہیں ہوسکتی، یعنی ایک مترجم کے لئے اس کی ضرورت ہوگی، کہ جہاں وہ مغربی زبانوں اور علوم جدیدہ میں کافی دستگاہ رکھتا ہے، صرف اُردو کا ادیب نہ ہو، بلکہ اس کے اصلی ماخذ یعنی مشرقی علوم، بالتخصیص سنسکرت اور عربی کا پورا عالم ہو، اس کے ساتھ ہی علم اللسان کی موشگافیوں سے پورا مذاق رکھتا ہو مختلف زبانوں میں اصطلاحات یا الفاظ مرادف کے اشتقاق ان کے استخراج اور خواص طبعی سے واقف ہو، اس جامعیت کے ساتھ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں، ملک کے علم دوست حضرات کے لئے کسی علمی ترجمہ کا کفیل ہندوستان میں بالتحقیق سید علی بلگرامی کے سوا کون ہوسکتا ہے، جو یورپ و ایشیا کی متعدد السنہ کے اکثر خاندانوں کا زبردست فاضل ہے،

ان مسلمات کے بعد جو تمہیداً بیان کئے گئے ہیں، میں تمدن عرب کو پیش کرنا چاہتا ہوں، جو میرے خیال میں تاریخی فلسفہ کا بہترین نمونہ ہے، اور میں اپنی اس رائے میں غالباً منفرد نہیں ہوں کہ ترجمہ کے لحاظ سے لائق سے لائق شخص کا انتہائی تخیل جو کچھ ہوسکتا ہے، کتاب اس کی پوری تصویر مرقع ہے، افسوس ہے کہ میں اپنی مصروفیت سے اس قدر وقت نہیں پاتا کہ اپنے دعوی کی دلیل میں اقتباسات کو پیش کرسکوں، یہ فرض ریویو نگار کا ہے جس کو غالباً مولوی وحید الدین سلیم، معارف میں تفصیل کے ساتھ ادا کرچکے ہیں، میری غایت صرف یہ ہوگی کہ واقعی اوصاف کے ساتھ اس تالیف کی تقریب پبلک میں اس حیثیت سے کی جائے جس سے کسی غلط فہمی کا اگر قبل از وقت پیدا ہوگئی ہو، استیصال ممکن ہو،

بہر حال میرا دعویٰ یہ ہے کہ ترجمہ شستہ، رُفتہ، صاف اور اس قدر لطیف ہے کہ مستقل کتاب کا دھوکا ہوتا ہے، یعنی اصل مصنّف کے خیالات یا مسائل تاریخی اس طرح مترجم کے دماغ میں پیوست معلوم ہوتے ہیں کہ وہ مجدداً اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں ان کو بے ساختہ ادا کرتا ہے، اور یہی وہ امتیازی حیثیت ہے جو لائق مترجم کو مؤلفین کی عام رفتار سے بہت آگے ڈال دیتی ہے، لطف یہ ہے کہ ساری کتاب میں کہیں سے پیچیدگی نہیں، تعقید نہیں، نازک سے نازک فلسفیانہ بحثیں معمولی روزمرّہ جہاں تک ساتھ دے سکتا ہے، اس برجستگی کیساتھ اُردو قالب میں ڈھالی گئی ہیں کہ دماغ پہ زور ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو کچھ اہتمام کرنا پڑا، غرض دقیق سے دقیق مطالب بھی اجنبیّت یا غربتِ الفاظ کے تابع نہیں ہیں، مختصر یہ کہ تاریخی لٹریچر کے لئے جس اسٹائل یعنی خاص طرزِ تحریر کی ضرورت ہے، وہ ضرورت کامل احتیاط کے ساتھ پوری کی گئی ہے، اور سخت چھان بین کے بعد بھی کوئی رکیک امر ایسا نہیں ملتا جو متانتِ تالیف سے گرا ہوا ہو، میں نہیں جانتا اس سے زیادہ ہماری توقعات کیا ہو سکتی ہیں،

میں امید کرتا ہوں کہ میرے مخاطب صحیح وہ لوگ نہیں ہیں جو تمدّنِ عرب میں وہ زبان ڈھونڈتے ہیں جو شوق یا قلق کی مثنویوں میں لکھی گئی ہے، یہ جاہلانہ گروہ سرے سے لائقِ التفات ہی نہیں ہے، سچ یہ ہے کہ تاریخی فلسفہ کے لئے جس طرزِ تحریر کی ضرورت ہے، وہ خود ایک مستقل اسٹائل ہے، جس کی اولیّت کا فخر شبلی اور سید علی کے حصّہ میں رہے گا، جو حضرات اپنی لکیر پیٹے جاتے ہیں، ان کو

یاد رکھنا چاہیئے کہ "عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی،

مختصر یہ کہ میری رائے کا میلانِ طبعی یہ ہے کہ اُردو زبان میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت سے یہ کتاب مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی اس لائق ہے کہ انیسویں صدی کے معظمات الامور میں محسوب ہو، بالتخصیص نفسِ مضمون کے لحاظ سے جو نہایت اہم اور قابلِ غور ہے، لیکن کم سے کم نصف صدی کے بعد شاید یہ مذاق پیدا ہوگا کہ ہم اس قسم کی تالیف سے مانوس ہوسکیں جو میرے خیال میں بہیئتِ مجموعی اس قدر دقتِ نظر چاہتی ہے کہ میں مایوس ہوں، آیا ایک کم سواد شخص جس کا سرمایۂ ناز صرف اُردو کی زبان دانی ہو، اس کی نگاہ ان فلسفیانہ نکات تک پہنچ سکتی ہے، جو ترجمہ کے اجزائے کیمیائی ہیں،

ان جزئیات کی تفصیل کے سلسلہ میں غالباً میں اس لائق ہوگیا ہوں کہ اختلافی مسئلہ میں ایک کافی حد تک آپ ہم سے اتفاق رائے کے لئے آمادہ ہوجائیں، یعنی جس طرح ترجمہ کی ذمہ داریاں نہایت سخت ہیں، آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ صرف سید علی ہی اپنے عالمانہ اوصاف کے ساتھ ایسے ضخیم ترجمہ کا کفیل ہوسکتا تھا، اسلئے یہ سخت ناشکری ہوگی کہ اس کی قابلِ قدر کوششوں کا فیاضانہ اعتراف نہ کیا جائے،

میرا خیال ہے کہ آپ نے نہایت بے پروائی سے ایک غلط رائے کی پیروی کی، لائق مترجم کی حق تلفی کے سوا یہ ایک شرمناک لغزش تھی کہ ایک ذمہ دار ایڈیٹر کا قلم ذاتی تحقیق سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا، جس سے پبلک کو غالباً اخلاقی نقصان پہنچنے کا احتمال ہوسکتا ہے، میں نے آپ کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے کسی قدر سختی سے

آپ کو ٹوکا ہے، مگر یہ پیرایہ خود آپ کے اعزاز کی تائید میں ہے، جس کے لئے میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے،

میں نے قصداً ایسے امور نظر انداز کر دیئے ہیں جن سے انسانی تصنیف خالی نہیں ہوسکتی کسی آیندہ موقع پر "تصویر کا رخِ تیرگوں" بھی دکھلاؤنگا، سرِ دست میں نے صرف کتاب کی تقریب پر قناعت کی ہے، کیونکہ میرا خیال ہے بہیئت مجموعی یہ ترجمہ ایک نہایت عظیم الشان کوشش ہے،

اگر آپ پسند فرمائیں گے تو میں اپنی دوسری چٹھی میں تاریخی فلسفہ، اس کے موضوع اس کی ضرورت سے بحث کرونگا، اور دکھاؤنگا کہ یورپ کے تمام سرمایۂ تاریخی میں جو اقوام دنیا سے متعلق ہیں، اصل تصنیف (یعنی ماخذ تمدّنِ عرب) کس پایہ کی ہے، جس سے میرے احباب اندازہ کرسکیں گے کہ تاریخِ عالم کے سلسلہ میں مسلمان فلسفیانہ اور تمدنی حیثیت سے نسبتاً کس درجہ پر ہیں، ایشیا کے لئے یہ بالکل ایک جدید بحث ہے، جس کے لئے ہم کو یورپ کا بہت ممنون ہونا چاہیئے،

تمدّنِ عرب

اور

پروفیسر شبلی

فاضل پروفیسر نے اپنی ایک جدید تالیف تمدیہ کی حیثیت سے سلسلۂ آصفیہ کی فہرست میں داخل کی ہے، اور سلسلۂ آصفیہ کی تقریب ان الفاظ میں کی ہے:-

"ہمارے معزز و محترم دوست شمس العلماء مولنا سید علی بلگرامی یجیح القابہ، کو تمام ہندوستان جانتا ہے، وہ جس طرح بہت بڑے مصنف، بہت بڑے مترجم، بہت بڑے زبان دان ہیں، اسی طرح بہت بڑے علم دوست، اور اشاعتِ علوم و فنون کے بہت بڑے مربّی و سرپرست ہیں، اس دوسرے وصف نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انہوں نے نواب سر وقار الامراء بہادر کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ "ہز ہائینس نظام کے سایۂ عاطفت میں علمی تراجم و تصنیفات کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا جائے، جو سلسلۂ آصفیہ کے لقب سے ملقب ہو، اور وابستگانِ دولتِ آصفیہ کی جو تصنیفات خلعتِ قبول پائیں، وہ اس سلسلہ میں داخل کی جائیں"، سر وقار الامراء کو علوم و فنون کی

ترویج و اشاعت میں جو التفات و توجہ رہی، اور جس کی بہت سی محسوس یادگاریں اس وقت موجود ہیں، اسکے لحاظ سے جناب ممدوح نے اس درخواست کو نہایت خوشی سے منظور کیا، چنانچہ کئی برس سے یہ مبارک سلسلہ قائم ہے، اور ہمارے شمس العلمأ کی کتاب "تمدن عرب" اسی سلک کا ایک بیش بہا گوہر ہے،

تمدنِ عرب اور اس کے مترجم کی نسبت یہ اس شخص کی رائے ہے جو باعتبار وسیع النظری، اور مذاق تالیف، یورپ کے کسی مورخ سے پیچھے نہیں ہے، اور ملک میں مؤرخانہ عظمت کے لحاظ سے غالباً معلمِ اوّل سمجھا جاتا ہے،

حسنِ اتفاق ہے کہ گذشتہ اشاعت کے سلسلہ میں تائیداً مجھ کو ایک زبردست رائے پیش کرنے کا موقع ملا، جو یقینی اکثر شایقین کے تاریخی مذاق کو ابھارے گی، یہ اقتباس اس حیثیت سے "عین وقت کی چیز" ہے کہ جو لوگ تمدن عرب سی کتاب کا (جس کے تاریخی اجزا کم و بیش ہزار صفحوں پر قابض ہیں) بلحاظ فن کوئی صحیح اندازہ کرنے سے معذور ہیں، کسی حد تک ان کے خیالات پر اس سے روشنی پڑے گی، اور وہ غیر طبعی سکون جو علمی دلچسپیوں کی طرف سے دیسی طبائع میں عموماً پایا جاتا ہے، آئے دن کی چھیڑ چھاڑ سے غالباً تحریک میں آئے گا،

اگر یہ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ مجھ کو اپنی غایت میں اُمید سے زیادہ کامیابی ہوئی، کیونکہ دراصل مقصود بالذات صرف یہی ہے، ورنہ کسی تالیف یا مؤلف کا کوئی ہو، نقیب بننا بنانا منظور نہیں، ملک کے اچھے لکھنے والے میرے آپ کے اعتراف سے، جو شاید "تحسین ناسپاس" سے کچھ ہی بڑھ کر ہے، عموماً بے نیاز ہوتے ہیں، وقت اور

مذاقِ صحیح آپ ان کے نتائج افکار کی قدر کرائے گا،

پروفیسر شبلی کی تالیفِ موعود (الفاروق) جس کا ذکر ضمناً آگیا، اور جس پر ریاض الاخبار میں ایک نوٹ دیا گیا ہے، نہایت خوشی کی بات ہے کہ شائع ہو گئی، اور برسوں کے بعد حالتِ منتظرہ رفع ہوئی، یہ گوہرِ شب چراغ، اسی قیمتی سلک (سلسلۂ آصفیہ) کا ایک خوش آب موتی ہے جس میں تمدنِ عرب کے اجزا پروئے گئے ہیں، غالباً یہ عمروں کی کمائی ہے، بڑی کاوش و اہتمام سے سالہا سال کی مؤرخانہ تلاش اور تدقیق کے بعد ناموران اسلام کے سلسلہ میں خلیفۂ دوم (حضرت عمرؓ) کی لائف پر ضخیم تالیف تیار کی گئی ہے، مؤرخ نے محض تحقیقِ واقعات کے لئے ممالکِ غیر یعنی ٹرکی و مصر وغیرہ کے مصائبِ سفر برداشت کئے، سیکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے ہزاروں ورق الٹنے پڑے، اور جہاں تک دسترس تھا، اصلی ماخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا،

غرضکہ معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہماتِ مسائل ہیں جن کی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی زبان میں اس قدر مواد یکجا نہیں مل سکتا،

ایسی بے نظیر تالیف چاہتی ہے کہ مستقلاً ایک تفصیلی نظر اس پر ڈالی جائے، مگر یہ لائق لوگوں کا کام ہے، اور جس طرح ایک چلتا ہوا شاعر اوروں کی طبع آزمائی کے بعد قلم اٹھانا پسند کرتا ہے، میری خواہش ہے ذرا بڑے لوگ کچھ لکھ لیں پھر دیکھونگا مگر مشکل یہ ہے کہ آج جن کے قلم کا لوہا مانا جاتا ہے، وہ ہمعصرانہ کوششوں کے

اعتراف میں عموماً ممسک ہوتے ہیں، اور صرف اس لئے کُھل کر کسی چیز کی داد نہیں دیتے کہ وہ ان کے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، حالانکہ یہ قابلِ افسوس اخلاقی کمزوری ہے،

یہ چند سطریں جہانتک الفاروق کا تعلق ہے، صرف اشتہاری حیثیت سے ہیں، امید ہے، ملک عام طور پر دستِ شوق بڑھائے گا، محض شبلی کا نام کافی ضمانت ہے،

میری پہلی نظر بوجوہ، اپنے پیارے دوست ڈاکٹر ابوظفر پر پڑتی ہے جو غالباً کتابی اوراق کو کرنسی نوٹ کے کاغذ سے قیمتی سمجھتے ہیں، کتاب بھی ایک مادی چیز ہے، مگر بہ تبدیلِ ہیئت،

روشن خیال شیخ محمد کے ہوتے گورکھپور کی بدنصیبی ہوگی، اگر کیلنن لائبریری کے آغوش میں سلسلۂ آصفیہ کے یہ قیمتی نمونے (تمدنِ عرب والفاروق) پیش پیش نہ ہوئے،

علامہ نذیر احمد ایل ایل ڈی

اور

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

ملک کے اس فاضل اور نہایت زبردست ادیب کو ہم نے شروع شروع اس حیثیت سے جانا پہچانا کہ چند کتابیں عورتوں کے فوائد اور عام واقفیت کے لئے اُن کے قلم کے سایہ میں نکلیں، رفتہ رفتہ یہ سوسائیٹی کے نمایاں نقائص کی طرف متوجہ ہوئے، اور ایک سلسلہ مفید تر تصنیفات کا شائع ہوتا رہا جسے ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "رویائے صادقہ" جو اس سلسلہ کی سب سے پچھلی کتاب ہے، بالتخصیص لائقِ ذکر ہے،

تاہم بہیئت مجموعی اس درمیان میں یہ زیادہ سے زیادہ ناولسٹ رہے، لیکن جس زمانہ سے ان کے لیکچر شروع ہوئے، ان کی غیر معمولی قابلیتوں کے جوہر بتدریج کھلنے لگے، ناولوں کی بنیاد چونکہ اسلامی اخلاق پر رکھی گئی تھی، اس لئے وہاں بھی سنجیدگی کی کمی نہیں تھی۔ مگر لیکچروں نے بتایا کہ ان کی متانتِ تصنیف سنجیدہ تر امراضِ علمی کے لئے زیادہ تر موزوں تھی، اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرتِ بیان وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدتِ خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے

لحاظ سے صرف اس شخص کا حصّہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں، اس پر اضافہ کیجئے، اردو سی کم مایہ زبان کا ایسا شریفانہ قالب میں ڈھالنا جس پہ کلاسیکس کا دھوکا ہو، ان کو فادر آف اُردو مان لینے سے پہلے تسلیم کرنا ہوگا کہ مشرقی لٹریچر (عربی، فارسی) انکے لئے زبان غیر نہیں، اور جب ماخذ پر اس قدر عبور ہے، تو اُردو تو صرف اپنی چیز ہے لیکن باوصف ان کے وقیع عالمانہ اوصاف کے جو ایک حد تک ان کے ہمعصروں کو مرعوب کرنے والے ہیں، میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق سنجی کی آزمایش کا بہترین پیرایہ کیا ہوسکتا ہے، جس طرح یہ پُرانے ناولسٹ اور نئے لکچرار ہیں، ممکن ہے کہ لٹریچر کی کسی صنف میں جو اس سے بھی زیادہ اہم ہو، یہ کوئی بڑا کام کرسکیں،

بے شک ترجمۂ قرآن ایک مہتم بالشان کوشش ہے، جس کے لئے آیندہ نسلیں بھی ان کی ممنون ہوں گی، تاہم میں نہیں جانتا، ان سے کیا چاہتا ہوں، غالباً کوئی مستقل سلسلۂ تصنیف جس میں گہرا، اعلیٰ، اور فلسفیانہ رنگ ہو، تاریخ شبلی کے حصّہ میں رہی، بیاگرفی حالی لے بیٹھے، اور دونوں حضرات سچ یہ ہے کہ اپنا پوزیشن قائم رکھنا خوب جانتے ہیں،

یہ کچھ نہ کرتے، آنحضرت (صلعم) کی ضخیم لائف لکھ دیتے، تو زبان اور خیالات دونوں کا حق ادا ہو جاتا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ طرز تحریر کے لحاظ سے بیسویں صدی کی تالیف ہو، بعض لوگوں کو غالب کی طرح ان کی مشکل پسندی کھَل رہی ہے، اور وہ پیوندکاریاں، جو ان کی شستہ و رفتہ اور برجستہ اُردو میں ہوتی رہتی ہیں، جس میں

انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے، عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب ان کی جدّت اور اختراع اور قوّتِ آخذہ کا زور ہے، آمد کی رو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصّے بہ لحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنہ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں، تاہم متانت اور حسنِ کلام سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے، جو ان کے کلاسکل لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے، نہ ان کے اچھوتے اور مستقل اسٹائل پر کوئی اثر پڑتا ہے، جو شارع عام سے بعید اور آپ اپنی نظیر ہے جو باتیں اوروں کے ہاں بیگانی ہیں، ان کی بے ساختگی اور برجستگیٔ خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا، پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجایش ہے، ادب چاہتا ہے، سبک نکتہ چینیوں سے ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہیگا،

ہاں ان لیکچروں کے متعلق ایک بات کھٹکتی ہے، یہ مجموعہ جہاں تک اسلام اور تعلیم کا تعلّق ہے، ایک زبردست سرمایۂ علمی ہے، اور اس لائق کہ قوم کے لکھے پڑھے لوگ اسے پیش نظر رکھیں، اسلام کے اصلی مشن، یعنی توحید کو حشو و زوائد سے علیحدہ کر کے اس کی اصلی وسعت میں اس خوبصورتی سے پیش کرنا، جو فسانۂ دلچسپ کی حیثیت رکھتا ہو، اور جس سے بہتر کوئی پیرایہ خیال میں نہیں آسکتا، لیکچرار کی معرکۃ الآرا کامیابی ہے، مگر عموماً ان کے لیکچر کوئی مستقل عنوان نہیں رکھتے، جس سے یہ اندازہ کرنا ممکن ہو کہ کہاں تک نفسِ مضمون کی حیثیت سے یہ خارج از موضوع یا حدودِ تقریر کے اندر ہے، جس طرح پڑھنے والے کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کسی خاص موضوع پر وہ

کچھ دیکھ رہا ہے، لکھنے والے کی بھی کوئی غایت صریحی معلوم نہیں ہوتی، ایسی حالت میں ان کا ہر لیکچر، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو خود رو ریمارکس کا مجموعہ ہے، جس میں مقصود بالذات، صرف قوم کی حالت یا اس کی ضروری اغراض پر کچھ کہہ سن دینا ہوتا ہے،

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی طبیعت میں استطاعتِ فطری، یعنی صلاحیت نہیں ہے کہ خیالات کو کسی خاص عنوان کا پابند کر سکیں، ان کا مرتبہ انشا پردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ قصور صرف زورِ بیان کا ہے جو اظہار فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر ٹو دی پوائنٹ نہیں ہوتے،

اس خاصہ نے ان لکچروں کی وقعت کو کسی قدر نقصان پہنچایا ہے جو اپنے خصائص نوعی کے ساتھ بھی اتنے اہم ہیں کہ آج قوم کا عدائے نثر لٹریری دنیا میں جہانتک کہ پاکیزہ اور سلجھے ہوئے خیالات کے ساتھ بے مثل فصیح البیانی اور وقیع انشا پردازی کا تعلق ہے، اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز ہے، مگر یہ کمال جس کا حصہ غالب اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہے، ان کے دل و دماغ کے نتائج کو اور زیادہ ابھار کر دکھاتا، اگر متفرق عنوانوں کے تحت میں تمام ضروری امور وقتاً فوقتاً زیر بحث رہتے جن کا تعلق ہماری مذہبی، اخلاقی اور دماغی تہذیب و تربیت سے ہے اور وہ مسائل جن کی موجودہ سوسائٹی کو بوجوہ سخت ضرورت تھی، ایک ایک کر کے طے کر دیئے جاتے، جن میں من حیث الموضوع، اتنی جامعیت ہوتی تھی کہ ہر مضمون ایک قولِ فیصل ہوتا،

میری یہ توقعات مصنف کے درجہ کے لحاظ سے زائداز استحقاق نہیں ہیں، دیسی سوسائیٹی کے نقائص اور فطرتِ انسانی کے وہ دقیق راز جو بسبب غایت ظہور کے عام نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، فاضل ادیب کی نگاہ جیسی گہری ان پر پڑتی ہے، تقلیداً بھی اوروں سے ممکن نہیں، ثبوت کے لئے دیکھئے "رویائے صادقہ" کا وہ حصہ جہاں دہلی کی سوسائیٹی کا نقشہ کھینچا ہے، میرے خیال میں دو سطریں بھی اس سے بہتر نہیں لکھی جا سکتیں، یہ ایک سرسری نمونہ ہے ان قیمتی آثار کا جو قریب قریب ان کے ہر حصۂ تصنیف میں مل سکتے ہیں، بہرحال کثرت سے مختلف عنوانوں پر لکھنا ایک ضرورت ہے جس کی رعایت اگر نہ کی گئی تو باوصف صنائع لفظی و معنوی اور فاضلانہ تراش خراش یعنی غایت نکتہ سنجی کے جو بہیئت مجموعی لیکچروں کی روح رواں ہے، یہ مجموعہ من حیث الفن لیکچرار کے مرتبۂ کمال کو دیکھتے گرا ہوا رہیگا، پچھلے لیکچروں کو دیکھئے، کثرتِ تعداد اور ایک ہی قسم کے خیالات باختلافِ الفاظ ملیں گے، اور گو ظرافت اور طباعی ان مجموعۂ الفاظ میں ہمیشہ تصرف کرتی رہتی ہے، جو بار بار ایک ہی موضوع پر کئے گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشکل سے ان کی نثر کا کوئی حصہ یاد ہوتا ہے، لیکن نرے الفاظ کتنے ہی خوشگوار لباس میں ہوں، نفس مضمون کی شستگی اور ہم طرحی کی کہاں تک تلافی کر سکیں گے،

اس ضمن میں مجھ کو بالتخصیص ان سے جو شکایت ہے یہ ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی برکات یعنی اُن فوائد کے ذیل میں جو ملک کو پہنچتے ہیں، یہ عادۃً قریب قریب

ہر لیکچر میں جن اہم چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، وہ سوئی، پیچک، دیا سلائی، اور چاقو وغیرہ وغیرہ، یہی سب ہوتی ہیں جو ادنیٰ درجہ کے بساطیوں کے مقابلہ میں ان کے ہاں زیادہ سستی ہیں، یا تو ان چیزوں سے اتنی مساوات ہوگئی ہے کہ انیسویں صدی کی ایجادات میں انہیں سر فہرست دیکھنے کو جی نہیں چاہتا یا واقعی یہ ہے کہ ان کی انشا پردازی ان چیزوں کے ناموں سے ہم سطح نہیں ہو سکتی، بہرحال کثرتِ نوادر گراں گذرتا ہے، نظر ثانی میں یہ حصّہ نکال دیا جاتا تو اچھا تھا،

اس کا بھی افسوس ہے کہ ان کے لیکچر، اب زیادہ سے زیادہ ترجمۂ قرآن کے اشتہار ہوتے ہیں، پھیکے، بے لطف، جن میں نسبتاً کوئی جدت نہیں، دلچسپی نہیں، خیال کے ساتھ الفاظ کا ذخیرہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ختم ہو چلا، حالانکہ ہمارا آخری سہارا یہی تھا کہ مختلف موقعوں پر جو کچھ انکی زبان و قلم سے نکل جائے ہمارے لئے پھر بھی ایک چیز ہوگا، میں نے نہایت غور سے یہ بات پیدا کی ہے کہ جس طرح ناولوں میں برعایتِ فن یہ اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے بے تکلف اظہارِ خیال کر سکتے ہیں، لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے، (مثلاً تاریخ وغیرہ) جن میں وسعتِ نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوتِ استقراء، تفریحِ مسائل حسنِ ترتیب، اور غیر منقطع انضباطِ خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف نہیں آتے، یہ وہی آزادی ہے جس کا اثر لیکچروں پر دکھایا گیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی طرف سے کسی ضخیم تالیف کے فوائد سے جو ان کی مستثنیٰ قابلیت کے دیکھتے ہوئے ہمارا انتہائی تخیل ہو سکتی ہو آج تک محروم رہے،

یا حدیث و سیر میں اُن کی وسیع النظری جس کا لوہا مانا جاتا ہے، میں نہیں جانتا اس وقت تک کارآمد ہو سکتی ہے، جب تک مذہبی تحقیقات کی بنیاد جدید علم کلام، یعنی انیسویں صدی کے سائنس پر نہ رکھی جائے، لیکن ان کے لائق رشک دل و دماغ کا جو مصرف میں نے سوچا ہے، اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا، میں نے اُن کی موجودہ تصنیفات کو اُن کے مرتبۂ کمال کے مقابلہ میں اگر غیر کافی سمجھا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ آج جتنی عظمت ان کی میرے دل میں ہے، میں خود اس کے صحیح اندازہ سے قاصر ہوں، جب تک شمس العلماء تھے خیر ایک بات تھی، اب ڈاکٹر ہوئے، اور کسی طرح معمولی میں نہیں آتے، تصنیفات میں بھی لازماً حکیمانہ رنگ ہونا چاہیئے، اس لئے نہایت مناسب ہوگا، اگر یہ اردو میں "قاموس الاسلام" لکھ ڈالیں، میری مراد ایک ایسے مجموعۂ لغات سے ہے کہ جس میں تمام الفاظ و اصطلاحات جو اسلام سے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی یعنی کسی حیثیت سے کوئی تعلق رکھتے ہوں، بہ ترتیب حروف جمع کر دیئے جائیں، اور ہر لفظ کے مقابلہ میں دادِ تحقیق دی جائے، معمولی لغات میں ہم کو صرف مادۂ الفاظ، لغوی اور اصطلاحی مفہوم روزمرہ اور محاورہ یا اسی طرح کے اور سرسری امور سے غرض ہوتی ہے، مگر سائیکلوپیڈیا یا مصطلحات ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں، ہر لفظ کی گویا ایک مختصر سی تاریخ لکھنی ہوگی، اور بلحاظ نوعیت جس قسم کی معلومات درکار ہونگی، بحث کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پائیگا، طرزِ تحقیق جہاں نری زبان دانی سے کام نہ چلے، کہیں مؤرخانہ ہوگا کہیں محدثانہ اور کہیں دونوں پہلوؤں سے الگ عالمانہ اور مجتہدانہ روش ہوگی، جو امور تاریخ سے متعلق

ہیں، ان میں وہ شہادتیں کافی ہوں گی جو عام مورخین کے نزدیک مسلّم اور متفق علیہ ہیں، جو مسئلہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے، اس میں زیادہ تر تدقیق کرنی ہوگی، اور تمام پُرانے اصولوں سے کام لینا ہوگا جو محدثین نے اخبار و روایت کی تنقید کے لئے قرار دیئے ہیں، مگر تحقیقات کے سلسلہ میں وہ الفاظ و اصطلاحات جن کے تحت میں روایاتِ ضعیفہ اور دور از کار قصے قدیم تفسیروں میں بھرے ہوئے ہیں، ان کی تدقیق قطعاً اصولِ عقلی اور لاآف نیچر سے کرنی ہوگی، ورنہ یہ تالیف اپنی مخصوص صفات کے ساتھ بھی ایک مجموعۂ بے کیف یا تقویم پارینہ سے کچھ ہی بڑھ کر رہے گی، اور یہ منظور نہیں،

صائب الرائے مصنف کا اسلامی علوم یعنی قرآن، حدیث، فقہ، مغازی، مذاہبِ سلف، لغت، قیاس وغیرہ میں اندازِ کافی دستگاہ رکھنا ایک کھلا ہوا راز ہے، جس پر کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، اس پر اُن کی غیر معمولی ذہانت بلکہ استخراج اور تدین و استدلال کی وقعت کو بڑھائے تو جامعیت کا دائرہ بوجہ احسن پورا ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ میری خاطر سے مان لیجئے کہ منتشر معلومات کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جو کسی خاص سلسلہ میں مدون نہیں ہو سکتا اور عموماً بے کار رہ جاتا ہے، یہ ایک واقعہ ہے کہ میرے مخاطب صحیح کو ابتدائی درس و تدریس کے زمانے سے آجتک جب وہ ایک گراں پایہ مصنف اور لیکچرار کا درجہ رکھتے ہیں، بہتیرے نہایت دلچسپ مواقعِ تحقیق پیش آتے ہونگے، جن کے نتائج اُن کے سینہ میں کچھ مقفل ہیں، کچھ تلف ہو گئے، میرے خیال میں صرف پیش کردہ تالیف میں یہ وسعت و استعداد ہے کہ وہ ان کے عمیق جذبات اور مخفی قابلیتوں کو ہیجان میں لائے جس سے دفینہ غیر محسوس یعنی معلوماتِ متفرق کا ہیولیٰ مجموعی، یعنی کتابی صورت پیدا کر سکے،

مختصر یہ کہ اس تقریب سے ایک بیش بہا مجموعہ تیار ہو جائیگا، اور ایک ایسی ضرورت رفع ہو جائیگی، جس کی علامہ نذیر احمد کے ہوتے کسی اور سے امید کرنا اُن کی حق تلفی کرنی ہے، یہ لٹریچر کے گراں وزن حقوق سے سبکدوش ہو جاویں گے، اور ملک و قوم کو جو فائدہ پہنچے گا، وہ متعدی اور متوارث ہوگا،

قوم کے نوجوانوں کے لئے جہاں دماغی اور عقلی ترقیوں کی آجکل کوئی حد نہیں ہے، مذہبی عنصر جو قومیت کی رُوح ہے قریب قریب فنا ہوتا جاتا ہے اور ایک وقت آئیگا جب انتہائے مغربی خیالات کے ساتھ ہماری نئی پود معمولی مذہبی الفاظ سے ناآشنا ہوگی، جو اسلام کی حق تلفی کا بدترین پیرایہ ہے،

اگر سویلیزیشن اور سائنٹفک ترقیات کے ساتھ بھی بقائے مذہب کی ضرورت ہے تو میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ سب سے پہلے جدید نسلوں کے ہاتھ میں ایک ایسی تالیف دینی ہوگی جو جامع معقول و منقول ہو، اور جس میں اسلام کے اصول و فروع پر حصولِ اطلاعات کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہو جو انہیں آیندہ صدیوں میں واقفیتِ عامہ کے لحاظ سے ہمارا بہترین رہنمائے مذہب ہو سکے، گو اس تالیف کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ عام پسند ہوگی، بالفاظِ غیر امید نہیں کہ مؤلف کو مالی حیثیت سے کافی معاوضہ مل جائے، لیکن میرے خیال میں بہ لحاظ اس شریفانہ غایت کے جو تالیف کا مقصود ہے، اس حیثیت سے قطع نظر کر لینی چاہیے، اس کا خاص پسند ہونا بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے، جو اولوالعزم مؤلف کو اگر میں صحیح رائے قائم کرنے کے لائق ہوں مالی قدردانی کی طرف سے قطعی بے نیاز کر دے گا،

ایک انگلش پروفیسر نے انگریزی میں ایک ضخیم ڈکشنری آف اسلام لکھی ہے، جوکہ ۲ پونڈ ۲ شلنگ کو ملتی ہے، اس کا جدید ایڈیشن آجکل میرے مطالعہ میں ہے، مگر یہ ایک ایسے شخص کی تحقیقات کا نتیجہ ہے جس کو ظاہراً اسلام یا پیغمبر اسلام سے کوئی ہمدردی نہیں معلوم ہوتی، اور گو اسکی مرتب تحقیقات کا ماخذ اصلی تصنیفات یعنی عربی کتابیں ہیں، تاہم اکثر موقعوں پر وہ میور یا اور متعصب عیسائی عالموں کا ہم آواز ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو مہتم بالشان مسائل تھے ان ہی میں دانستہ ٹھوکریں کھائی ہیں، پھر بھی تحقیق اور دقتِ نظر کی حیثیت سے اس قابلِ قدر مجموعہ کے مؤلف کی کوششیں ہر طرح لائقِ اعتراف ہیں، بہرحال ڈاکٹر نذیر احمد کی جامعیت پکارے کہتی ہے کہ "انسائیکلوپیڈیا" کی تکمیل کے لئے ان کو اپنے دائرۂ معلومات کے نتائج جس حد تک وسیع کرنے ہوں گے ان کا کفیل دنیائے اسلام میں ان سے بہتر شاید کوئی نہیں ہو سکتا، صرف یورپ سے میٹریل فراہم کرنا ہوگا، اور یہ ان کی زائداز ضرورت خوش حالی اور فرصت کو دیکھتے بڑی بات نہیں،

مجھ کو اعادہ کرنا پڑتا ہے کہ تبحر علمی، فطری ذوق مناسبت، تحقیق کی کاوش اور وثوق کامیابی جو ان کے خصائص میں سے ہے، یہ وہ اسباب ہیں جن سے بہتر اس تالیف کے لئے خیال میں نہیں آسکتے، اور جب یہ دیکھتے کہ تحقیق کا سلسلہ ہر لفظ کی ضروری تشریح کے ساتھ ختم ہو جاوے گا تو نسبتہً ان کے لئے آسانی کی کوئی حد نہیں رہتی، میرا خیال ہے، ملک کے اس رفیع المرتبت انشاپرداز کی یادگار جس سے آیندہ نسلیں کوئی صحیح اندازۂ کمال کر سکیں "قاموس الاسلام" کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس طرح

ملک آج ان کا لوہا مانتا ہے، یورپ میں بھی استفادۂ ان کی اریجنل تحقیقات اور تلاش کے ثمرے عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے، زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پیدا نہیں کر سکتا جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں، جہاں تک لائق ادب مشرقیت کا تعلق ہے، قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزا کچھ اٹھ گئے، کچھ باقی ہیں، قدیم علوم کے نام لیوا دو چار سے زیادہ نہیں ہیں، جس مربی مرحوم عربی کو آج ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈھتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہو جائے گی، مگر میرے منہ میں خاک ان کا حصۂ غیر فانی یعنی "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" مرنے والی چیز نہیں، وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہے، اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل ہو سکتا ہے، جس کی طرف میں ان کو تھوڑی دیر کے لئے متوجہ کرنا چاہتا ہوں،

بیسویں صدی کا آغاز

اور

دماغی صحبت غیرفانیوں سے

ساٹھ صدیاں یعنی چھ ہزار برس گذر گئے کہ قدیم اہلِ بابل[1] نے پہلے پہل اپنے خیالات، اپنی قوم کی تاریخ، اور دنیا کی نسبت جو خاص طرح کے تصورات وہ رکھتے تھے، ان کی یادداشت کے لئے مٹی کی اینٹوں کا استعمال کیا، ان کے بعد مصریوں اور عبرانیوں کا زمانہ آیا، جو درخت کی چھال پر اپنے خیالات کا نقش جماتے رہے، پھر کلاسیکس کے دورِ زریں کا آغاز ہوا یعنی رومیوں اور یونانیوں نے فردِ چرمی پر اپنے نوایجاد قلم کی روانی دکھائی، جس کی نقلیں تیزدست غلام تیار کرتے تھے، اور جس کے بہترین حصے وسعت کے ساتھ ملک میں شائع کئے جاتے

---

[1] بغداد سے جانب جنوب وہ حصہ جس میں ہو کر دریائے فراط بہتا تھا، بکلدانیوں کا مشہور دارالسلطنت قدیم زمانہ میں روئے ارض پر سب سے بڑا اور پُر رونق شہر تھا، تیرہ لاکھ کی آبادی تھی، تفصیلی حالات کے لئے "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" اور "البشیر" ۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء

تھے، اس کے بعد عہد ظلمت نے عارضی تاریکی پھیلائی جس کی تلافی مافات یا وش بخیر نشاۃ الثانیہ[1] کے دور نے کی جس کے ساتھ چھاپہ کی ایجاد آئی، اور ہماری موجودہ دنیا اور اس قدر کثیر تعداد تک تصنیفات کی پیداوار پہنچ گئی ہے کہ آج دنیا کی بڑی لائبریریوں کی الماریوں میں جتنی کتابیں ہیں ان کا شمار لاکھوں تک پہنچ گیا ہے،

کوئی چیز اس ذہانت اور ذکاوت سے بڑھ کر عجیب و غریب نہیں ہے جس نے موجودہ زمانہ میں انسان کے لئے ایسے وسائل و ذرائع فراہم کر دیئے ہیں، جو اس کی جسمانی آسایش اور دماغی ترقی کے بڑھانے والے ہیں، انیسویں صدی نے انسانی افعال کے لئے صرف نئے اصول ہی ایجاد نہیں کئے، بلکہ اس نے پرانے اصول کو نئے ڈھنگ اور نئے اسلوب سے برتنے کے طریقے بھی بنائے جو اختراعات جدیدہ کے مقابلہ میں کچھ کم ضروری نہیں ہیں، سائنس کے تعجب انگیز انکشافات نے مادی دنیا میں اس حد تک انقلابات کر دیئے ہیں، جن سے کلیتہً ہمارے طرز زندگی اور رسل و رسائل کے وسائل کی ہیئت بدل گئی ہے، اسی طرح علوم و فنون کی دنیا میں نمایاں ترقی نے ہمارے لئے روزافزوں اور مختلف مواقع اخلاقی اور دماغی اصلاح کے پیدا کر دیئے ہیں، یعنی عملی زندگی شروع ہو گئی ہے،

گذشتہ صدی کے مسلسل اختراعات و انکشافات کے مقابلہ میں یہ ناممکن سا معلوم

---

[1] چودھویں اور پندرھویں صدی میں یورپ جہالت کی تاریکی سے باہر آیا، علوم و فنون، صنعت و حرفت کے چرچے شروع ہو گئے، یعنی یونان و روم کا تمدن از سر نو تازہ ہوا،

ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کسی وقیع اضافہ سے بازی لے جائے، اس نے ہم کو جہاز دیئے، ریلوے دی، بری اور بحری تار دیئے، فولاد بنانے کی ترکیب بتائی، اخباروں کے چھاپنے کی کل، لکڑی سے کاغذ بنانے کا فن، زراعتی آلات کی ایجاد جس نے کاشتکاروں کے کام کو بالکل بدل دیا ہے، اور بے شمار صنعتی ایجادات، ان اشیاء کی ساخت کیلئے جو کثیر النوع اور مختلف الاشکال ضروریاتِ انسانی کیلئے لازم سی ہیں، یہ سب مرحوم صدی کی یادگار ہیں، سائنس میں ایسے ایسے اُمور دریافت کئے اور کیمسٹری میں وہ وہ موشگافیاں کیں کہ آج مستقلاً جتنے علوم نکل پڑے ہیں اور جنکی بنا پر ہمارے حیرت انگیز تصرفات کی حد نہیں رہی، عمارفان لاآف نیچر کے معجزات میں سے ہیں، اسی کے ساتھ ہماری بہتیری تحقیقاتیں اُدھوری بھی ہیں جو امید ہے آیندہ حوائجِ انسانی کی کفالت کے لائق ہو سکیں گی،

بہرحال انیسویں صدی، خاصکر پچھلا نصف حصّہ ایک عملی دَور تھا جس میں افاداتِ جسمانی کی حیثیت سے دماغ نے زیادہ تر اپنی کوششوں کو ان امور کے لئے وقف رکھا، جو ہماری شاندار اور سائنٹفک زندگی کی حوائج کی معین تھیں، مگر سوال یہ ہے کہ علمی حیثیت سے ہم نے کیا کیا؟ قریب قریب کچھ نہیں! مثلاً اعلیٰ درجہ کے پاکیزہ لٹریچر کو لیجئے تو ہماری موجودہ مخلوقاتِ حرفی کہیں سے نسبتہً اس لائق نہیں ہے کہ وہ اساتذہ قدیم کے دل و دماغ کے نتائج سے ٹکر کھا سکے، جو اپنی شہرت اور بقائے دائمی کے آپ ضامن ہیں، جہاں سائنس میں ہماری فتوحات حیرت انگیز ہیں؛ ہمارا لٹریچر لازماً مصنوعی اور تقلیدی ہے، تاہم دنیا میں کبھی اتنے لکھنے والے نہیں تھے

نہ کبھی اتنے شائع کرنے والے، نہ اتنی کتابیں، نہ اتنے پڑھنے والے،
دنیا ہر وقت حرکت میں ہے، یہ ایک ایسا صاف مسئلہ ہے کہ بحث کی ضرورت نہیں، لیکن محض اس کی حرکت سے یہ دعوٰی نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے پیش رووں سے اچھی کتابیں لکھتے ہیں، یا ہمارے شاعر عمدہ نظمیں، یا ناولسٹ بہتر قصے، یا ہمارے فلسفی اخلاقی اور دماغی حیثیت سے کسی اونچی سطح پر ہیں، ہاں! کہیں کہیں کوئی اچھا لکھنے والا نظر آجاتا ہے، مگر وہ زمرۂ عام میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں ملتا، البتہ ہمارے قدیم خلاقینِ سخن علمی دنیا میں ایسے سر برآوردہ ہیں کہ امتدادِ وقت اُن کے نتائج فکر کے آثار کو اس وقت تک زائل نہ کر سکا،

ایسے دو شخصوں میں جن میں سے ایک نے متقدمین کے دل و دماغ کے نتائج یعنی کلاسیکس کو غذائے علمی بنایا ہو، اور دوسرے نے آجکل کی رائج الوقت آخور تصنیفات کو دیکھا بھالا ہو، مقابلہ کیجئے تو آپ پائیں گے کہ جس نے گبن، باسول، جانسن ملٹن، ایڈیسن اور اسٹیل، ڈیکونسی، شیلی اور کیٹس، بائرن، اسکاٹ، ڈیکنس اور تھیکرے، کارلائل، اور میکالے سے فائدہ اٹھایا ہے، اس میں ادائے سخن کی ایک خاص طرح کی سلاست اور نزاکتِ خیال، محاورات کی برجستگی اور زبان پر اقتدارِ کامل کا پتہ ملے گا، بمقابلہ سطحی اور مذبذب مذاقِ سخن اور کمی معلومات کے جو ان لوگوں کے خصائص میں سے ہے جن کا مبلغ علم صرف آجکل کی وقتی اور بالائی تصنیفات ہیں، جن کا حصہ غالب محض ایک طرح کا مجموعۂ لفظی ہے اور کچھ نہیں، جو شائع کرنیوالوں کے مطابع سے علی الاتصال گویا برستی رہتی ہیں، سات ہزار یا چھ سو کتابیں سالانہ کرہ بیشہ

برٹن سے، چوبیس[۲۴] ہزار جرمنی سے، تیرہ[۱۳] ہزار فرانس سے، نو[۹] ہزار اٹلی سے، پانچ[۵] ہزار ممالک متحدہ (امریکہ) سے، زائد از ساٹھ[۶۰] ہزار کتابیں ہر سال،

۱۷ سو برس پیشتر چھاپہ کی ایجاد سے ایک موقع پر کہا گیا تھا کہ تصنیفات کی کوئی انتہا نہیں ہے، لیکن قائل اب کیا کہیگا، اگر وہ آئے اور دیکھے کہ صرف برٹش میوزیم میں، پندرہ[۱۵] لاکھ جلدیں موجود ہیں، اور ہر سال برطانیہ عظمیٰ کا چھاپہ خانہ سات ہزار نئی جلدیں پیدا کرتا رہتا ہے، اور کم و بیش اسی قدر امریکہ بھی، فرض کیجئے ایک شخص ۱۰۰ جلدیں سالانہ پڑھ سکتا ہے، گو یہ ایک فیاضانہ اندازہ ہے، مرد یا عورت کے لئے جسے دنیا میں کچھ اور کرنا ہے، تو آج جتنی کتابیں برٹش میوزیم میں ہیں، انہیں ۱۵ ہزار برس میں ختم کر سکے گا، اسی طرح ہر سال جو گذرے گا، اس کی پیداوار کے پڑھنے کے لئے ہر اضافی سو برس کی ضرورت ہوگی، مختصر یہ کہ علمائے یورپ اس خطرہ کو محسوس کرنے لگے ہیں کہ دنیا کے اعلیٰ لٹریچر کتابوں کی عام طغیانی میں بہ جائینگے چنانچہ ربع صدی کے قریب ہوا کہ کتابوں کے ایک مشہور نباض "مسٹر ہیریسن" نے اپنے جامع و مانع خیالات کا اظہار یوں کیا تھا کہ "مجھ کو وسیع تصنیفات کے ناقابل اندازہ عمدگی سے اختلاف نہیں ہے، مگر ہم لٹریچر کے روشن نظارہ کی دوسری سمت کو اکثر بھول جاتے ہیں یعنی کتابوں کا استعمال بے جا یا بالفاظ غیر ایسی کتابوں کا پڑھنا جو اپنی بے غایتی، انتشار اور مہملیت کے لحاظ سے ضائعات زندگی میں شمار ہونے کے لائق ہیں، اور جنہیں ہم ان کی سمیت کے لحاظ سے برعایت بھی زیادہ سے زیادہ فضلۂ علم کہہ سکتے ہیں، معلوم نہیں ہماری غفلت وسیع تصنیفات کی طرف سے بالکل نہ پڑھنے کی وجہ

سے ہے یا ادنیٰ درجہ کی کتابوں کے مطالعہ کی ناقابلِ اصلاح عادت کا نتیجہ ہے، بہرحال مآل ایک ہی ہے، یعنی ہمارا جہل مرکب دنیا کے مشہور لٹریچر سے، لیکن ایک بات اور ہے، جو عمدہ تر تصنیفات کے شائق ہیں، ان کو وسعتِ انتخاب پریشان کرتی ہے جو عملاً غیر محدود ہے، کتابوں کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے ہم کبھی پڑھنے کے لائق نہیں ہوں گے، اسی کے ساتھ ایسی کتابوں کا اوسط بھی کچھ کم نہیں ہے، جو سرسری پڑھنے کے لائق نہیں ہیں، گذشتہ دو صدیوں میں عمدہ انتخاب کی مشکلات اتنی سخت نہیں تھیں جتنی آج ہیں، اس لئے جو جو سوال واقعی اپنی اہمیت کے لحاظ سے میرے لئے بارِ طبیعت ہو رہا ہے یہ ہے کہ وہ کونسی کتابیں ہیں جن کا علم تھوڑے سے بچے کھچے وقت میں بھی ہمارے لئے ضروریاتِ زندگی میں سے ہے، ہر کتاب جسے ہم بغیر کسی غایت کے اٹھا لیتے ہیں، ایک موقع کا اتلاف ہے جس میں ہم کوئی ایسی چیز پڑھتے جو مفید یا مقصود بالذات ہوتی،

"ہم کو معلوم ہے کہ کتابیں ایسی ہی مختلف ہیں، جیسے جواہرات اور کنکر، پتھر، اس لئے میں نہایت بھروسہ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے زمانہ کا پہلا دماغی اور عقلی کام یہ ہے کہ ہم اس چھپے ہوئے مواد کی تنظیم کر سکیں، اور اسے کار آمد بنا سکیں، جسے گذشتہ چار صدیوں نے ہمارے راستہ میں پھیلا رکھا ہے، علم کو فعل میں لانا پڑھنے کو با اصول کرنا اور سیاہی کے بہتے ہوئے آبشار سے بڑوں کے غیر فانی خیالات کا محفوظ رکھنا، ایک ضرورت ہے، بشرطیکہ انسان کی بڑھتی ہوئی ذہانت ہم کو مذموم بے نیازی کے باغِ سبز کی طرف نہ لے جائے"

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ "ایک ایسا مجموعہ جو ضروری تصنیفات کا ایک معقول لب لباب ہو، کس قدر قیمتی ہوگا جو خلاصہ ہو اس چیز کا جو تمام دنیا کے لٹریچر میں سب سے اعلیٰ اور رانگیز کرنے کے لائق ہے، اور اس لئے لازم سا ہے کہ ہم لٹریچر سے وسیع بحر زخار میں کہیں اپنا قدم جما لیں، اور قبل اس کے کتابوں کا سیلاب ان اجزا کو جو روحِ لٹریچر ہیں اپنی موجوں میں غائب کر دے، انہیں طوفانِ بے تمیزی سے بچا لیں، اس سے ہم اس دریائی آوارہ گردی سے محفوظ رہیں گے، جو خود دو طریق پر شاید ہی کبھی کنارہ پر پہنچائے، اگر ایسا نہ ہوا تو پھر یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے کو ہم سب ہی کچھ پڑھ جائیں گے، مگر علم خاک نہیں ہوگا، اور ارواحِ خبیثہ کی طرح ان متبرک مقامات سے ہمیشہ دور رہیں گے جہاں عالمِ بالا میں نفوس اعلیٰ دادِ سخن دے رہے ہوں گے۔"

ایک اور صاحب (پروفیسر میکس پولر) فرماتے ہیں کہ "بہت کم کتابیں ہیں جنہیں شروع سے آخر تک میں عظیم الشان پاتا ہوں، برخلاف اس کے اکثر ٹکڑے، حصے یا پوری نظمیں ایسی ہیں، جنہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور ہر دفعہ تعجب بڑھ کر حیرت ہو جاتا ہے کہ ایک شخص کیونکر ان کے لکھنے پہ قادر ہو سکا۔"

فاضل پروفیسر کہتا ہے کہ "اگر میں اپنا خیال آپ کو بتا دوں تو مجھے خوف ہے آپ مجھے کٹر علمی کافر سمجھیں گے یا جاہل محض، کسی بہت بڑے قدیم شاعر کو لیجئے، اور اگر آپ سچ کہلاتے ہیں تو مجھے کہنا ہوگا کہ "ہومر" میں بھی بعض ایسے طویل حصے ہیں جو نہایت گراں گذرتے ہیں، اسی کے ساتھ انیسویں صدی کے سب سے بڑے یا کسی بڑے شاعر کو لیجئے تو میں اقرار کرتا ہوں کہ "گوئٹے" ایسے شخص کے نتائجِ فکر بھی ایسے ہیں جن میں متعدد

مقامات کے دوبارہ پڑھنے سے جی اکتاتا ہے، جو ہر ان میں بھی ہوتا ہے جو بہت مشہور ہیں، اور ان میں بھی جن سے دنیا واقف نہیں ہے، مگر کوئی شاعر یا ناثر ایسا نہیں ہے، جس کا ہر حصہ تصنیف جاننے کے لائق ہو، اور جو بحیثیت مجموعی دنیا کے اعلیٰ لٹریچر کے مجموعہ میں کوئی جگہ حاصل کر سکے۔"

ان خیالات کی بنا پر تمام دنیا کے لٹریچر کا خلاصہ جو گویا "میکس پولر" کے تخیل کی تکمیل ہے، ڈاکٹر گارنٹ کی ایڈیٹری میں "اسٹنڈرڈ" نے (جو لندن کا ایک وقیع روزانہ اخبار ہے) شائع کر دیا ہے، بیس ضخیم اور خوبصورت جلدوں میں موزون اور مناسب طریق پر وہ سب کچھ جمع کر دیا گیا ہے جو آکسفورڈ کے ایک پروفیسر کے خیال کے مطابق "غیر فانی حصہ ہے نہایت فانی اجسام کا" اور جو نتائج فکر انسانی کی حیثیت سے ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے، مختصر یہ کہ دنیا کے مسلّم الثبوت اساتذہ اور نامور فلسفیوں نے جن سے بہتر استادت ایڈیٹری کیلئے نہیں مل سکتا تھا، دس ہزار صفحوں میں نہایت دلچسپ اور اعلیٰ ترین اجزا اُن تصنیفات کے یکجا کر دیئے ہیں جو ابتدائی زمانہ سے یعنی جب سے تصنیف کا فن ایجاد ہوا، آجتک کسی دور، کسی زمانہ میں، کسی حیثیت سے لکھی گئیں،

یہ لائبریری محض قدامت کا ایک مجموعہ بے کیف نہیں ہے، نہ صرف کلاسکل لٹریچر اس میں بھر دی گئی ہے، جس کی نسبت نہایت صحیح کہا گیا ہے کہ "پڑھنے کی نہیں صرف تذکرہ کی چیز ہے" نہ اس کو ان زائد از ضرورت سنجیدہ جلدوں سے تعلق ہے جو بڑے بوڑھے چھوٹوں کے لئے انعام کے موقعوں پر تجویز کرتے ہیں، نہیں بلکہ تمام متقدمین و

متأخرین، علمائے مشرقی، حکمائے یونانِ قدیم و روم اپنے اپنے درجہ کے مطابق جو تاریخ لٹریچر میں رکھتے ہیں، موزون نشست بیں ہیں،

ان دلچسپ جلدوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں جو طبقات کی حیثیت سے مرتب کیا گیا ہے، ہم علوم کا وہ سرچشمہ جاریہ دیکھتے ہیں جو یونان و اسکندریہ اور رومۃ الکبریٰ کے زمانۂ عروج میں نہایت عمیق اور زوروار تھا، اور ازمنۂ متوسط کے قریب گھٹتے گھٹتے خشک ہوگیا، صرف اس لئے کہ نشاۃ الثانیہ میں پورے زور کے ساتھ پھر بند ٹوٹ جائے، اور ہمارے زمانہ میں علمی سیلاب کی کوئی انتہا نہ رہی، بہرحال تاریخی انقلابات اپنی تدریجی رفتار کے ساتھ ایک وقت میں آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، ہر زمانہ اپنے خزائن پیش کررہا ہے جس میں ہمارا موجودہ وقت کسی سے پیچھے نہیں ہے، صدیوں کے تجربے، اور لاکھوں اوراق کے الٹ پھیر کے بعد ہزاروں صفحے انتخاب کئے گئے ہیں، جو ہر زمانہ میں مقبولِ خاص تھے، یہ انتخاب ان لوگوں کا ہے جو لٹریچر کے اکثر اصناف میں کامل الفن ہیں، اور اقتباسات کے ضمن میں جنہوں نے اپنی اپنی قوتِ فیصلہ کا زور ان مضامین میں دکھایا ہے جو ہر جلد کے آغاز میں تقریظی حیثیت سے لکھے گئے ہیں، یہ آرٹیکل بجائے خود ایک مستقل چیز ہیں، "آنکھیں ہر شخص رکھتا ہے مگر بصارت کے ساتھ بصیرت لازمی نہیں"! ان مضامین کے ذریعہ سے دس ہزار صفحات پر نظر ڈالنے کے بعد ہماری رائے ہر دور کے مختلف طبقاتِ لٹریچر کی نسبت وہی ہوسکتی ہے، جو ہمارے ذاتی تبحر علمی کے ساتھ ممکن تھی،

یہ جلدیں خوش نصیبی سے میرے مطالعہ میں ہیں، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اس امر کا اعتراف ہے کہ باوصف ان اوصاف کے جو اس لائبریری کی طرف منسوب ہوسکتے ہیں، جہانتک مشرقی لٹریچر کا استقصاء کیا گیا ہے وہ اس قدر مختصر پیمانہ پر ہے جو کسی طرح واجب الادب اور زندہ کلاسکس کی عظمت کے شایان نہیں ہے، یعنی عربی فارسی کا انتخاب جو کچھ ہے، بلحاظِ قدامت محض "تبرکات" کی حیثیت سے ہے، اور یہ بھی اصلی زبان میں نہیں، بلکہ صرف ترجمہ پر قناعت کی گئی ہے، لیکن اس سے قطع نظر کرکے یُوں دیکھئے کہ وہ قوم کس قدر خوش نصیب ہوگی جس کی مادری زبان میں اتنا بڑا سرمایۂ علمی فراہم کیا گیا ہے اور جو مختلف اقالیم سخن یعنی دنیا کے لٹریچر پر آج اس شاہانہ اقتدار کے ساتھ فایض ہے، جس کی نظیر اگر میری کم نظری پر نہ محمول کیا جائے تو گذشتہ تاریخ بھی پیش نہیں کرسکتی،

بہر حال اگر کسی قوم کا گذشتہ لٹریچر اس کے خیالات و محسوسات کا آئینہ ہے، جس میں ہم ان مٹے ہوئے آثار کی سراغ رسانی کرسکتے ہیں، جو کسی عہد میں اسکی ابتدائی نشوونما، شباب اور انحطاط طبعی، یعنی عروج و زوال کا سبب ہوئے تو یورپ کی کوششیں صرف اس لئے لائقِ شکر گذاری نہیں ہیں کہ وہ ہمارے لٹریچر کے "باقیات الصالحات" کا جامع ہے، بلکہ یہ وہ فسانہائے دلچسپ ہیں جن سے نوعِ انسانی کا رازِ ہستی، ترقی کی غایت اور اس کی تاریخ کی رفتار کا عام رُخ معلوم ہوجائے گا، لیکن یہ نہایت دقیق بحث ہے جو اس موقعہ سے چنداں تعلق نہیں رکھتی، مجھے کہنا یہ ہے کہ اس مجموعہ کو دیکھ کر پہلا خیال میرے دل میں یہ آیا کہ اس نمونے پر ایک "لائبریری آف اُرنٹیل لٹریچر"

مرتب کی جائے تو یادگار ہوگی، ہمارا لٹریچر سچ یہ ہے کہ ہماری گذشتہ حالت کا مرقع ہے
جس میں ہم کو ان اسباب کا پتہ ملتا ہے جن سے ہم صفحۂ ہستی پر آئے، پھولے، پھلے،
اور اتنے ہوئے کہ تاریخ عالم میں کوئی وزن رکھتے تھے، گو آج اتنے گئے گذرے ہیں کہ
اپنے تنزّل کا احساس تک نہیں! بے شک باعتبار خیالات اور ضروریات موجودہ
قدیم علوم و فنون عجمی ہوں یا عربی اس لائق ہیں کہ ہم انہیں جہاں تک جلد بھول جائیں
مناسب ہے، تاہم جہاں تک نفس لٹریچر کا تعلق ہے، اسلاف کے حقوق کیا چاہتے ہیں؟
آج کتنے تعلیم یافتہ ہیں جن کی لائبریریوں میں گذشتہ لٹریچر کا کوئی حصّہ مل سکتا ہے،
حالانکہ انتہائے مغربی خیالات کے ساتھ بھی بہتیرے ایسے نکلیں گے جو کم سے کم
قدیم لٹریچر کے ان اجزاء کے رکھنے کے شائق ہوں جو رُوحِ لٹریچر ہیں، . . . . .
میں نے غلطی کی، مغربی خیالات کے ساتھ جہاں تک شواہد موجود ہیں، اکثر ایسے ہیں،
جن کے مذہبی اور قومی عناصر زائل ہوتے جاتے ہیں، یا سرے سے موجود ہی نہیں،
مذہب کی جگہ لے دے کر سائنس کا آوردہ "کوڈ آف مورلیٹی" یعنی ضابطۂ اخلاق ایک
رائج الوقت چیز ہے، اور قومیت کی اس لئے ضرورت نہیں کہ بعض اتفاق سے ولایت
سے ہو آئے، اور گو ایک ہی زمین کی پیداوار ہیں، تاہم خیالات میں سمندر حائل ہے،
معدودے چند کے سوا اکثر ایسے ہیں جنہیں صرف ایک طرح کا حیوانِ ناطق کہہ سکتے ہیں،
جو کسی مفہوم کیلئے ایک سے زیادہ الفاظ یعنی زبان غیر بھی کچھ جانتا ہو، تھوڑی سی انگریزی،
کچھ ٹوٹی پھوٹی اُردو، بس اتنی کائنات ہے، اس لئے علمی اقتباذ ان کے لئے پیدا کرنا
مشکل ہے، سوا اس کے کہ قوم اور افراد کے مقابلتہً "ان کو فرمائشی کہئے"، یہ مختصر گروہ

جہاں اس لائق ہے کہ ان میں سے اکثر کما کھانے کی استعداد رکھتے ہیں، یا قرض کو آمدنی سمجھ کر اچھی زندگیاں بسر کرتے ہیں جو ان کے خیال میں غایت زندگی ہے، کہیں سے اس لائق نہیں کہ تبادلۂ خیالات کی حیثیت سے یہ کسی حد تک ہمارے لئے مفید ہو، اس کو ان کے استغنا پر نہ محمول کیجئے، بلکہ یہ دماغی عدم استطاعت یعنی کورے پن کا نتیجہ ہے، جس کی وجہ سے آج ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نئے خیال والوں میں معزز مستثنیات کے سوا (اگر ہوں) کوئی اس لائق نہیں کہ سرسید تو بڑی چیز تھے حالی و شبلی کی طرح دو سطریں بھی لکھ سکے، اگر انسانی معاشرت یعنی تمدن اور ترقی کے لئے کسی مرکز کی ضرورت ہے جس کی طرف واقعات افتاں و خیزاں جا رہے ہیں، تو یہ مرکز ابھی صدیوں میں بھی لائقِ حصول نہیں ہوگا، ہم نے ایک جماعت کو تعلیم یافتہ کر کے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ اوروں سے الگ کر دیا، خود اس کو کسی امر پر متفق نہ کر سکے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس محدود حلقہ میں بھی کوئی آیڈیل، کوئی تخیل موجود نہیں جو قومی اغراضِ زندگی میں سب سے زیادہ مہتم بالشان اور فرداً فرداً ہر شخص کا نصب العین ہو، بہرحال میں کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی انگریزی کی طرف سے یہ توقعات کہ وہ ایست والے معترف ہوں، صرف ہمارے حسنِ ظن کی افراط ہے، قدیم لٹریچر ان کو آتا نہیں، نہ یہ کہیں کے شائق، اردو، سرے سے ان کے لائق نہیں، مختصر یہ کہ ان کی ذاتی حالت سے قطع نظر کر لیجئے، تو من حیث القوم یہ ہمارے لئے ہوئے نہ ہوئے برابر!

ہاں ایک اوسط درجہ کا گروہ ہے جس سے کچھ توقعات ہو سکتے ہیں، گو ان میں سے بھی اس وقت تک کوئی اتنا نہیں ہے کہ ہمارے اولڈ اسکول مگر نئے خیالات کے

علماء کی طرح کچھ لکھ پڑھ سکے، تاہم چونکہ مغربی خیالات کے ساتھ قومیت کا احساس باقی ہے، کم سے کم یہ ان ضرورتوں کو تسلیم کرتا ہے جو ہمارے قومی مشن کے اجزائے ترکیبی ہیں، علمی مذاق رکھتا ہے، آجکل کے اچھے لکھنے والوں کا تتبع کرنا چاہتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، اُردو کی طرف سے بے پروائی اس کے خیال میں صرف پولٹیکل زوال ہی کا باعث نہیں ہے، بلکہ یہ وہ شائبہ تنزل ہے، جو حسن معاشرت اور قومی زندگی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، بہرحال جہاں اس کی ضرورت ہے کہ ملکی زبان کو اعلیٰ درجہ کے علمی لباس میں دیکھا جائے، یہ خواہش غیر طبعی نہیں ہے کہ قدیم لٹریچر میں جس قدر نظم و نثر کے حصے ایسے ہیں جو محفوظ رکھنے کے لائق ہیں، اور جن پر امتدادِ وقت کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، وہ ایک کمیٹی کے انتخاب سے لئے جائیں،

نواب محسن الملک، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر شبلی، سید علی اور علامہ حالی سے بہتر اسٹاف ایڈیٹری کے لئے نہیں مل سکتا، ہر لٹریچر کے مجموعہ کی ترتیب میں ابتداءً تقریظی حیثیت سے ایک آرٹیکل ہو، جو زبان کے تاریخی حالات، اس کی خصوصیات اور مختلف دور میں جو انقلابات ہوئے ہوں، ان کے آثار تفصیل کے دکھائے، مجموعی حیثیت سے جو کام ہوگا، منفرداً ممکن نہیں، ایک موقعہ پر کہا گیا تھا کہ پروفیسر آزاد کا لٹریچر، شبلی کی وسعت نظر، اور حالی کی بے مثل نکتہ سنجی اور سخن آفرینی اگر جمع کر دی جائیں تو نتیجہ نہایت عظیم بالشان ہوگا، قوم کی بدنصیبی ہے کہ آزاد ہمارے لئے جیتے جی مر گئے مگر شبلی و حالی تو موجود ہیں،

پروفیسر شبلی کی غائر اور وسیع تحقیقاتوں کے نتائج جس طریق پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں ان کے تبحر علمی اور دنیا کے موجودہ مذاق کے لحاظ سے اس سے بہتر پیرایہ ہو نہیں سکتا، لیکن توقعات بڑھتی جاتی ہیں، امید ہے دائرۃ التالیف کے سلسلہ میں جہانتک ہماری قدیم تاریخ کا تعلق ہے یہ اچھی طرح دادِ تحقیق دیں گے، خاص کر اسلئے کہ سلسلۂ آصفیہ نے ان کو ان ہی کاموں کے لئے وقف کر دیا ہے،

حالی کو میں ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا جو ان کو ایک اچھا شاعر سمجھتے ہیں، مگر اس استثنار کے ساتھ کہ غزل داغ کا حصہ ہے، بیشک انکی نیچرل شاعری مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے، خاص کر مسدس کی بنیاد جن امور پر رکھی گئی ہے اور جو میٹیریل استعمال کیا گیا ہے، صرف حالی کا حصہ ہے لیکن اپنا اپنا خیال ہے، میرے ذہن میں حالی کی عظمت "دیوانِ حالی" کے اس حصہ سے ہے جو "مقدمۂ شاعری" کی حیثیت سے لکھا گیا، یہ ۲۲۸ صفحے قطعاً غیر فانی ہیں، اور غالباً آج تک کسی نے اس موضوع پر چند سطریں بھی اس طرح نہیں لکھیں، مگر یہ اس وقت کا خیال ہے جب ان کی سب سے پچھلی تالیف شائع نہیں ہوئی تھی، اب حالی کس اونچی سطح پر ہیں، پھر کہیں دکھاؤں گا،

نواب محسن الملک کے دل و دماغ کے نتائج تہذیب الاخلاق کی جلدوں میں محفوظ ہیں اور ہمیشہ یادگار رہیں گے، رفیق جسمانی اٹھ گیا، مگر تہذیب کے صفحوں کو دیکھئے دونوں کے اجزار غیر فانی پہلو بہ پہلو اب بھی موجود ہیں، ممدوح کی مصروفیت و حالت صحت گو دماغی محنت کے لئے موزون نہ ہو، تاہم اس خیالی لائبریری کا ہم آپ کو

ایڈیٹر انجیت دیکھنا چاہتے ہیں،

سید علی نے تمدن عرب کے ذریعہ سے ہماری گذشتہ عظمت کا جو مرقع پیش کیا ہے سچ یہ ہے، اس سے پہلے ہم نے اپنی صورت کبھی یوں نہیں دیکھی، یہ وقیع تاریخ جس کی بنیاد مسئلۂ ارتقا پر رکھی گئی ہے، اور جو بلحاظِ نوعیت ایک نہایت زبردست حکیمانہ تالیف ہے، ہمارے لئے بہترین یادگارِ سلف ہے، کم لوگ ہیں جو سید علی کی صحیح وقعت کا اندازہ کر سکتے ہیں، مگر تمام ملک میں یہی ایک شخص ہے جو اپنی وسیع قابلیت کے ساتھ مغربی اور مشرقی لٹریچر کا جامع ہے، اور جو طرزِ تحریر اور واقفیت عامہ کی حیثیت سے ہم کو یورپ کی خوشہ چینی سے بے نیاز کر سکتا ہے، افسوس ہے کہ ایسا جامعِ حیثیات فاضل ہمارے ہاتھ سے نکل گیا،

آخر میں مجھ کو ڈاکٹر نذیر احمد کی نسبت کچھ کہنا ہے، میں مستقلاً اپنا خیال کہیں اور ظاہر کر چکا ہوں، یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ باوصف غور ان کا صحیح مصرف اس وقت تک نہ معلوم ہو سکا، یہ شخص جہاں تک مادہ کا تعلق ہے اس بلا کا انشا پرداز ہے کہ اس کو کارلائل اور میکالے نہیں بلکہ جانسن کے پہلو میں جگہ ملنی چاہیئے لیکن تصنیفات کی حیثیت سے نسبتہً یہ گھاٹے میں ہیں، ان میں جہاں اور کمالات ہیں قوت فیصلہ کی کمی معلوم ہوتی ہے، یعنی ترتیباً ان کے نتائج فکر اس وقت تک جو کچھ اور جس پیرایہ میں ظاہر ہوئے مجھے اس میں کلام ہے کہ ان کی استعداد کا سب سے بہتر اور صحیح مصرف یہی تھا، بالفاظِ غیر جس پیمانہ پر یہ آج تک اظہارِ خیال کرتے رہے وہ فی نفسہٖ ان کے کمال کو دیکھتے ہوئے کافی نہیں ہے، گو ان کی مخلوقاتِ لفظی کا حرف حرف جو

ان کے قلم کے زیر تحت ہے، اس لائق ہے کہ ہم آنکھوں سے لگائیں، کم وبیش اسی قبیل کی شکایتیں اوروں سے بھی ہو سکتی ہیں، پروفیسر شبلی نے سب کچھ کیا، مگر مسلمانوں کی عام مختصر تاریخ نہ لکھ ڈالی، نہ اس وقت تک آنحضرت (صلعم) کی لائف پر ایک حرف لکھا، حالی اگر حیاتِ جاوید نہ لکھتے تو سخت گھاٹے میں رہتے، بہر حال علامہ نذیر احمد لائبریری کے عربی حصہ کے ساتھ خوب کھپیں گے اور یہاں مجھ کو ان سے اتنی ہی غرض ہے،

میرا خیال ہے کہ اورنٹیل لٹریچر کی ترتیب حسب ذیل ہو سکتی ہے:-

(۱) عربی قدیم وجدید، ۲ جلد

(۲) فارسی قدیم وجدید، ۲ جلد

(۳) اردوئے معلّٰی، ۲ جلد (جملہ ۶ جلدیں)

ہر جلد کے تقریباً ہزار صفحے ہوں گے، نہایت اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر مفید عام آگرہ یا نامی پریس کانپور کی چھپائی ہو گی اور جلدیں پورٹ کپڑے یا چمڑے کی کسی ولایتی کارخانہ سے تیار کرائی جائیں گی، جس میں پشتہ پر سنہرے حرفوں میں نام ہو گا، اور جلد کی بالائی سطح پر طلائی نقوش میں "ہال مارک آف علی گڈھ" میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ پچاس روپیہ تک ایک سٹ کی قیمت ہو گی،

میں نے آخر میں اردوئے معلّٰی کے لئے دو جلدیں رکھی ہیں، یورپ کی افراط کے مقابلہ میں ہماری تفریط (بلحاظ تصنیفات) غور طلب ہے، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ مقررہ صفحے کیونکر بھرے جائیں گے، کیونکہ علی گڈھ مشن اور اس کے ریکرڈ سے قطع نظر کیجئے تو نثر کے برائے نام اخلاقی ناولوں اور افسانۂ آزاد کے سوا کچھ رہ

نہیں جاتا، تاہم میرا خیال ہے "علی گڈھ کی صدائے اصلی اور آوازہائے بازگشت"
جس قدر نکلی ہیں وہ بجائے خود کافی ہیں، اور ہم اس قدر مواد بہم پہنچا سکتے ہیں جس سے
افاداتِ سرسید کے تحت میں متعدد ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں، مختصر یہ کہ مواد کی کمی
نہیں ہے، نہ ایسی زبان کو نادار کہہ سکتے ہیں، جس میں تمدنِ عرب، الفاروق، اور
حیاتِ جاوید سی مبسوط تالیفات موجود ہوں،

بعضوں کو خیال ہوگا کہ "لائبریری آف اورینٹل لٹریچر" کا خیال ایک حد تک
بے وقت کی شہنائی ہے"، مگر میں اس سے متفق نہیں، ہندوستان سے ہماری قدیم
زبانیں قریب قریب رخصت ہو چکی ہیں، خود ہماری تو نہال اردو کی جان کے
لالے ہیں، ایسی حالت میں گو علوم قدیم فنا ہو جائیں جن کی ہم کو ضرورت نہیں،
تاہم لٹریچر کی بقا کا خیال ایک امر طبعی ہے، ہم یادگارِ سلف کچھ چاہتے ہیں، کم سے کم
اس مجموعۂ زرّیں سے کچھ نہ ہوگا، تاہم ہماری لائبریری کی آرائش میں اضافہ ہوگا، اسلئے کہ
بہر حال یہ خیال اتنا بے تکا نہیں ہے، جتنے ہم علمی شوق میں آج گئے گزرے
ہیں، پڑھنے لکھنے کا مذاق اگر کچھ ہے تو بالائی طور پر اور صرف ضرورۃً کچھ نوجوان ایک
وقتِ خاص تک کتابی مشغلہ رکھتے ہیں، جن کی غایت برائے نام بالغ العلوم ہونا
ہے اور کچھ نہیں، جہاں سے دراصل تعلیم کی ابجد شروع ہوتی ہے، وہ سمجھتے ہیں منزل
کا خاتمہ یہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئے پودہ میں سے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو محض
شرافتِ نفس کے لئے پڑھتا لکھتا ہو، یا کسی حیثیت سے راسخ فی العلم کا مصداق ہو،
اور ساری پھٹکار صرف اتنی بات کی ہے کہ کتب بینی باوصف ادعائے تہذیب

شرطِ زندگی نہیں ہے، جو ان سے گئے گذرے ہیں، یعنی ایک جمِ غفیر ایسا ہے کہ کتابوں کا پڑھنا اور خریدنا سرے سے لغو سمجھتا ہے، حوائجِ انسانی میں یہی ایک ضرورت ہے جو کسی کو محسوس نہ ہوئی، ایک صاحب معقول تنخواہ پاتے ہیں اور گورنمنٹ کے معتمد علیہ ہیں، پروفیسر شبلی کی ایک تالیف کے مدت سے شائق تھے، مگر عاریۃً ملتی نہیں تھی اور خریداری میں روپیہ ڈیڑھ روپیہ کا صرف تھا جو انکے خیال میں مصنف کے مقابلہ میں ان کی ایک طرح کی شکست تھی! جب کریم آف دی سوسائٹی یعنی رودار لوگوں کا یہ حال ہے تو اسی پر اوروں کو قیاس کر لیجئے، بعض خرید تو لیتے ہیں مگر پڑھتے نہیں یا استفادہ کا سلیقہ نہیں ہے، امرا سے میں نے پہلے ہی قطع نظر کر لی ہے، کیونکہ ان کے ہاں جہالت ایک طرح کا استغنا رہے ہے، چونکہ یہ حسنِ اتفاق سے ایسے ہو پڑے کہ دو وقت کی روٹیوں یعنی مفت خوریوں کی طرف سے اطمینان ہے، اس لئے علم ان کے لئے ایک بے کار سی چیز ہے، روپیہ وہ پردہ پوش ہے جس کے ہوتے تہذیبِ نفس، اکتسابِ کمال کسی چیز کی ضرورت نہیں، بہائم صفت اخلاق بجائے خود مشغول رکھنے کے لئے کافی ہیں، دماغی مشغلوں کے لئے نہ فرصت نہ صحت! رنگین طبع مسلمانوں میں عیش پرستی پہلے بھی سوسائٹی کا جزو رہی ہے جو اس کے قابل نہیں ہیں، انہیں عہد عباسی اور اموی کی پرائیوٹ صحبت آرائیوں پر ایک نظر ڈالنی چاہئے، مگر یہ علمی رنگ سے خالی نہیں ہوتی تھیں، مذاق لٹریچر ہر شخص کا خمیر تھا، اور لطف یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار تو دوسرے میں قلم ضرور ہوتا تھا،

ہمارے دیسی رئیسوں کو دیکھئے، بہت کھینچ تان کر اگر ان کو علمی رنگ میں لائیے، تو فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ سے آگے نہیں بڑھتے، یعنی اُن کے حصہ میں لے دے کر ایک طرح کی موسیقی رہ گئی ہے، جو ہندوستان کی جاہلانہ ایجاد ہے، مارشل اسپرٹ ان میں بھی ہے، مگر اس کا مصرف ان کے ہاں کچھ بھی تفصیل کے لائق نہیں! علماء اور حکماء کی جگہ صحبت میں اربابِ نشاط ہیں، اور گو انہوں نے اہلِ سیف یا اہلِ قلم ہونے کی تکلیف نہیں گوارا کی، تاہم سنتا ہوں ایک صاحب ہارمونیم نہیں، پیانو نہیں "بایاں"[1] اچھا بجاتے ہیں! میں نے بڑی مجبوری سے یہ لفظ لکھا ہے، کیونکہ اظہارِ خیال کا کوئی طریقہ نہ تھا، بہرحال کچھ تو ہندوستان کی آب و ہوا نے ان کے قویٰ اور ترکیب اعضائی کے ساتھ فیاضی نہیں کی، کچھ یہ اپنے ہاتھوں بنے بگڑے نتیجہ یہ ہے کہ قوم کے لئے جنہیں اپنی وسیع استطاعت، دماغی اوصاف اور مستثنیٰ اخلاقی تربیت کے لحاظ سے فرشتۂ رحمت ہونا چاہیئے تھا، آج وہ "شیاطین الانس" سے کچھ ہی گھٹ کر ہیں! اس لئے ہماری توقعات جیسا پہلے کہہ چکا ہوں جو کچھ ہو سکتی ہیں، وہ اس طبقہ سے جو اوسط درجہ کا ہے، اگر ان کو ہم آدمی بنا سکے یعنی علمی مذاق ان میں رچ سکے تو ہماری آیندہ حالت کی نسبت کوئی خوش آیند پیشین گوئی فلسفیانہ قرائن سے ہوگی، لیکن پہلے ہم کو دیسی طبائع کا سکون اور عدم اضطراب جو ان کے لئے فطرتِ ثانی ہو رہا ہے، آئے دن کی چھیڑ چھاڑ یعنی علمی تحریک سے دور کرنا ہے جس میں افادات سرسید

---

[1] طبلے کا اصطلاحی نام،

کی کثرت سے اشاعت اور میری خیالی لائبریری کا وجود سب کچھ آگیا، انگریزوں نے
پچھلی صدی میں یعنی گذشتہ سال انسائکلوپیڈیا برٹانیکا ۲۵ ضخیم جلدوں میں شائع
کی جو واقفیتِ عامہ کی حیثیت سے ایک جامع و مانع تالیف ہے، اس کی اشاعت
میں کم و بیش تیس۳۰ لاکھ روپیہ صرف ہوئے، حال میں "لائبریری آف فیمس لٹریچر"
چھپ کر نکلی جس کا اہتمام بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ لاکھوں روپے صرف ہوئے
ہوں گے، ایک طرف یہ ہوتے ہیں، دوسری طرف ایک ساکن غیر متحرک اور
مائل بہ تنزل قوم کو بہ تقاضائے وقت زمانہ کی ترقیات سے ہم سطح کرنا ہے جس میں
نہ قومیت ہے، نہ لٹریچر، نہ کوئی قومی آئیڈیل جس کے ذریعہ سے کسی کوشش پر میلان
قومی یا کسی مقصد کے حصول کے لئے اجماعِ عام ممکن ہو، تاہم کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے،
اور چونکہ سوچنے والے ہمیشہ کام کرنے والے نہیں ہوتے، میں صرف اس پر قناعت
کرنا چاہتا ہوں کہ یورپ کی دیکھا دیکھی ایک نئی اور مہتم بالشان تجویز اپنی طرف سے
پیش کر دی، اس کی تکمیل یعنی جو چیز ابھی بالقوۃ ہے اُسے فعل میں لانا، اس کے اسباب
اور وسائل پر غور کرنا ان اکابرِ قوم کا فرضِ اخلاقی ہے جو مجھ سے بہتر ضروریات قومی
کو سمجھتے بوجھتے ہیں، قبل اس کے کہ اس اسکیم میں کامیابی ہو اور اسی قسم کا کوئی واقعہ
علمی وجود میں آئے، کارلائل کا قول سن رکھئے کہ "فرضِ انسانی میں سب سے زیادہ
اہم یہ ہے کہ ہر شخص اپنی لائبریری بنائے خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو" اس کا خیال
ہے "کتاب دماغ کے لئے ایسی ضروری ہے جیسے جسم کے لئے غذا" شکسپیئر
اور اونچا گیا ہے اور کہتا ہے "دنیا میں کوئی تاریکی نہیں ہے مگر جہالت" ان اقوال

کی بنا پر اور نیز اس سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے اس کے لحاظ سے میں امید کروں گا، قوم کے اکثر نوجوان جو میرے مخاطبِ صحیح ہیں اس خیال کو پیشِ نظر رکھیں گے کہ ان کی ساری عظمت صرف ان کے ذاتی منتخب کتب خانہ میں ہے،

آئیے! مادی دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے میں آپ کو غیر فانیوں میں لئے چلتا ہوں، آپ کی لائبریری جہاں بیٹھ کر آپ ایک ہی وقت میں تمام اطرافِ عالم میں ہو سکتے ہیں، دنیا کی سچی بہشت یا باغِ عدن ہے جہاں کے پھل اس رسوائی کے باعث نہیں ہوں گے جو ہمارے سب سے پہلے والدین کی طرف منسوب کی جاتی ہے، میں ایسے لوگوں سے آپ کو مصافحہ کرتے دیکھتا ہوں جنہوں نے دنیا میں انقلاباتِ عظیم پیدا کر دیئے اور گو ان کے ہاتھوں نے کبھی تلوار سے کام نہیں لیا، تاہم ان کی فتوحات جہاں تک عقلی اور دماغی سیاست کا تعلق ہے حریفوں، یعنی اہلِ سیف سے پیچھے نہیں ہیں، بڑے بڑے فلاسفر، بڑے بڑے علماء اور ریفارمر جو اپنے اپنے دور میں بہت سستے نہیں تھے، آج وہ صف بستہ آپ کے سامنے ہیں، اور آپ کی جنبشِ چشم کے تابع، تاریخ بتائے گی کہ یہ کاغذی سرمایہ ان بزرگوں کی عمروں کی کمائی ہے، زمانہ نے گو ان کی ہڈیاں خاک کر دیں، مگر ان کے جوہر یعنی اجزائے غیر فانی کو مٹا نہ سکا، اور یہی ان لوگوں کی حقیقی زندگی ہے جس کی نسبت بے تکلف دعوی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کائنات میں اضمحلالِ طبعی واقع نہ ہو،

اچھا! یہ سہل الحصول روحیں جنہیں اس وقت میں آپ کے زمرۂ مصاحبین میں دیکھتا ہوں آپ سے کیا چاہتی ہیں؟ کچھ نہیں سوا اس کے کہ ان کی خاموش ہدایتوں کو اپنا رہنما

اور مقدمہ زندگی بنائیے اور یاد رکھئے کہ گو دنیا میں معیار فوقیت ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، مگر موجودہ دنیا جو ترقی کی حیثیت سے عالم شباب میں ہے اور جس کے ثمر پیش رس آج کل کی عقلی ایجادات اور دماغی انکشافات ہیں، صرف ان لوگوں کی بقا کی حامی ہے، جو علمی حیثیت سے امتیاز رکھتے ہوں، فرشتہ ہونے کا وقت نہیں رہا، یہ منصب ان لوگوں کا تھا جن کے زبردست تخیلات عالم غیر مادی سے مناسبت رکھتے تھے، ہم کو انسان ہونا ہے مگر کامل یا قریب قریب کامل، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ زندگی کی کشمکش اور ضروری مشاغل کے ساتھ بھی ہم اتنے رہ جائیں کہ کتب بینی ہمارے لئے مشغلۂ عیش ہو، جو دنیا میں سب سے بڑی اور اختیاری خوشی ہے"

(البشیر ۱۹۰۲ء)

ترکوں کی معاشرت

اُردو لٹریچر دُنیا کی اور مہذب زبانوں کے مقابلہ میں اس قدر کم مایہ ہے کہ سالانہ
اشاعت کی تعداد اتنی بھی نہیں ہوتی جو انگلیوں پر گنی جا سکے، ملک کے زبردست
اہلِ قلم باستثنا علامہ شبلی آج کل قریب قریب سب گویا ریٹایرڈ لسٹ پر ہیں،
یعنی ان لوگوں کو جو کچھ کہنا سُننا تھا ایک زمانہ میں کہہ سُن چکے، اور اب جدھر دیکھئے
خاموشی ہی خاموشی ہے، اس عام ناداری میں کبھی اچھی کتاب کوئی ہاتھ آجائے
تو غنیمت معلوم ہوتی ہے، اس وقت میں مترجم ہاجرہ کی ایک جدید تالیف کی
تقریب کرنا چاہتا ہوں جو اس تحریر کا عنوان ہے، لیکن نفسِ مطلب سے پہلے
اسی سلسلہ میں کچھ اور کہنا ہے،

آجکل ہمارے لئے اس سے زیادہ دلچسپ مشغلہ کوئی نہیں ہے کہ ہم اس بات
کا پتہ لگائیں کہ اور اسلامی ممالک میں جہاں مغربی اثر ترقی کر رہا ہے، خصائص مشرقی
کے ساتھ تمدن اور معاشرت کی کیا حالت ہے، یعنی یورپ کے دماغی اور اخلاقی
تصرفات سے اور جگہ مسلمان کتنے بنے بگڑے؟ ہم کہاں ہیں؟ یہ معلوم ہے کہ مصر و
ٹرکی ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ حالت میں ہیں، اس لئے اُن تغیرات کی اگر ہم کو وہ

لگا سکے جو بتدریج وہاں پیش آرہے ہیں، تو ہم کو سلسلہ کی درمیانی کڑیاں مل جائینگی اور ہم اندازہ کر سکیں گے کہ بلحاظ خصائص مشترک ہم میں کہاں تک صلاحیت ہے کہ دنیا کی شائستہ اور متمدن اقوام سے آیندہ کبھی ہم سطح ہو سکیں، اس طرح ہم رفتہ رفتہ تمدن کے وسیع حدود میں پیش قدمی کے لائق ہو سکیں گے اور وہ حد فاصل کم ہوتی جائے گی جو مشرق و مغرب میں سر دست حائل ہے،

(مصر و ٹرکی کے متعلق ہمارے وسائل واقفیت وہ تصنیفات ہیں جو انگریزی میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں، مختلف موضوع پر لکھنے والوں کے قلم اُٹھتے رہتے ہیں، لیکن ٹرکش لائف اور اس کے متعلقات میں کچھ ایسی دلچسپی ہے کہ عموماً مصنّف کی کوشش ہوتی ہے کہ معاشرت کے تمام اجزا تحلیل کر کے علیحدہ علیحدہ دکھا دیئے جائیں، خاصکر ٹرکش حرم ایک طلسم سربستہ ہے جس کی عقدہ کشائی کیلئے کم سے کم یونانیوں کی سی لطافتِ خیال اور مذاقِ حسن کی ضرورت ہے، مغربی طرزِ تحریر اور ادائے خیال کے ساتھ خاص حسنِ ترتیب بجائے خود ایک چیز ہے، اس پر بڑھائیے جزئیات کی ضروری تفصیل جو معاشرت کی جان ہے، اور جن پر بسبب کثرتِ مساوات خود اہل ملک کی نگاہ نہیں پڑتی، تاہم چونکہ ٹرکی کے ساتھ یورپ کے سیاسی تعلقات اچھے نہیں ہیں، میں نہیں جانتا بحیثیت مجموعی کوئی ایسی تصنیف موجود ہے جو ٹرکش سوسائٹی اور اس کے نظاماتِ زندگی کے متعلق مخلصانہ اظہارِ خیال کے ساتھ ہماری توقعات پوری کر سکتی ہو،)

(افسوس ہے کہ کسی ترک نے کوئی جامع اور مبسوط کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی،

ورنہ غیروں کا دستِ نگر نہ ہونا پڑتا، ہندوستان کا مشہور اور فاضل مؤرخ بھی ہم کو
اس حیثیت سے بے نیاز نہ کرسکا، سفرنامۂ ٹرکی میں وہ امور نہیں دکھلائے گئے جن کو
وہ خود متقدمین کی تالیفات میں ڈھونڈتا ہے، گویا اس کی مؤرخانہ عظمت کی تکمیل کے
لئے ہندوستان سے باہر کالے کوسوں محض سفر قسطنطنیہ کا انتساب کافی تھا، یہ
فروگذاشت ایک لٹریری نقصان ہے جس کی تلافی اب نہیں ہوسکتی، لیکن میں خوش
ہوں کہ حال میں ڈائری آف ٹرک شائع ہوئی ہے جس کو ایک ترک کی سرگذشت
کہنا زیادہ ترموزوں ہے، خلیل خالد (ٹرکی رسم خط کے مطابق "خ" کا نقطہ اڑا دیجئے)
جو نوجوان ٹرکش پارٹی کا ایک ممبر ہے، یہ کتاب اس کے حوادث زندگی یعنی وقائع
عمری کے چند صفحے ہیں، جس میں معاشری اور سیاسی اہم مسائل بھی آگئے
ہیں، یہ کتاب جس کا قالب شملہ میں بدلا گیا ہے، خلیل خالد نے ارضِ آزاد
یعنی لندن میں بیٹھ کر لکھی ہے، اور چونکہ وہ گھر کا بھیدی ہے، اس نے کوئی
کمزور رگ چھوڑی نہیں ہے، ٹرکی کا موجودہ انحطاط اس کے خیال میں شخصی
حکومت کے غیر معتدل اقتدار کی وجہ سے ہے جو آجکل کے شایستہ اصولِ
حکمرانی کے لحاظ سے ایک سیاسی گناہ ہے، جس ملک میں رعایا کوئی آواز نہ رکھتی ہو،
جہاں جائز آزادی اور بغاوت مرادف سے الفاظ ہوں، جہاں ہر جدید پیش قدمی
جابرانہ سیاست کی آہنی گرفت سے باہر نہ ہو، یقینی وہ وطنیت اور قومیت کے دلدادہ
نوجوانوں کے اعتراضات کی زد سے علیحدہ نہیں رہ سکتا، خالد نے نہایت دریدہ دہنی
سے سلطان پر نہیں بلکہ ان کی پالیسی پر مختلف پہلوؤں سے حملہ کیا ہے، اور یہی

حیثیت ہے جو اس مختصر کتاب میں نہایت اجاگر معلوم ہوتی ہے،

بہر حال خالد کم سے کم ایک معتبر نائی ہے، جس نے گھر کا کچا چٹھا کہہ سُنایا ہے، اور ہم کو لائق مترجم کا ممنون ہونا چاہیے کہ ٹرکش لائف کے متعلق یہ دُوسری کتاب ہے جو ان کے قلم کے سایہ میں موزونیت کے ساتھ شائع ہوئی، جس طرح میں نفسِ مضامین کی غیر ضروری تفصیل سے اس مضمون کو بڑھانا نہیں چاہتا، میرا خیال ہے کہ ترجمہ کے متعلق بھی مجھے کچھ کہنا نہیں ہے، لائق مترجم کا نام خود ایک کافی ضمانت ہے، وہ اپنے فن کے اسپشلسٹ ہیں، اور سچ یہ ہے کہ جس لطافت اور برجستگی کیساتھ یہ زبان کا قالب بدل دیتے ہیں، ان ہی کا حصّہ ہے، ترجمہ شستگی اور روانی خیال کے ساتھ اتنا تو ہو کہ مستقل کتاب کا دھوکا ہو اور اصلی تصنیف کا خیال تک نہ آئے، یہ بات ان کے سوا اور کہاں! ایک وصف اضافی اور بھی ہے کہ یہ اپنی کتابوں کو بگڑنے نہیں دیتے، یعنی چھپائی وغیرہ ٹکسالی اور قیمت نسبتۃً کچھ نہیں، مَیں سمجھتا ہوں مترجم کی حوصلہ افزائی کے لئے کم سے کم اس کی دَردسری کا عملی اعتراف یہ ہے کہ ایک جلد اس کی ہر تعلیم یافتہ شخص کے پاس ہونی چاہیے، مصنفین کے ساتھ اس حیثیت سے بے پروائی یا عدم توجہی ایک طرح کی خیانت ہے جو آجکل کے علمی دَور میں بہت ہی ناموزون ہے، ایک طریقہ اور ہے یعنی عاریۃً لے کر دیکھنا، لیکن مس کاریلی جو انگلستان کی موجودہ انشا پردازوں کی صفِ اوّل میں ہے، اسے معیوب بتاتی ہے، مستعار کتابوں کا پڑھنا اس کے خیال میں ایسا ہی ہے جیسا دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کا منہ میں پھیرنا، جو ذرا مکروہ سا ہے، نفاست

چاہتی ہے "دوشیزہ کاغذی" دستِ غیر کی مس کردہ نہ ہو، یعنی اچھوتی اور نئی نویلی ہو،

اسی سلسلہ میں مجھے لائق مترجم سے کچھ کہنا ہے، ترجمہ میں جا بجا تصرفات کئے گئے ہیں، بلکہ میں کہنا چاہتا تھا، مختلف مقامات پر بعض حصے چھوڑ دیئے گئے ہیں، حالانکہ اصلی کتاب جس اسپرٹ میں لکھی گئی ہے اس کا اقتضا طبعی یہ تھا کہ ترجمہ میں ایک حرف متروک نہ ہوتا، سلطان المعظم کی نسبت ہمارا ذاتی میلان طبع کچھ ہی ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عظمت و عقیدت واقعات کو بدل نہیں سکتے، جن مقامات کو مترجم نے نظر انداز کیا ہے بعض جگہ وہی بیان واقعہ کی جان تھے، مثلاً خالد کا ایک واقعہ لیجئے، وہ ایک موقع پر یورپین احباب کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالہ ہے، میز پر والا یتی گوشت (خنزیر) اور شراب دونوں موجود ہیں، وہ شوخی سے کہتا ہے مجھ کو والایتی گوشت سے طبعاً نفرت تھی جس کا نظارہ ہی میری اشتہا کے زائل کرنے کے لئے کافی تھا، اور گو دونوں چیزیں ایک ساں ممنوع ہیں، تاہم میں نہیں کہہ سکتا پچھلی چیز یعنی شراب سے کہاں تک محترز رہ سکا! لائق مترجم اس پچھلے حصہ کو پی گئے، آخر خالد میں اس قدر سنجیدگی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی، جو نفس واقعہ کے خلاف معلوم ہوتی ہے، بہرحال میں رعایت کے ساتھ بھی اس قسم کے متروکات کو جائز نہیں سمجھتا (صرف اس لئے نہیں کہ واقعہ نگاری کی حیثیت بدل گئی، بلکہ ساری کتاب پھیکی پڑ گئی اور ذائقہ اصلی کچھ سے کچھ ہو گیا جس کا افسوس ہے)

اب دیباچہ پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں، جو بجائے خود ایک مستقل چیز ہے، اور جس سے لائق مترجم کچھ آگے بڑھ کر زمرۂ مصنفین کی حدود میں داخل ہوتے ہیں،

لیکن دیباچہ کو نسبتہً اتنا ہی ہونا چاہئے جیسے کھانے میں نمک، سیکڑوں صفحے اُلٹنے کے بعد بھی اصل کتاب کا پتہ نہیں چلتا جس سے جی اُکتا جاتا ہے، مَیں اس وقت اس سے تعرض کرنا نہیں چاہتا کہ پردہ کی بحث، ڈائری آف اے ٹرک کے ساتھ کہاں تک خارج از موضوع، یعنی گول خانہ میں چوکھٹی چیز ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے یہ مدت سے بھرے بیٹھے تھے، جدید اشاعت اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہوگئی لیکن یہ ممکن تھا کہ یہ حصہ ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں شامل کر دیا جاتا، آیندہ ایڈیشنز میں اس کا موقع باقی رہتا ہے،

رہی پردہ کی بحث، جہاں تک لائق لکھنے والے نے دادِ تحقیق دی ہے، وہ اس حیثیت سے لائقِ اعتراف ہے کہ ایک خاص بحث کے متعلق اس قدر مواد ایک جگہ فراہم کر دیا گیا، اصل مسئلہ وہ تنکے کی اوٹ پہاڑ ہے، مَیں نہیں جانتا کوئی دو ٹکڑے بات کہہ سکوں گا، مَیں ان طالب علمانہ کج بحثیوں سے واقف ہوں، جو پردہ کی حمایت یا مخالفت میں ہوتی رہتی ہیں، حال میں جوازِ پردہ کے سلسلہ میں ایک عالمانہ تاریخی مضمون نکلا جس سے قریب قریب نوجوانوں کے دل بیٹھ گئے، جن کا پردۂ مروجہ کی نسبت خیال تھا کہ منجملہ اور بیوقوفیوں کے ایک یہ بھی ہے، اور اس لغویت کا سلسلہ آگے (یعنی تاریخ گذشتہ میں) نہیں چل سکتا ہے، اسی مضمون میں سید امیر علی پر بھی لے دے ہوئی ہے جو نوجوانوں کا پیشوائے علمی ہو یا نہ ہو، تاہم یورپ میں وہ اسلامی دنیا کا ایک مستند فلسفی مؤرخ سمجھا جاتا ہے، جو صرف مؤلف یعنی جامعِ واقعات ہی نہیں ہے بلکہ طبائعِ عالم کا نباض ہے، اس نے

اپنی تالیفات میں ہر جگہ اپنا یہ درجہ قائم رکھا ہے،

نائینٹینتھ سنچری میں اس نے زنانِ اسلام پر جو جامع اور بے نظیر آرٹکل لکھا تھا، وہ جب تک انگلش لٹریچر دنیا میں باقی ہے، اس کی غیر فانی یادگار رہیگا، بہرحال سید امیر علی کی غائبانہ پردہ دری کے ساتھ چونکہ ضمناً نوجوان تعلیم یافتہ بھی مخاطب ہیں، اسلئے نہایت ادب کے ساتھ جواباً صرف یہ عرض کیا جا سکتا ہے،

ترا گاہے گریبانے نہ شد چاک
چہ دانی لذّتِ دیوانگی را

جن صاحبوں کو اس پامال مسئلہ میں دردسری پسند ہے ان کو نیک نیتی کے ساتھ یہ صلاح دی جا سکتی ہے کہ وہ مصر کے ایک روشن ضمیر فاضل کی تصنیفات "تحریر المرأۃ" اور "مرأۃ الجدید" کو پیشِ نظر رکھیں، جس میں ہر پہلو سے یہ بحث طے کر دی گئی ہے،

بہتیرے ایسے بھی ہوں گے جو اس قسم کے مسائل کو صرف مذہبی رخ سے دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے افعال کے محرکات اس زمانہ میں کچھ اور ہیں،

انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے عالم کے خیال کے مطابق مذہب کے دو حصے ہو سکتے ہیں، اعتقادی اور عملی، عملیات کا زیادہ تر حصہ صرف مختص المقام سوسائٹی اور اس کی لوکل ضروریات ہوا کرتی ہیں اور "پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند" کی حیثیت سے ہے کہ ہم کسی مذہب کے عملی احکام میں اتنی جامعیت اور وسعت تسلیم کریں کہ وہ باوصفِ اختلافِ حالات، اختلافِ طبائع، اختلافِ اسبابِ خارجی، صدیوں کے تغیرات کے بعد بھی تمام ضروریاتِ انسانی کا کفیل ہو، وہ آئین وضوابط جو ایک حشی یا

نیم مہذب سوسائیٹی کی فی الوقت اصلاح کیلئے ہوں، ایک متمدن اور شائستہ قوم کے لیے "وضع الشئی فی غیر محلہ" سے بھی زیادہ گئے گذرے ہیں، بہرحال یہ ایک فلسفی کی جو طبائع کائنات کا راز دار ہے، ایک آزادانہ رائے ہے، مگر ایسی رائے ہے جو سرسری طور سے ٹالنے کے لائق نہیں ہے،

روشن خیال علمائے اسلام کا خیال ہے کہ شرائع ضروریاتِ انسانی کے تابع ہیں جس طرح ضروریاتِ انسانی بدلتی رہتی ہیں، شرائع میں بھی ریٹ کے سے تمدد یعنی گھٹنے بڑھنے کی خاصیت موجود ہے کیونکہ اسلام اصولاً ایک ایسا مذہب ہے جو اول اُن لوگوں کی دماغی قابلیت اور گرد و پیش کے حالات کے مطابق ہولیتا ہے جو اسے قبول کرتے ہیں، اور بعد میں ان کی دماغی اور اخلاقی سطح کو بلند کرتا ہے، یعنی اسلام ایک ترقی پذیر مذہب ہے اور ایک بڑی حد تک مسلمانوں کی ناکامیوں کا سراغ اگر مل سکتا ہے تو اسی اصول کے نظر انداز کرنے میں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ دماغی تحریک اور تمدنی ترقی کا اثر سچے مذہب کے رُوحانی اور اخلاقی حصہ پر کچھ نہیں ہوتا، اور ہر مقدس مذہب میں بجائے اس کے کہ وہ خود علم میں تحلیل ہو جائے ہر قسم کے علم و تہذیب کے جذب کرنے کی قابلیت ہوتی ہے، کچھ شک نہیں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ خیال ایک کافی حد تک صحیح ہے، لیکن یہ کھینچا تانی صرف ایک طرح کی ان سمجھوتی ہے،

مسلمانوں کے عام تنزل کے اسباب پر بہت بحث ہو چکی ہے، بہت سے لکچر دیئے گئے، رسالے شایع ہوئے، مگر اصلی بات تک کے منہ سے نہیں نکلتی کوئی صفا فرماتے بھی ہیں تو دبی زبان سے تاکہ ان کی مقبولیت میں فرق نہ آئے،

اس لئے صاف صاف سُن لیجئے کہ تمدنی امور میں سرے سے مذہب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، ہمارے افعال کو صرف حیثیت افادی اور فوائد اخلاقی کا تابع ہونا چاہیئے، یہی اصولِ موضوعہ آج شائستہ اور مہذب دنیا کی ترقیات کا عنوان ہے، ایک کام کو اس لئے کیجئے کہ اس میں بمقابلہ ضرر کے فوائد کے پہلو زیادہ ہیں، اور یہ کہ فی نفسہٖ وہ اچھا ہے، اور چونکہ ہر فعل خود اپنی مکافات ہے میں نہیں جانتا اخلاقی منظوری کے سوا کسی اور منظوری کی ضرورت ہے، یہی حیثیت افادی ہے جس کا مذاق یورپ میں رچ گیا ہے اور قریب قریب ان کا خمیر ہو رہا ہے جو انکی ترقی اور آزادی کی رُوح ہے، اگر آج وہ ہماری طرح مذہبی گرداب میں پھنسے ہوتے تو وہ تغیرات جو ترقی انسانی کے اجزائے عناصر ہیں سرے سے وجود میں نہ آتے،

یونانیوں کا تخیل صرف تکمیلِ انسانیت تھا یعنی وہ ہستی موجودہ سے آگے نہیں جاتے تھے، ان کے خیال میں قوائے فطری کی کامل نشو و نما اور انکا معتدل استعمال بس یہی غایت زندگی تھی، یہی خیال شاگردانہ حیثیت سے یورپ نے حاصل کیا، یورپ کا موجودہ تمدن اسی خیال کا نتیجہ ہے، برخلاف اس کے ہم آج تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہماری ہستی گہوارے سے شروع ہوتی ہے اور ہستیِ موجودہ یقینی قبر سے پہلے ختم ہو جائے گی، ایک حرف غلط ہے، ترقی کا افتتاح آغوشِ لحد میں پہنچ کر ہوگا، میں نہیں جانتا ان خیالات کے ساتھ کوئی قوم دنیا میں کہاں تک متمدن اقوام کی ہمسطح ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے،

خیام کا فلسفۂ زندگی آج کل کی شائستگی سے ملتا جلتا ہے جس نے شوخی سے فلسفہ کے

اُدھار پر ترجیح دی ہے، یعنی ہستی موجودہ کی تحقیر نہیں کرتا جو تبدیلِ ہیئت یعنی موت
سے پہلے اپنی تکمیل چاہتی ہے، یہی تکمیل ہمارے تمدنی مسائل کے فیصلہ کا عنوان
ہونا چاہیئے، جن میں سے ایک عورتوں کا پردہ ہے، یہ ایک نہایت قدیم رسم ہے جو
مختلف اقوام و ملل میں وقتاً فوقتاً رہی ہے جس کو اسلام کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں،
تمدن کے ابتدائی دور میں عورت کی حالت غلامی کی حالت سے کچھ اچھی نہ تھی،
رومیوں اور یونانیوں کے حالات پڑھیئے، جاہلیتِ عرب کی رسموں کا پتہ لگائیے تو
آپ کو معلوم ہوگا کہ ایشیا کی بعض قوموں میں عورت کا شوہر کی وفات کے بعد
زندہ رہنا ہی سرے سے غیر ضروری سمجھا جاتا تھا، یورپ کا اس حیثیت سے ذکر ہی
نہ آئے تو اچھا ہے،

بہرحال ہر زمانہ میں عورت ایک اضافی اور ضمنی شے سمجھی گئی جو محض حصولِ تلذذ
کے لیئے مردوں کے نفسانی جذبات کا تختۂ مشق بنتی رہی، تاریخ سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں
نے اپنی ترقی کے دور میں ایک حد تک عورت کو آزادی اور تمدنی اور قانونی حقوق عطا
کیئے، لیکن جب اس کے اچھے دن تھے تب بھی وہ اپنے آقا کا ایک ضمیمہ یعنی زیادہ سے
زیادہ کنیز تھی، کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی تھی، یہی خیال وراثتِ طبعی کی حیثیت
سے کسی نہ کسی پیرایہ میں آج تک چلا آتا ہے، اگر ہم اس خیال کی تحلیل کریں تو معلوم
ہوگا کہ پردۂ مروجہ اسی تنگ خیالی کا ایک ثمرہ ہے جو صدیوں سے عورت کی آزادی
کے خلاف ہماری فطرت کا ایک جزو ہو گئی ہے، عورت و مرد کی جسمانی ساخت
بتا رہی ہے کہ اعضاء، حواس، عقل و فکر، جذبات و خیالات اور ان تمام امور کے لحاظ

سے جو انسانیت کے اجزائے ترکیبی ہیں، دونوں میں کوئی فرق نہیں، پھر یہ غیر ضروری تفریق ہماری وحشیانہ قدامت پسندی کے سوا اور کیا معنی رکھتی ہے۔

آج کل زمانہ تزاحم فی الحیات کے سلسلہ میں جکڑا ہوا ہے، یعنی کوئی قوم دنیا میں باقی نہیں رہ سکتی ہے، جب تک وہ بمقابلہ اور اقوام عالم کی ترقی کی دوڑ میں پیش پیش نہ ہو، اور ترقی کی بنیاد صرف عقل پر ہے، یعنی انسان کی ترقی کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی عقلی قوتوں کو وسعت دی جائے، کیونکہ یہی قوتیں تمام انسانی امور پر مسلط ہیں، یہ مسلّم ہے کہ عقلی تو سیع صرف علمی اختراعات و انکشافات پہ منحصر ہے اور آیندہ صدیوں میں کسی ایسی ترقی کی امید نہیں کی جا سکتی جو ایجادات عقلی کے سوا کسی دوسرے عوامل و مؤثرات پر منحصر ہو، غرض ترقی کے اصلی اسباب صرف عقل یا اس کے متعلقات میں مل سکتے ہیں جس کیلئے ہم کو سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ مردوں سے پہلو بہ پہلو عورتوں کی طبعی، اخلاقی اور دماغی قوتوں کو کامل نشوونما اور تحریک دی جائے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ گرفتاران قفس یعنی عورتیں پردہ کی اوٹ سے باہر نہ آئیں۔

موجودہ مغربی تمدن ایک سائنس ہے، وہ اپنا قدرتی نصاب اپنے ساتھ رکھتا ہے اور میرے آپ کے خاص طرح کے مجموعۂ خیالات کا تابع نہیں ہے، ہم کو عارفان طبقات الارض نے بتایا ہے کہ انسانی زندگی کی ابتدائی تاریخ کہاں سے شروع ہوئی اور کس طرح اوائل میں وہ بلحاظ سلسلۂ آفرینش صرف جماد، پھر نبات، پھر حیوان تھا، یہاں تک کہ طبقۂ اسفل کی مخلوقات بڑھتے بڑھتے اور ترقی کرتے

کرتے صدیوں کے انقلابات اور متواتر تغیراتِ ارتقائی کے بعد انسان تک پہنچی،
غرض یہ امر پیشِ نظر رکھنے کے بعد کہ (انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے) میں
نہیں جانتا (اختلافِ جنس کے سوا مرد و عورت میں کوئی تفریق ممکن ہے، عورت
مرد کی طرح فطرۃً ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور وہ اپنے افعال و جوارح میں اتنی
ہی آزاد ہے، جس قدر اس کا فردِ مقابل، اس لئے انسانی پیداوار کے "نصف بہتر
حصہ" کی روپوشی یعنی ناک کان چھید کر، گھر کی چار دیواری میں نظر بند رکھنا ایک
طرح کا غیر ضروری تعطل اور واضعِ آئینِ فطرت کی غایتِ اصلی کے لحاظ سے بالکل
غیر طبعی امر ہے، جن لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری عورتیں اپنے فیصلۂ قسمت یعنی
دائم الحبس رہنے پر راضی ہیں اُن کو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ رضا اگر ہو، ایسی ہی ہوگی،
جس طرح پرشکستہ طائرِ قفس اپنی محدود وسعت پہ قانع ہوتا ہے، جن کو اصرار ہو وہ
کم سے کم ایک ہفتہ میری خاطر سے پردہ میں بیٹھ کر دیکھ لیں، ناک کان کی حفاظت
میرا ذمہ، تجربہ بتائے گا کہ یہ حالت خلقۃً فردِ انسانی کے دونوں اجزاء کے لئے
یکے جوڑ سی ہے، گو صدیوں کی مشق و مساوات سے ایک کے لئے عادتِ مستمرہ
ہو رہی ہو، مختصر یہ کہ بیسویں صدی کے تمدن کی طرف سے یہ امر بلا خوفِ تردید
پیش کیا جا سکتا ہے کہ صنفِ نازک کا چہرہ اور ہاتھ "سترِ عورت" نہیں ہے اور
اس لئے قطعاً چھپانے کی چیز نہیں۔

ہر قوم کے لئے ہر زمانہ میں اس کی عقلی حالت کے مناسب خاص خاص اخلاق و
عادات ہوتے ہیں جو ملکی آب و ہوا، باہمی میل جول، مذہبی عقائد، نظریہ خیالات،

علمی اختراعات اور سیاسی نظامات کے تحت میں آہستہ آہستہ اور بتدریج بدلتے رہتے ہیں، اور جس قدر قوم کی عقل ترقی کی طرف حرکت کرتی ہے اسی قدر اخلاق و عادات پر اس کا اثر پڑتا ہے، موجودہ زمانہ ارتقائے عقلی کا دور ہے، صدیوں کے زنگ ایک دم نہ سہی رفتہ رفتہ چھوٹیں گے، اور جن مسائل پر مجتہدانہ آج دو شخص بھی متحد الخیال نہیں ہو سکتے، یہی کسی زمانہ میں ہماری آیندہ ترقی کے موضوعات ابتدائی ہونگے،

افسوس ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں گوری چٹی عذرا، اور زہرا کی جگہ سانولی کریمن اور نصیبن پیدا ہونے لگیں، ان کے بھی ناک، کان محفوظ نہیں، صد یاں گذر گئیں کرتی اور پیشے کا جوڑ نہ مل سکا! (دوسری اصلاحوں کی کہاں تک اُمید ہو سکتی ہے، سچ یہ ہے کہ رواجی پردہ ایک طرح کی عیب پوشی ہے) یہاں تو بیچاری بیبیاں چادر کی جگہ دوہرے کنڈوں پہنی ڈولیوں میں چڑھی پھرتی ہیں، جن ممالک میں گھر سے باہر زمین پر پاؤں رکھنے کا رواج ہے وہاں بھی ایک طرح کی کفنیاں یعنی برقعے استعمال ہوتے ہیں، لیڈیاں تھیلوں میں! یہ ہماری موجودہ تہذیب کا خاکہ ہے جس پر ہم کو ناز ہے اور اصرار ہے کہ گویا ہم سے خالص مغربیت کی کوئی ادا چھوٹنے نہ پائے، تاہم عورتیں اسی بسیط اور ابتدائی حالت میں ہیں جو ایام جاہلیت سے پہلے تھی، ساری تہذیب حرم سرا کے باہر ختم ہو جاتی ہے، اور بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ بھی عورتوں کے نظاماتِ زندگی کو سرے سے مس کرنا نہیں چاہتا۔

لیکن میں خوش ہوں کہ مصر و ترکی میں جو تغیرات پیش آ رہے ہیں وہ بہت ہی اُمید افزا ہیں، خوفناک برقعوں کی جگہ "فرجیہ" (ایک مناسب الاعضاء اوورکوٹ) اور

"یشمک" (نقاب) کو ملتی جاتی ہے، ایک وقت آئے گا کہ نازنینانِ حرم یعنی
سرکیشیا کی پریوں کے خوبصورت چہروں کے لئے صرف ہلکی سی نقاب کافی ہوگی(
یہ تو خیر ایک فقرہ معترضہ تھا، مگر اسے طے شدہ سمجھئے کہ ہم کو اپنی آیندہ نسل کی ترقی
کے لئے یہ کرنا ہے کہ جن گہواروں میں ان کی ابتدائی نشو و نما ہو وہ نمونۂ شائستگی اور
دماغی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ہر طرح کے فنونِ لطیفہ سے آراستہ و پیراستہ ہوں
اور یہ قطعاً ممکن نہیں جب تک موجودہ گھونگھٹ کو خیرباد نہ کہا جائے، عورتوں کی
آزادی کے خلاف جو شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں ان میں آزادی کا جو قبح تقسیم
اچھی چیز ہے ہمیشہ غلط استعمال ہوا ہوگا، اس کی روک تھام کرنی ہوگی، بے شک!
یہ ایک دن کا کام نہیں، نہ یہ منظور ہے کہ کل کا ہوتا آج ہی سب کچھ ہو جائے
مگر اصولاً ہم کو ایک بات طے کر لینی چاہئے،

زمانہ بہت آگے نکل آیا ہے، یہ مسائل ایک طرف اب حجروں میں بیٹھ کر طے
نہیں ہو سکتے، فضائے عالم میں نکلئے، نظامِ کائنات اور طبائعِ موجودات کا مطالعہ
کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان کی عام تاریخ کا رُخ بدلا ہوا ہے، اور گو ابھی وہ
مرکز دریافت نہیں ہوا جس کے گرد مسلسل اور باترتیب واقعات حلقہ زن ہوتے
ہیں، تاہم کوئی غایتِ اصلی ہے جس طرف حوادثِ انسانی افتاں و خیزاں جا رہے
ہیں، گذشتہ دنیا کی کایا پلٹ ہو گئی ہے، آئے دن کے تغیرات نے نظاماتِ زندگی
کو درہم برہم کر رکھا ہے، اس لئے وقت کا فتویٰ بھی کچھ اور ہے،
(آج جاپان کی ترقی کی کیا حالت ہوگی، اگر ہندوستان سے رواجی پردہ کا

سبق لے کر اپنے ملک میں گھر گھر نافذ کرے، یعنی یہاں کے ثقہ اور سنجیدہ اہل الرائے کے خیال کے مطابق جاپانی بیڈیاں بھی وسنانہ کی طرح چھپنے والی محرم میں کس کسا کر دہرائے ہوئے آنچل میں کچھ غائب کرتی اور سر سے پاؤں تک زیوروں سے لدی چھما چھم کرتی ہوئی گھروں میں بیٹھ جائیں! بے شک ایک نیا دور شروع ہو جائے گا، لیکن بنی بنائی قوم اور اس کی حاصل کردہ ترقیات کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، کہا جاتا ہے، پس پردہ سب کچھ ممکن ہے، ڈولیوں کے ذریعہ سے فلسفہ عالیہ سکھاؤ

این خیال ست ومحال ست وجنون!

افسوس ہے کہ ایک ضمنی بحث مجھے کہاں سے کہاں لے گئی، اس بے تکے پن میں یاد نہیں رہا، میں نے لائق مترجم کو کہاں چھوڑا تھا، ترکوں کی معاشرت ایک نہایت وسیع عنوان ہے، یورپ کی تصنیفات تو غالباً ایک ایک کر کے صاحب تبصرہ کے پیش نظر ہوں گی، جن میں سے ایک امریکن لیڈی کی جدید تصنیف ماخذ کی حیثیت سے بہت دلچسپ ہے، لیکن میں بالتخصیص مشہور ترکش لیڈی یعنی عدالت خانم کے اس سلسلۂ مضامین کی طرف ان کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو ولایت کے نامور علمی رسالوں میں متفرق طور پر نکلے ہیں، میرے خیال میں حشو و زوائد سے علیحدہ ہو کر نفس مضمون میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے، اور ہندوستان کی پبلک مولوی محمد حسن خان کی شکر گذار ہو گی اگر وہ ترکوں سے کبھی زیادہ تفصیل کے ساتھ ملا سکے،

(علیگڑھ منتھلی ۱۹۰۵ء)

علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ

آج چھ کروڑ مسلمان تو خیر، اسٹریچی ہال کی مقتدر جماعت کے پاس بھی کوئی علمی رسالہ نہیں جو معلوماتِ غائرہ اور انکشافاتِ عصریہ کے لحاظ سے قوم کے دماغی افق کی توسیع کرسکتا ہو، تہذیب الاخلاق سلسلۂ جدیدہ، سرسید کا نفس واپسین تھا جو اُن کی طرح ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہوگیا، اور اس کا زندہ کرنا اصولِ طبعی کے لحاظ سے ناممکن ہے؟

"ہر لالہ پژمردہ نخواہد بشگفت"

لیکن افسوس ہے کہ ہم جوانمرگ معارف کو جو تہذیب الاخلاق کا خلفِ صالح تھا زندہ نہ رکھ سکے، معارف کی چار سالہ جلدوں کو دیکھئے، صرف یہی نہیں کہ وہ یورپ کے اچھے سے اچھے علمی پرچوں سے بُرا نہیں، "اصحاب المعارف" نے جس طرح دادِ تحقیق دی ہے، اور عربی و ٹرکی لٹریچر کے اجزا جس طرح شائستگی اور قابلیت کے ساتھ اُردو میں لئے گئے ہیں، لکھنے والوں کا خاص حصّہ ہے؟ میرا خیال ہے موجودہ رفتارِ دماغی کے ساتھ ہم مدتوں اس قابل نہیں ہوں گے کہ اس قسم کے مضامین کی وقعت کا کوئی صحیح اندازہ کرسکیں، لائق لکھنے والوں نے علمی گذشتہ کی نئی پیداوار کی طرح کوئی "زبانِ غیر" نہیں لکھی ہے، بلکہ جس وسیع تمدن کا خاکہ کھینچا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے اس کی اصلی زبان معارف کی زبان تھی، لیکن ان مخصوص اوصاف

کے ساتھ بھی نتیجہ کیا ہوا، دو سال تک یہ پرچہ ایک رئیس کی سرپرستی میں رئیسانہ حیثیت
سے نکلا، نفسِ مضامین، کاغذ، تقطیع، غرض پرچہ کے تمام اجزائے ترکیبی "کلاسیکل" تھے
دو سال کے بعد اس نے صورت بدلی، اقامت بدلی، آخر آخر اس کی ہیئت ظاہری
لکھنؤ کے بازاری پرچوں سے کچھ ہی اچھی تھی، محلوں کا رہنے والا جھونپڑے میں
کیا پنپتا، پانی پت کی مٹی ٹھکانے لگی، مولوی وحید الدین سلیم کو اپنے طبع زاد نونہال
کا سسک سسک کر جان دینا آج تک یاد ہوگا (بہر حال اس لٹریری حادثہ کا
ذمہ دار کون ہے یقیناً مسلمان! لیکن چھوٹی امت نہیں بلکہ کچھ وہی روادار لوگ
جو انڈیا کے طبقۂ اعلیٰ میں ہیں، اور زیادہ تر "ینگ علی گڈھ" پارٹی جس کی زندگی میں
صحیح مذاقِ علمی کا اس وقت تک پتہ نہیں ہے)

"البتہ مسلمانانِ ہندوستان کو بحیثیت ایک "فارن" قوم کے دیکھنا چاہتا ہے
لیکن یہ خیال تحفظ کے لائق ہے، قومیت یعنی "نیشنلٹی" کے جتنے لوازم ہیں، میرا
خیال ہے یہاں کبھی حاصل نہیں ہوں گے، اس لئے مجموعی ترقی کے لئے متعدد
صدیاں بھی کافی نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ چند منتخب افراد کو کسی
ایک مرکزِ خیال کا محیط بنایا جائے، اور یہی لوگ میرے مخاطب صحیح ہیں جنکی فضا سے
دماغی کیلئے ضرورت تھی کہ کا تعرض "معارف" کو منتقل کردیتی بولایت "وحید الدین سلیم" اور
رشید احمد سالم" جنکے سایہ میں ہونہار معصوم پھولتا پھلتا لیکن ہائے بھولا! کانفرنس ایک علمی
اور کاروباری جماعت ہے یا کم سے کم ہونا چاہتی ہے، اور اس لحاظ سے اس کا یہ شغف خالی نہیں کہ
علم سے پہلے عمل چاہتی ہے جس کی طرف بزعم خود اسی نے مفید پیش قدمیاں کی ہیں،

"لٹریری" حیثیت سے یہ اتنی گری ہوئی ہے کہ امید نہیں کوئی علمی تحریک اسکی تعمیلات کے "فائل" میں داخل ہو سکے، شواہد لیجئے، رپورٹیں وقت پر نہیں شائع ہوتیں، جو نکلتی ہیں وہ بھی "لارڈ کرزن" کے ضوابطِ اختصار کے زیر اثر، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہینوں کے انتظار کے بعد بھی پڑھنے کو قریب قریب کچھ نہیں ملتا،

"اسپیچیں" عموماً زبانی ہوتی ہیں، اور یہ امر بولنے والے کے رحم پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اظہارِ فصاحت کے بعد وہ پھر کبھی ضبطِ تحریر میں لائی جائیں، جو بہت زیادہ نمونے ہیں، انکا استغنا اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آزادی خیال سرے سے قیدِ تحریر پسند نہیں کرتی، مختصر یہ کہ رپورٹ اتنی مفصل اور دلچسپ نہیں ہوتی جسکی امید ایک ایسی ہیئت الاجتماعیہ (سوسائٹی) سے ہو سکتی تھی، جو ۶ کروڑ مسلمانوں کی پیشوائے علمی ہو، شائقینِ کانفرنس میں ایسوں کی تعداد کم نہیں ہے جن کو شرکت کا موقع نہیں ملتا، اور وہ صرف اس خیال سے صبر ہوتے ہیں کہ سال کے سال مکمل رپورٹ ان کے ہاتھوں میں ہو اور وہ تعلیم یافتہ حضرات کے خیالات یعنی اُردو لٹریچر کے بہترین نمونے سے گھر بیٹھے لطف اٹھا سکیں، یہ توقع کہاں تک پوری ہوتی ہے، میں بانیانِ کانفرنس کے سلیقۂ احساس پہ چھوڑتا ہوں،

بولنے والوں میں صرف ایک شخص ہے جو اپنے ذاتی ترقی کی حفاظت کرتا ہے اور تاجرانہ پالیسی کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا، یعنی "علامہ نذیر احمد" یہ کانفرنس کے سامنے پکی پکائی ہنڈیا پیش کرتے ہیں، کچی رسوئی کے شائق نہیں اور اس حیثیت سے ہم ان کے ممنون ہیں، لیکن ان کے پچھلے لکچر اس قدر بکنے اور بدمزہ ہو گئے ہیں،

کہ آج تک بے نمکی بھولی نہیں ہے) ایک پچھلے موقع پر انہوں نے جو کچھ کہا، وہ
ان کی اچھی خاصی "آٹوبیاگرفی" تھی جس میں ایک سانس میں وہ تمام ذاتی واقعات
دُہرائے گئے تھے جن کی تفصیل سے متعدد موقعوں پر جستہ جستہ اور لکچروں میں بھی
بالکل نہیں چوکے! مشرقی شاعر اسے قند مکرر کہے گا، مگر چچوری ہوئی ہڈیاں بار بار
مُنہ میں ناگوار سا ہوتا ہے، ان کی گھبراہٹ سے معلوم ہوتا ہے، جیسے ان کو مایوسی
ہو کر ان کے بعد ان کے واقعات زندگی کا بیٹنے والا کوئی نہیں ہوگا، لکچر کا زیادہ تر
حصہ وہی فوائد قرآنی کے متعلق ہوتا ہے جو ان کے ترجمہ کے ساتھ مخصوص ہیں، اور
جن کی الہامی تکمیل ان کی ہستی کی علت غائی ہے، مختصر یہ کہ بعض فاضلوں کی قوت
کا بہترین استعمال نہیں ہوتا، یعنی ملک کے اچھے لکھنے والوں کو خاص سبجکٹ نہیں
دیئے جاتے، نہ علمی مضامین کے لئے کسی قسم کے معاوضہ کی ضرورت سمجھی جاتی ہے
سرسید کے بعد اردو لٹریچر کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں، اور میں نہیں جانتا
کہ کانفرنس نے بالذات یا بوسائط کہاں تک ان حریفانہ کوششوں کی مقاومت
کی ہے جو اس معصوم زبان کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرنا چاہتی ہیں، ایک یادگار موقع
پر نہایت گرم جوشی سے کہا گیا تھا کہ "اردو کا جنازہ ہم دھوم سے اٹھائیں گے"
لیکن موجودہ سرد مہری اور بے التفاتی تو یہ کہہ رہی ہے کہ اگر بہر پرستوں اور وارثوں
کے یہی طور طریقے ہیں تو ایک دن طاعونی لاش کی طرح عالم کس مپرسی میں یہ بیچاری
چپ چپاتے پیوند خاک کر دی جائے گی، بہتیرے رو پیٹ کر بیٹھ رہیں گے، کچھ
ایسے ہیں جو مصلحت یعنی اپنی کمزوریوں کے لحاظ سے آنسو پی جائیں گے، بہر حال لٹریچر

کی حیثیت سے کانفرنس بہیئتِ مجموعی اس کی مصداق ہو رہی ہے ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا

اس لئے ہم کو بانیانِ کانفرنس اور علی گڈھ کی نئی پیداوار سے سردست قطع نظر کر لینی چاہئے، کیونکہ یہ جس قدر ترقی کرینگے لکھنے پڑھنے کا مشغلہ چھوٹتا جائے گا، اور ایک زمانہ آئے گا کہ علی گڈھ کی "لٹریری ڈائری" بالکل سادی اور کوری ہوگی، اظہارِ خیال اور استنباطِ نتائج کے لئے صرف علم الاعداد کافی ہوگا،

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اور اور جگہ کیا ہو رہا ہے علی گڈھ کے حریف کیمپ یعنی "ندوۃ العلماء" پر میں اس وقت کوئی تفصیلی نظر ڈالنا نہیں چاہتا، نہ مجھکو اس سے بحث ہے کہ عربی لٹریچر کی تجدید جہاں تک آجکل کی ترقیات کے موثرات کا تعلق ہے، مذہب کی طرح اسبابِ شغویہ میں محسوب ہونے کے لائق ہے، ہاں یہ نہیں مانتا کہ علی گڈھ پارٹی "ندوۃ العلماء" کو رقابت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، ممکن ہے بعض اسے بے وقت کی شہنائی سمجھتے ہوں، لیکن نئے خیال والوں کا حصہ غالب عربی کی تعلیم کو صرف "زبانِ ثانی" کی حیثیت سے پسند کرتا ہے، یعنی مغربی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضمناً جس سے غالباً مقصود یہ ہوگا کہ "جامع ازہر" کی طرح قوم کا کوئی حصہ غیر ضروری اور متروک مشاغل کے لئے وقف نہ ہو جائے، اور جو کچھ ہو صرف مستشرقانہ حیثیت سے جس میں قدیم لٹریچر کے باقیات الصالحات کی تجدید مقصود بالذات نہیں ہوتی، بلکہ کوئی اہم غایت ہے جس کے لئے کرم خوردہ اوراق کی الٹ پھیر کی دردسری

گوارا کی جاتی ہے، مختصر یہ کہ نیا گروہ ایک منٹ کے لئے بھی ان مسلمات سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتا جو ہماری موجودہ اور آیندہ زندگی کا طے شدہ عنوان ہیں، لیکن میں اس اضافی بحث سے علیحدہ ہوکر سردست "الندوہ" پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں، جو واجب الادب علماء کا ایک ماہوار علمی رسالہ ہے، اور جس کے ایڈیٹر یا روحِ رواں جو کچھ کہئے "علامہ شبلی" ہیں۔ "الندوہ" سے جو کچھ دلچسپی ہے اسی حیثیت سے، کیونکہ شبلی گو آجکل ہم سے ٹوٹ کر وقفِ اغیار ہو رہے ہیں، تاہم روابطِ سابقہ کی بنا پر یہ قطعاً ہماری چیز ہیں اور ہم برسوں کے گہرے تعلقات کے بعد ان سے دستبردار نہیں ہو سکتے، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی "جامعیت" نئے پرانے خیال والوں کی ملکِ مشترک ہے، اس لئے اس کی ضرورت نہیں کہ یہ کسی ایک کے ہو رہیں،

پرچہ سے پہلے فاضل اڈیٹر پر کچھ ریویو کرنا منظور ہے، مگر یہ اس قدر مشکل کام ہے کہ سمجھ میں نہیں آیا کہاں سے شروع کروں، اردو لٹریچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آجکل کے وسیع معیارِ قابلیت کے لحاظ سے اہلِ قلم کی صفِ اوّل میں شامل ہونے کے لائق ہوں (سر سید سے قطع نظر کرنے کے بعد) ان کو باستحقاق اولیت کا فخر حاصل ہے، میرا خیال ہے، شبلی بلحاظ فن صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں ہیں، اس کو میری قاصر النظری یا علمی فرومایگی پر محمول کیجئے (فلسفۂ تاریخ جو آجکل تمام علوم میں سرِ فہرست ہے) ایک مستقل فن ہو گیا ہے اور اس قدر اہم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مؤرخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلۂ ہستی سمجھتے ہیں، مصری اور ٹرکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس

حد تک موجود ہے میں اس سے بے گانہ نہیں ہوں، مجھ کو معلوم ہے کہ دونوں زبانیں خاصکر اوّل الذکر اس قدر مغربیت سے مانوس ہوگئی ہے کہ وہاں کے روشن خیال علماء مغربی طرزِ تحریر کی خصوصیات کے ساتھ عربی اور ترکی زبانوں میں نہایت شائستگی سے دادِ سخن دے رہے ہیں، لیکن (جن مضامین پر انکے ہاں منقولانہ اور معقولانہ سرگرمیٔ طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں، وہ شبلی کے ہاں دست فرسودہ اور مسائلِ ابتدائی ہیں جن کو فاضل مؤرخ کی سرسری جنبشِ قلم مدت ہوئی ایک سے زیادہ موقعوں پر طے کر چکی ہے،) (ملک کے لئے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ مصر کے مشہور رسالہ "الہلال" کا نامور ایڈیٹر علّامہ "جرجی زیدان" اپنی تاریخ "تمدنِ اسلام" میں جو متعدد جلدوں میں ختم ہوئی علّامہ شبلی کی تحقیقات سے بے نیاز نہ رہ سکا، اور اس سے سنداً اقتباسات کئے،)

بہر حال ہم میں صرف شبلی ایسا شخص ہے جو بلحاظ جامعیت اور وسیع النظری مؤرخانہ تدقیق اور مذاقِ فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مؤرخ سے پہلو بہ پہلو ہو سکتا ہے،

یورپ کو شکایت ہے کہ مسلمانوں میں متقدمین بلکہ متاخرین میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہوا جسے صحیح معنوں میں اگر حفظِ روایات سے قطع نظر کی جائے تو مؤرخ کا کہنا درست ہو، یعنی استقصائے روایات کے سلسلہ میں کسی نے اپنے ماخذوں کی چھان بین نہیں کی، نہ غیر مرتب مواد سے کسی دور اور کسی زمانہ میں ایسے نتائج حاصل کئے گئے جن میں طبیعتِ انسانی کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیتیں، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائنِ عقلی سے مدد لی گئی ہو،

(ابن خلدون کا نام بار بار لیا جاتا ہے جس نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھانا چاہا، مگر خود اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے خیالات قوت سے فعل میں نہ آسکے) یہ بالکل صحیح ہے، لیکن آج ہم بیسویں صدی کے ایک فاضل مؤرخ کو پیش کرتے ہیں جس کا دائرۂ معلومات اس قدر وسیع ہے کہ وہ اپنے سلسلۂ تحقیقات میں صدیوں کی فروگذاشت کی تلافی کرتا جاتا ہے، اور اگر وقت نے مساعدت کی اور اس کا تخیل پورا ہو سکا تو تاریخِ اسلامی کے مہماتِ مسائل ایک ایک کر کے طے کر دیئے جائیں گے،

کہا جاتا ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے گوشوں میں اب بھی بہتیرے علما پڑے ہیں ممکن ہے لیکن کسی شخص کا دماغ دُوسروں کے علوم و فنون سے بھرا ہو، مگر اس میں خود تحقیق یا اختراع کا مادہ نہ ہو تو ایک بیکار سی چیز ہے، اس لئے ایک حکیم کے خیال کے مطابق اصلی قابلیت صرف وہ وسائل یعنی طریقۂ استعمال ہے جس سے موادِ گذشتہ کارآمد بنایا جا سکے، یہی تصرفات ہیں جن کی بنا پر ایک ادیب یا مؤرخ کو لائق سے لائق شخص پر جو صرف جامع اللغات ہو تو ترجیح حاصل ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ ترے الفاظ مؤخر الذکر کے ہاں کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں، انسانی احساسات و خیالات اور تحقیقات و اختراعات کی مسلسل تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے اور کارلائل کہتا ہے کہ جس شخص کو چھپے ہوئے حروفِ تہجی کا راز معلوم ہے وہ اسے قوتِ آخذہ سے اپنا کر سکتا ہے، صرف صدائے اصلی کی تلاش کا ذوقِ صحیح ہونا چاہیئے، ہاں شبلی، فاضل شبلی نقوشِ حرفی کا رازدار ہے، اس نے اپنے ماخذوں کی چھان بین میں صرف صدائے اصلی سے غرض رکھی، اور اپنے وسیع سلسلۂ تحقیقات میں زبردست قوتِ استقرائی کے ساتھ

اسباب و نتائج کی تفریعات فلسفیانہ سے آجکل کے ترقی یافتہ مذاق کے مطابق اس طرح کام لیا جس سے اس کی آواز بازگشت تمام ملک میں گونج اٹھی اور ہندوستان کے علمی قلمرو میں ایک نیا تاریخی دور شروع ہوگیا،

مختصر یہ کہ آجکل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز فوقیت حاصل ہے، جو ان کے اور ہمعصروں کے حصہ میں نہیں آیا، ان کے سخت سے سخت حریف مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچنے، بعضوں نے موضوع سخن ایسا اختیار کیا ہے کہ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو زیادہ جیتے معلوم نہیں ہوتے، نذیر احمد اپنی لائق رشک عربیت کے ساتھ بھی کچھ یونہی سے رہے، یادش بخیر! حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمۂ شاعری اور حیاتِ جاوید لکھ کر اپنا ٹھکانا کر لیا لیکن شبلی قطعاً غیر فانی ہیں، آج ہزاروں صفحے متعدد جلدوں میں ان کے قلم سے نکل چکے ہیں، اور جس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعہ خیال موجود نہیں،

میں نہیں جانتا اس سے زیادہ ہماری توقعات کیا ہوسکتی ہیں، اور چونکہ سلسلۂ تصنیف با وصف موانع باقاعدہ طور پہ جاری ہے، امید ہے ان کی تالیفات بوجوہ اُستادانہ حیثیت سے آیندہ بھی ملک کو دماغی اور ادبی سبق دیتی رہیں گی،

افسوس ہے کہ سلسلۂ آصفیہ ان کی جامعیت سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکا، نہ انکی مخفی قوتوں کو کافی تحریک دی گئی، دائرۃ التالیف کا پراسپکٹس مجھے ہمیشہ یاد رہے گا، جس کی تکمیل تاریخ اسلام کے ان عناصر پر جو آج تک سربمہر رہے ہیں، بہت کچھ روشنی ڈالتی، اور ہم متقدمین کی سادہ اور بسیط سلسلۂ روایات کے ساتھ یورپ کی

نکتہ سنجیوں سے بھی بے نیاز ہو جاتے، لیکن میں خوش ہوں کہ الندوہ نے جو اس تحریر کا موضوعِ اصلی ہے گذشتہ نقصان کی تلافی کر دی ہے، میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ منتشر معلومات کا بہت بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے جس کے اجزا کسی مستقل تصنیف کی تحت میں نہیں آسکتے، اور ان کے لئے موقت الشیوع پرچوں کی ضرورت ہے جن صاحبوں نے رسائلِ شبلی کو استفادۃً دیکھا ہے وہ بہت خوش ہوں گے کہ مضامینِ شبلی کا ایک ضخیم مجموعہ لائقِ حصول ہے، یعنی الندوہ کو جاری ہوئے دوسرا سال ہے، ۱۸ پرچے شائع ہو چکے ہیں جن کے تخمیناً چھ سو صفحے ہوتے ہیں، اور قریب قریب سب علامہ شبلی کے قلم کے سایہ میں ہیں جن میں نہایت بلند پایہ ایجنل مضامین پہ طبع آزمائی کی گئی ہے، یعنی علومِ قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ، عربی زبان کی نادر الوجود کتابوں پر تقریظ و تنقید، اکابرِ سلف کی سوانح عمریاں، ان کے اجتہادات سے بحث وغیرہ وغیرہ، غرض ایک علمی رسالہ کا اونچے سے اونچا تخیل جو ہو سکتا ہے، پیشِ نظر رکھا گیا ہے، آج کل کے رائج الوقت طالب العلمانہ رسالوں کی طرح ناقص لٹریچر میں دوئم درجہ کی معلومات سے مقررہ صفحے نہیں بھرے گئے ہیں بلکہ جو کچھ ہے تاریخی لٹریچر کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ ہے،

مثالاً میں صرف "فلسفۂ یونان و اسلام" لیتا ہوں جو نہایت معرکۃ الآرا مضمون ہے اور کئی نمبروں میں ختم ہوگا، آج ملک میں شبلی کے سوا کون ہے جو اس وسیع اور دقیق مضمون پہ قلم آزمائی کی جرأت کر سکے، نہ جاننا بھی مزے کی چیز ہے، اس لئے بعضوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی لیکن ہندوستان کیا اور ممالک میں بھی

دو چار سے زیادہ نہیں ہیں جو مذاق موجودہ کے مطابق مسائلِ قدیمہ کے طے کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں، شبلی ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہب کے ساتھ تاریخ و فلسفہ میں ربط باہمی پیدا کیا، اور ان جواہرِ عقلی کی تحلیل و ترکیبِ کیمیائی اس طرح کی کہ لٹریچر میں ایک خاص امتزاج پیدا ہو گیا جس کے آثار ان کے مستقل تاریخی سرمایہ کے علاوہ "الندوہ" میں کثرت سے ملیں گے، عموماً عنوان ایسے ہوتے ہیں جن کو اس سے پہلے اوروں کے قلم نے اس طرح کبھی مس نہیں کیا، کس کس کو گناؤں، پوری تفصیل کا یہ موقع نہیں، جس طرح رسائلِ اخوان الصفا ہمارے گذشتہ ارتقاءِ عقلی کی لٹریری یادگار ہیں، میرا خیال ہے یہ پرچہ آیندہ نسلوں کے لئے ندوۃ العلماء کے علمی کارناموں کا ایک جامع گوشوارہ ہوگا،

جن صاحبوں کو میری طرح شبلی کے دل و دماغ کے نتائج سے تعلق رہا ہے، وہ ان مضامین میں ایک خاص بات اور دیکھیں گے، یعنی طرزِ ادا (اسٹائل) اس قدر اچھوتا اور "صاف" ہے کہ بڑے سے بڑا فصیح البیان بھی اس قسم کے دقیق مسائل کو ایسی برجستگی اور لطافت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا، اور گو فصاحت ان کی تمام تالیفات کا قدرتی خاصہ ہے، جس میں اہتمام کو دخل نہیں، تاہم یہ حیثیت یعنی قادر الکلامی کے ساتھ حسنِ بیان مضامینِ متذکرہ میں بہت ہی زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے،

غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اُردوئے خاصہ" کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دُنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے، جنانچہ

پرآئی ہوئی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی، مدتوں شعراء سے گاڑھا اتحاد رہا، بہ اقتضائے سن
بری طرح کھل کھیلی، ہاتھ پاؤں نکالے، اور بہتیرے بنائے بگاڑے، کیونکہ ایک زمانہ
شیدائی تھا، لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی، بعض جگہ بے آبروئی کے سامان
ہو ہو کر رہ گئے اور بال بال بچی، آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول تو یہاں تک
ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا، کبھی کبھی دبی
زبان سے اُسے یہ کہتے سُنا،

"اری اُٹھ جاؤں گی میں جھنک سے"

لیکن دفعتہً اس کی حالت نے پلٹا کھایا، کثرت فواحش باعث سنجیدگی ہوگئی،
اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بنجاتی ہے، اب وہ مقدس علماء کی کنبروں میں داخل
ہے، لیکن سنا گیا خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے اور قریب قریب
ان ہی کے تصرف میں رہتی ہے، الندوہ اسی تعلق کا ایک ثمر بیش رس ہے،
پہلے اس کی قیمت للعہ مقرر کی گئی تھی، اب صرف دو روپیہ سالانہ رکھے گئے
ہیں، میرے خیال میں کوئی وقیع علمی پرچہ تمام دنیا میں اس سے زیادہ سستا
نہیں ہوسکتا، خاصکر جب چھپائی، کاغذ، اچھے سے اچھا ہو، نفیس پسند ایڈیٹران لوگوں
میں ہیں جو حُسن سیرت کے ساتھ صورت کی بھی اچھی چاہتے ہیں، یہ اصول ممدوح کی
تمام تصنیفات میں عموماً ملحوظ رہتا ہے، اور کوئی کتاب کسی بھونڈے پن کو نہیں
دی جاتی، ان اوصاف کے ساتھ یہ پرچہ گویا مفت ہے، لیکن علمائے موجودہ کے
دور آخری کی یادگار کی بقا اگر منظور ہے تو اس نونہال کو ہاتھوں ہاتھ لینا ہوگا، یعنی

۲۱۹۴۸

کمی قیمت کی تلافی اگر ہو سکتی ہے تو کثرتِ اشاعت سے، اور اس کی چلتی ہوئی تدبیر یہ ہے کہ ہر خریدار کم سے کم ایک ایک نام اور بڑھائے ورنہ خوف ہے کہ ایک دن اس کو بھی رونے رہ جائیں گے، بیشک یہ دنیا کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوگا، پرچے آیندہ بھی جاری ہونگے، لیکن شبلی یعنی ہندوستان میں تاریخ کا معلّمِ اوّل پھر کہاں!

دنیا کے نہایت گہرے تعلقات بھی راہ چلتے کی صاحب سلامت ہیں، سر سید چلے گئے، دو چار رفیق کہیں کہیں رہ گئے ہیں، ایک ایک کرکے ہم سے رخصت ہو جائیں گے، اچھا! تو بڑے سے بڑا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ وقتِ موجودہ سے جہاں تک ممکن ہے استفادہ کا کوئی پہلو رہ نہ جائے، اس لئے چلتے چلاتے جو کچھ ان کے دماغوں کی تحویل میں بچا کھچا رہ گیا ہے وہ نکلوا لیجئے، ورنہ یاد رہے گوروں کی اُردو گھنّی ہے، چلئے! علی گڈھ کالج میں سنوا دوں، دور از خیال بس یہ قطع ہو جائے گی، غالب کی اردو فارسی بندشوں کی افراط کے ساتھ جیسی ہوتی تھی یہی حالت آجکل مخلوط اردو کی انگریزی الفاظ کے ثقل آمیزش سے ہو رہی ہے، لیکن امید ہے، "الندوہ" ملکی لٹریچر کو ان آلایشوں سے صاف ستھرا کرکے رہیگا، کیا اچھا تھا اگر اس کا نام "الجامع" ہوتا، تب بھی ندوہ ہی کا پرچہ رہتا، موجودہ نام آپ ہی آپ کچھ کھٹکتا ہے، اور غیر ضروری سنجیدگی کے ساتھ ایک ساکن اور غیر متحرک شئے خیال میں آتی ہے، شگفتگی نام کو بھی نہیں لیکن "الندوہ" ایک ایسی قائم المزاج جماعت کا پرچہ ہے کہ میری طفلانہ تحریک شاید ہی کسی مفید تغیر کی طرف مائل کر سکے، تاہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ شبلی کے تعلق سے "الجامع" ہی موزوں تھا،

(البشیر ۱۹۰۰ء)

نامی پریس کانپور

کی

لٹریری خدمات

پھر جگر کھودنے لگا ناخن　　سینہ جویائے زخم کاری ہے

آجکل دو کتابیں عجلت کے ساتھ "نامی پریس" میں چھپ رہی ہیں، ایک تو بانیٔ لٹریچر اس شخص کی جدید تالیف ہے جو آج ادبی حیثیت سے ہزار ہا تحسین یافتہ دماغوں کا حکمراں ہے یعنی "معلمِ شبلی" کی تقریظ مثنوی، دوسری اُن کے خلیفۂ وقت یعنی "مؤلفِ البرامکہ" کا نقشِ ثانی ہے، یعنی تذکرہ نظام الملک طوسی جو سلسلۂ وزرائے اسلام کی دوسری جلد ہے،

ان کتابوں پر تفصیلی نظر اس سلسلۂ مضامین کا موضوعِ خاص ہوگا جو آیندہ "تالیفاتِ جدیدہ" کے عنوان سے البشیر میں ملک کے "شریف تر لٹریچر" سے متعلق مستقلاً قائم کیا جائے گا، یہاں بالتحقیق یہ دکھلانا ہے کہ جس زمانہ سے سرسید نے لکھنے پڑھنے کو رواج دیا، یعنی ایک خاص طرح کا لٹریچر عالم وجود میں آیا، ساتھ ہی مرحوم کا یہ بھی خیال تھا کہ لٹریچر کی ترقی کے لئے ٹائپ کا رواج لازم سا ہے، یعنی وہ ملک کی روز افزوں دماغی ضروریات کے لحاظ سے پتھر کی گھس گھس کو پسند نہیں

کرتے تھے، چنانچہ مطبوعاتِ "سائنٹفک سوسائٹی" وغیرہ کا بیشتر حصہ اور تہذیب الاخلاق کے پرچے ہمیشہ ٹائپ میں چھپے، رفتہ رفتہ "علی گڈھ کی صدائے اصلی اور آوازہائے بازگشت" کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تیار ہونے لگا، سال کے سال کانفرنس نے بھی لٹریچر میں مستقل اضافے شروع کئے، ان کے لئے کسی اضافی مگر خوش حیثیت پریس کی ضرورت تھی (اس تقریب سے مفید عام آگرہ منظر عام پر آیا اور لٹریری دنیا روشناس ہوئی) علی گڈھ لٹریچر کا زیادہ تر حصہ مفید عام نے شائع کیا ہے، اور جن صاحبوں نے ابتدائی پاکیزہ مطبوعات اور آخر آخر میں تمدنِ عرب کے ٹھاٹھ دیکھے ہیں، وہ اسے تسلیم کریں گے کہ اس "صوفیانہ پریس" نے شریف تر لٹریچر کی اشاعت میں جس قدر حصہ لیا ہے اس کے نتائج وسیع تاریخی حیثیت رکھتے ہیں، وہ نقوش جو ظاہرا پتھر سے کاغذ پر منتقل ہوتے رہے، آج اس لطیف دماغی سطح پر ہیں جو ہمیشہ "معلمانِ غیر ذی روح" کا تختۂ مشق رہی ہے جس کے آثار اگر خصائص قومی کوئی چیز ہیں تو رہتی دنیا تک مٹنے والے نہیں،

مختصر یہ کہ سرسید اور ان کے لٹریری دائرہ نے کبھی اسے پسند نہیں کیا، کہ ان کی تصنیفات کسی عامیانہ پریس کو دی جائیں، اس لئے صرف "مفید عام" سے واسطہ رکھا گیا جس نے اپنے فرائض خودداری کے ساتھ ادا کئے، ورنہ ملک میں دویم درجے کے مطابع آڑے ترچھے حاشیوں کے ساتھ "نسخۂ لاجواب مفید ہر شیخ و شاب" کے شائع کرنے والے کم نہیں ہیں، جہاں نرم مولویانہ تصنیفات" آئے دن "سیاہ و سفید" قالب اختیار کرتی رہتی ہیں،

ایک حکیم کے خیال میں شائستگی کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کے جتنے صیغے ہیں، عملاً اس میں متناسب موزونیت ہو، یعنی شائستگی کا کوئی رکن کسی حیثیت سے چھوٹنے نہ پائے، یہ نہیں ہو سکتا کہ جہاں کوئی صاحب مغربی تہذیب اور لباس سے آراستہ پیراستہ ہیں، کبھی ایسا بھی ہوا کہ ہوتے سوتے صرف "لنگوٹی" پر قناعت کی گئی ہو (میری غرض اس لفظ سے صرف اصطلاحی مفہوم سے ہے) شاید یہ ایک طرح کا بے ساختہ پن ہو، تاہم اس کے مکروہ ہونے میں تو شک نہیں، لیکن ہم میں بڑے سے بڑا سفید پوش بھی اکثر ان اوصاف سے معرا دیکھا جاتا ہے، اور بے تمیزی ایک طرح کی سادگی سمجھی جاتی ہے، بہرحال جس خاص موزونیت کی طرف میں آپکو لے جانا چاہتا ہوں اس کا اقتضائے طبعی یہ ہے کہ زندگی کی ہر شاخ میں متوازی اور مساوی ترقی کے آثار پائے جائیں، یعنی کہیں سے بے تکا پن نہ ہو، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو سرسید کے تمام افعال ارادی اور اضطراری میں اس اصول کی رعایت ملحوظ ہوتی تھی جس طرح وسیع تخیلات پر انہوں نے اپنے عظیم الشان تخیل کی بنیاد قائم کی تھی جسکے مادی شواہد آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، بعینہٖ اہتمام وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کیلئے کرتے تھے جو کالج یا اسکے متعلقات کا ایک جزو ہو سکتی تھی،

یہ ظاہر ہے کہ مرحوم کے بعد علی گڑھ لٹریچر میں بلحاظ وسعت یا مقدار چنداں اضافہ نہیں ہوا، یہ اور بات ہے کہ کبھی ضرورت ہوئی تو پڑھے ہوئے سبق دہرا لیے گئے تاہم اس میں نہیں یہ بھی کچھ نہ کچھ مواد جمع ہوتا رہتا ہے، مگر یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ عموماً غیر وقیع مطابع کو دیا جاتا ہے جو آجکل ہر گلی کوچے میں حشرات الارض

کی طرح نکل پڑے ہیں،

پچھلے چند سالوں کی کانفرنس کی رپورٹوں کو دیکھئے کتنی بری چھپی ہیں جنہیں دیکھکر نفرت ہوتی ہے، خود سر سید کی ایک لائق قدر تصنیف ایک بازاری پریس سے ہو کر نکلی، "یہ لنگوٹی" نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ امور کتنے ہی رکیک ہوں تاہم ایسے خاص باتیں قوم کے اصلی مذاق کی ایک حد تک غمازی تو ہوتی ہے، مجھے اصرار ہے کہ "علی گڑھ لٹریچر" کو بلا استثنا اول درجہ کے پریس میں چھپنا چاہئے، موجودہ پالیسی لائق اصلاح ہے، اور شاید اسی کا اثر ہے کہ "مفید عام" کی لطافت اور صفائی میں بھی ایک طرح کا انحطاط شروع ہو گیا ہے، یعنی وہ پہلی سی بات نہیں، قاعدہ ہے بازار میں زیادہ تر وہی چیز آتی ہے جس کی عموماً مانگ ہوتی ہے،

لیکن میں نہایت خوش ہوں کہ آجکل ایک "شریف پریس" ملک کے "شریف تر لٹریچر" کے لئے وقف خاص ہو رہا ہے اور اپنے طریق عمل سے ثابت کرتا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے اختراعات کے ساتھ بھی "لیتھوگراف" کے فنی تصرفات ایسے نہیں رہیں جن سے ایک منٹ کیلئے بھی دستبردار ہونا ممکن ہو، مضطرب یورپ کی عاجلانہ ضرورتیں صرف ٹائپ کی سرعت رفتار سے پوری ہو سکتی ہیں، لیکن ہاں بھی تزئین و آرائش کے موقعوں پر لیتھوگراف کی ضرورت ہوتی ہے، گو طریقہ کارروائی کسی قدر مختلف ہو، ہم کو نامی پریس کا ممنون ہونا چاہئے کہ وہ ایسے زمانہ میں جبکہ کسی چیز کی اچھائی کا اندازہ اس کے اوصاف سے نہیں بلکہ سستے داموں سے کیا جاتا ہے، قیمتی لٹریچر کے اجرا سے زرین غیر معمولی نفاست و پاکیزگی سے پیش کرتا رہتا ہے،

اور غالباً وہ اس حیثیت سے تمام مشرق میں منفرد ہے) ملک میں آج پاؤں کے
ولایتی جوڑوں پر معمولاً ایک اشرفی صرف کرنے والے تو بہتیرے ہیں لیکن اس
وضعدار جماعت میں کتنے ایسے ہیں جو بالالتزام نامی پریس کی شائع کردہ "جلد ہائے خاصہ"
کی خریداری کو حفظ مراتب کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہوں، بہر حال یہی وقعت کی کمی
سے لٹریچر کی کتنی ہی کساد بازاری ہو، تاہم نامی پریس اصولاً جرمن نہیں، بلکہ انگلش ہے،
یعنی اسکی پیداوار آخور کی بھرتی نہیں ہوتی (بلکہ جو چیز ہے ٹکسالی اور آپ اپنی نظیر ہے)
اس وقت تک اس پریس سے جتنی لائق ذکر تصنیفات نکل چکی ہیں انکی تفصیل غالباً یہ ہو،

(۱) الفاروق (۲) البرامکہ (۳) حیات جاوید (۴) رباعیات حالی
(۵) الغزالی (۶) الکلام (۷) دیوان شبلی،

بعض جزئیات کی تصریح خاص لٹریری مقاصد کے لحاظ سے ناگزیر ہے، اسلئے
میں بتانا چاہتا ہوں کہ "الغزالی" کی جلد خاصہ کے لئے جو کاغذ استعمال کیا گیا ہے غالباً
اس سے پہلے ملک کی کسی تصنیف کو اتنا قیمتی کاغذ نصیب نہیں ہوا، کم و بیش یہی
حال اور کتابوں کا بھی ہے، خط طلی اور چھپائی ایک سے ایک بڑھکر، ہیں یہ معلوم ہوتا
ہے سنگ مرمر پر سنگ اسود کی پچیکاری کی گئی ہے، یورپ میں بیکڈل بہترین
ساخت کا کاغذ سمجھا جاتا ہے جس کی کتابی تقطیع کے ایک کوائر یعنی ۱۲۰ تختوں کی
قیمت گیارہ روپے ہوتی ہے، لیکن نامی پریس نے حال میں ایک کاغذ منگوایا ہے
جو بیسکول کی طرح برف سا سپید اور نہایت چکنا اور نفاست میں اس سے بڑھا
ہوا ہے یعنی ہلکا ہے اور لاگت میں تو نسبتہً کچھ نہیں "الکلام" اور "دیوان شبلی" قسم

اوّل میں بھی کاغذ لگایا گیا ہے، اور اسی پر تالیفاتِ موعود کی جن کا ذکر شروع میں آچکا ہے، جلد خاصہ چھپ رہی ہے، ناظرین قبل از وقت درخواستیں بھیجکر ایک ایک جلد اپنے لئے محفوظ کرا سکتے ہیں،

تالیفاتِ متذکرہ کے علاوہ دو کتابیں اور ہیں جو منشی رحمت اللہ رعدؔ نے خاص اہتمام سے اپنی ایڈیٹری میں شائع کی ہیں،

یعنی "دیوانِ حافظ" اور "آثار الصنادید" اور یہ ایک ایسی مفید جدت ہے جسکی طرف ملک کے اور لائق اصحاب کو بھی متوجہ ہونا چاہیئے، آج جو لوگ مستقل تصنیفات کے مالک ہیں ان میں وقیع تراجم کا بالکل رواج نہیں ہے، اور اس کا تو خیال بھی کسی کو نہیں آتا کہ کوئی قدیم تصنیف محققانہ نوٹ وحواشی کے ساتھ شائع کی جائے، اور گو یورپ کی مستشرقیت کا اعتراف نہایت فیاضانہ الفاظ میں کیا جاتا ہے لیکن وہاں کے نمونوں کی پیروی کا خیال، تفکر بالقوۃ سے آگے نہیں بڑھتا، یہ بھی لٹریچر کی حق تلفی کا ایک پیرایہ ہے جو ناقدر دانانِ سخن کے ہاتھوں ہوتی رہتی ہے، بہرحال ہم رعدؔ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ایک جدید پیش قدمی کی،

ابھی مجھے یہ دکھانا باقی ہے کہ عموماً کتابوں کی لوح یعنی "سرورق" کے آرایشی تکلفات رعدؔ کی نازک خیالی اور ایجاد پسند طبیعت کا بہترین مرقع ہوتے ہیں،

"آرٹ" کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے تصرفات کے سلسلہ میں نیچر سے قریب ومتماثل ہوتا جائے، رعدؔ اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کی جس شاخ کو انہوں نے اپنی جدتِ اختراع اور صنعت آرائیوں سے چمکایا ہے وہ ان کو

من حیث الفن، اختصاصی (اسپشلسٹ) ثابت کرتی ہے اور یہ خود ایک کمال ہے،
بعضوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں کسی حد تک ارتقاء عقلی شروع ہو گیا ہے،
اگر یہ صحیح ہے تو تھوڑی دیر کے لئے ہم دل خوش کرنے کو مانے لیتے ہیں کہ موجودہ دور
(جس میں "تقریظ مثنوی" اور "نظام الملک طوسی" کی لائف عنقریب عالم محسوسات میں
قدم رکھنے والی ہیں) دماغی حیثیت سے اس وقت کے گذرے مسلمانوں کا
"نشأۃ الثانیہ" ہے، اس خیال کے ساتھ ہی وہ "ادب العالیہ" یعنی "کلاسیکل" مجموعہ
ذہن میں پیش نظر ہو گیا، جسے "نامی پریس" نے وقتاً فوقتاً شائع کیا ہے، ان مکلف اور
خوبصورت جلدوں کو ایک جگہ رکھ کر دیکھئے، کیا کسی مٹی ہوئی قوم کے عقلی آثار ہیں؟ ہرگز
نہیں! یہ صحائف زرنگار تو کچھ اور کہہ رہے ہیں، ان کی ایک ایک جلد مطبع سے
براہ راست برٹش میوزیم، انڈیا آفس، پیرس کے کتب خانۂ عامہ اور اردو لٹریچر کے
پروفیسر گارسن ڈی ٹاسی کے پاس پہنچ جاتی تھیں، یعنی دنیا کے اور فائق تر لٹریچر
کے دائرہ میں ان کو داخل کرتا تھا، ملکی فضل و کمال کے ساتھ صنعت کے عمدہ ترین
نمونے تھے، جو یورپ میں علمی نمائش کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے تھے،

ہاں ایک بات اور یاد آئی، آرٹسٹ ذہن کے دست صنعت کی موشگافیاں اسوقت
تک طلائی اور نقرئی مینا کاری اور مختلف قسم کی نازک رنگ آمیزیوں سے آگے نہیں بڑھیں،
اس میں بھی کسی حاشیہ کی بیل کے لئے وہ نمونہ کام میں نہیں لایا گیا، جسے اصطلاح میں
"کلید یونانی" کہتے ہیں، اور جو قدامت کے لحاظ سے ایک کلاسیکل چیز ہے،
میری خواہش تھی کسی موقع پر صرف سادگی سے آرائش کا کام لیا جائے، ایک

جدید طریقہ یہ ہے کہ حاشیہ کی درمیانی سطح یعنی پلیٹ کو دباکر حروف ابھارے جاتے ہیں جس کے لئے کسی رنگ کی ضرورت نہیں، سطح کا نشیب و فراز اور کوئی خاص خیال جو نقوش میں ظاہر کیا گیا ہو، بجائے خود ایک لطیف صنعت ہے، اس کیلئے وہ طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو ریلیف اور ہاف ٹاؤن پروسس میں برتا جاتا ہے۔ یہ خیال کافی طور پر الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا، مغربی نمونے رہبری کریں گے،

(دیوانِ شبلی کی لوح نے ترکوں کی معاشرت کی جدت کو دبایا، لیکن رعد اس بڑھاپے میں ابھار کہاں سے لاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ حروف سپاٹ رہے،)

آخر میں حضرت رعد سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ موجودہ بے چین زندگی کے حوائج کو دیکھتے "دیر آید درست آید" ایک بے معنی سا فقرہ ہے، ایکسپریس میں اڑنے والے چھکڑے تو مدت ہوئی متروک ہو چکے ہیں، مسافر گاڑیوں میں سفر کرنا بھی بلا سے جان سمجھتے ہیں آپکی کل "خیام کی" فردا سے دیروز "یعنی آج" سے بدل جاتی تو اچھا تھا، آخر انتظار کی کوئی حد بھی ہے، مولانا روم اور نظام الملک طوسی سے جلد ملائیے تو احسان ہوگا،

یہ بسیط اظہارِ خیال ایک مستقل عنوان کے تحت میں غالباً بعض صاحبوں کی رائے میں ایک بے جوڑ سی بات ہوگی لیکن دنیا میں آج ذرے بھی سالمات ہو رہے ہیں اور کوئی ایسی چیز موجود فی الخارج نہیں ہے جس سے نظام کائنات کو کچھ نہ کچھ مدد نہ ملتی ہو، (تاج پریس چونکہ بواسطہ ملک کی دماغی ترقی کا کفیل ہے، ضرورت تھی کہ لٹریری گروہ کی طرف سے قومی اخبار میں اس کے مساعیٔ جمیلہ کا کافی اعتراف نہ سہی ایک مرتبہ ذکر تو آجائے،

(البشیر ۱۹۰۶ء)

آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ

فاضلِ عصر پروفیسر کی تالیفِ جدید یعنی مولانا روم کی لائف جس کے لئے
مدت سے آنکھیں فرشِ راہ تھیں، گھونگھٹ سے باہر آئی اور اس طرح کہ

"عروسِ جمیل ولباسِ حریر"

یورپ میں جہاں مذاقِ حسن پرستی، یعنی ایک طرح کے تناسبِ اجزا کی رعایت قریب
قریب ہر شخص کا خمیر ہو رہی ہے، جہاں شائقین کی نگاہیں کہربائی روشنی میں
جینی جاگتی "زہرہ ہائے شب" کے مقیاس الشباب اور اس کے برہنہ حصۂ افتی
کے جائزہ کے لئے وقف رہتی ہیں، ایک سنجیدہ طبقہ ایسا بھی ہے جو کتابوں کو
علمی حرم کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ان کا دلدادہ ہے، اس کے خیال میں کسی
کتب خانہ کا ایک گوشہ جہاں اس کی منظورِ نظر نازنینوں کا جھرمٹ ہو، اور جو ہمیشہ
اس کی فرصت اور مرضی کی منتظر رہتی ہوں، اس شاہی محل سے کہیں بڑھ کر ہے
جس کے لوازمِ عیش صرف دور سے دیکھنے کی چیز ہیں،

بہر حال ایک ایسا گروہ موجود ہے جو علمی دنیا میں درجۂ استغراق رکھتا ہے،
زمانہ کے سرد و گرم سے قطعاً بے پروا ہے، اس کا دائرہ مخصوص خود ایک دنیا ہے
جہاں ایسے سامانوں کی کمی نہیں جن سے قوتِ احساس ہر طرح کی لذت و انبساط
حاصل کرتی رہتی ہے، اسی طبقہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی نفاست

اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ معمولی مطبوعات کو پسند نہیں کرتے، اور چیدہ چیدہ کتابوں کے خاص خاص ایڈیشن چھپوائے جاتے ہیں، حال میں "رباعیات عمر خیام" کا ایک اڈیشن اسی اصول پر ایک جماعت محدود یعنی صرف دو سو[۲] صاحبوں کے لئے چھاپا گیا ہے، جس کی اشاعت صرف ممبروں تک محدود رہی، اور جس کا ایک قیمتی نسخہ خوش نصیبی سے آجکل میرے مطالعہ میں ہے،

ہندوستان میں اس قسم کے معزز شواہد کی اوّلیت کا فخر صرف "نامی پریس" کانپور کو حاصل ہے جس کا ذکر ایک دفعہ آچکا ہے، اسی طرح طبقۂ اعلیٰ کے مصنفین میں علامہ شبلی کی تصنیفات کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کا بہتر سے بہتر ایڈیشن جو کسی نفیس پسند کے خیال میں آسکتا ہے، اکثر انہی حصول ہوتا ہے، موجودہ کتاب کی جلد خاص میرے دعوی کے ثبوت میں ہے، اور میرا خیال ہے کہ ملک میں آج تک اس سے بہتر اڈیشن کسی کتاب کا شائع نہیں ہوا، قاعدہ ہے کہ لفافہ اچھا ہوتا ہے تو ملفوظ کو اس سے کہیں زیادہ اچھا ہونا چاہیئے، اور گو میں اس وقت جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ صرف تازہ وارد یعنی "تقریظ مثنوی" کے خیر مقدم کی حیثیت سے ایک فوری جوش کا اظہار ہوگا، تنقید یعنی مولانا روم کے ساتھ علامہ شبلی پر قلم اٹھانا فرصت و لیاقت کا کام ہے جسے ملک کے فاضل تر اصحاب کے لئے چھوڑتا ہوں، اس میں میرا پردہ رہ جاتا ہے، اور ساتھ ہی سرسری طور پر کچھ نہ کچھ کہہ جاؤنگا جس میں ذمہ داری ہاتھ دھوکر پیچھے نہیں پڑے گی،

("سوانح روم" علامہ شبلی کی تالیفات (بشمول دیوان فارسی) سلسلہ کی دسویں

جلد ہے ، موضوعِ سخن اور اس لحاظ سے کہ انہوں نے اپنے ملکۂ راسخہ یعنی فطری
قوتِ تصنیف سے آج تک وہی کام لیا جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا
مصرف ہو سکتا تھا ، ملک کے مصنفین میں سرِ فہرست تو تھے ہی ، میں دیکھتا
ہوں اب بہت آگے نکلے جاتے ہیں ، انہوں نے فلسفۂ تاریخ کو اس لحاظ سے کہ
وقت کی چیز ہے اپنا خاص فن قرار دیا اور ترتیباً جس پیمانہ پر یہ اظہارِ خیال کرتے
رہے وہ ایک منحرف بھی تسلیم کرے گا کہ اُن کی قوتوں کا صحیح سے صحیح استعمال تھا کہ
جو خیال میں آ سکتا ہے ، ملک کے اچھے لکھنے والوں میں بعض ایک طرح کے
وصولی ہیں ، یعنی وہ فرمائش سے کچھ نہیں کرتے ، اچھی سے اچھی تجویز پیش کیجئے ،
لیکن اس لئے لائقِ التفات نہیں ہوگی کہ وہ ان کے صاف و شفاف دماغ کی
گونج نہیں ہے ، تاہم وقت آگے چل کر بتائے گا کہ (ان) دماغوں میں اقتضائے
وقت کی رعایت اور صحیح قوتِ فیصلہ نہیں ہے ، ان کے نتائجِ فکر ایک طرح کی
وقتی اور خودرو پیداوار ہیں جن کی شادابی صرف ایک موسمی چیز ہے ۔

لیکن علامہ شبلی سے ہم کو اس قسم کی شکایت نہیں ، یہ خود بلا پابندیٔ فرمائش
جو کچھ کرتے رہتے ہیں وہ ہماری توقعات اور استحقاق سے کہیں زیادہ ہے ، ان کی
مستقل تصنیفات و مضامین کی تعداد اوپر بتائی گئی ۱۳ — ۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ،
حالتوں کا موازنہ آجکل کے قواعد الرسمیہ (اٹی کیٹ) کے مطابق خلافِ شائستگی سمجھا
جاتا ہے ، تاہم یہ تنقید کا ایک ضروری عنصر ہے ، لیکن میں اس وقت ان کو ان کے
دائرہ کے دوسرے مؤلفین ادب سے ٹکرانا نہیں چاہتا ، صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں

کہ جس طرح یہ اپنے حلقہ میں غالباً سب سے کم عمر مصنف ہیں، ادبی حیثیت سے یہ نسبتہً اتنے ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ اس دماغی فوقیت کا راز صرف یہ ہے کہ خوش نصیب شبلی نے اپنی ذہنی اور اکتسابی قوتوں کی رعایت سے جو وسیع موضوعِ بحث اختیار کیا وہ بلا استثناء اوروں کے دسترس سے باہر تھا، اس سے زیادہ موزونیت لائقِ رشک ہے جو قواماً ان کے ہر حصۂ تصنیف کا ایک خاصہ ہوتی ہے، اسلامی تاریخ فلسفہ اور عقائد کے متعلق جس قدر مواد یہ یکجا کر سکے قدیم تاریخ کا گویا نچوڑ ہے جس سے ایک حد تک تاریخ عربی لٹریچر کی ترتیب ممکن ہے: اسلامی تاریخ کے متعلق ایک زمانہ میں یورپ نے جس قدر متعصبانہ رائے قائم کی تھی، اب رفتہ رفتہ وہ ان سے دست بردار ہوتا جاتا ہے، موجودہ دور میں جو ہر قسم کی دماغی ترقیات کا دور ہے، واقعات کا ایک خاص معیارِ صداقت قائم ہو گیا ہے، ہر واقعہ کی جانچ اجتماعی، اخلاقی، سیاسی حیثیت سے کی جاتی ہے، چنانچہ یورپ میں علمائے مستشرقین کی توجہ سے جدید سلسلۂ اکتشافات میں اسلام کے متعلق ایک نیا لٹریچر پیدا ہو گیا ہے جس میں ہمدردانہ التفات کے ساتھ ایک طرح کی سنجیدگی اور بلند نظری پائی جاتی ہے، تاہم ان علماء کے خیالات کا بیشتر حصہ نظرِ ثانی چاہتا ہے، میں مثلاً محققین یورپ کے سرخیل یعنی "وان کریمر" کا ذکر کروں گا جس نے ایک رسالہ مختصر الموضوع میں یہ دکھایا ہے کہ اسلام اپنی ترکیب و ساخت کے لئے کن کن مذاہب کا ممنون ہے، ناظرین عنقریب مفصل اقتباسات دیکھیں گے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ فاضل مؤرخ نے عمداً استخراجِ نتائج میں کہاں تک بے پروائی سے کام لیا ہے: بہرحال

باوصف اس حسن ظن کے جو آجکل کی جماعتِ مستشرقین کی طرف سے پیدا ہوتا جاتا ہے، اس قسم کی مثالیں کم نہیں ہیں، جن میں مغربی علماء کی اجتہادی لغزشیں اب بھی محسوس ہوتی ہیں،

لیکن پروفیسر شبلی نے جیساکہ پہلے کسی موقع پر دکھایا گیا ہے ہم کو غیروں سے قریب قریب بے نیاز کر دیا ہے، بہرطرح قدیم تاریخ ولٹریچر کے جامع ہیں، آجکل کے فلسفیانہ انتقادات اور نکتہ سنجیوں سے آشنا ہی نہیں، بلکہ یہ مذاق ان میں اس قدر رچا ہوا ہے کہ ان کے طے کردہ مسائل جو دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں اس حد تک کامل ہیں کہ میرا خیال ہے کہ زمانہ آیندہ بلکہ بعید آیندہ میں بھی غالبؔ ان پر کوئی معتد بہ اضافہ نہ ہوسکے گا، اسی طرح ان کے اجتہادات کا (جنکو تاریخی الہامات کہنا زیادہ تر موزون ہوگا) کوئی حصہ صدیوں بعد بھی متروک ہونے کے لائق نہیں ہوگا، اس سے زیادہ شبلی کے غیر فانی ہونے کا ثبوت کیا ہوگا؟ یہ لکھ رہا ہوں اور میری نظر ان کی بہترین تالیف یعنی الکلام کے دونوں حصوں پر ہے اور میں بلاخوفِ تردید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر موجودہ نسل کیلئے دماغی اور عقلی ترقی کے ساتھ اخلاقی تکمیل کی بھی ضرورت ہے تو ہم کو "الکلام" کے ہوتے کسی کتاب کی ضرورت نہیں، جو حضرات جدید علم کلام کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں، وہ دیکھیں گے کہ فاضل پروفیسر نے ایک طرف تو بڑے میاں یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری، اور ساتھ ہی یورپ کے تو خیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ اور سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں دھلوائے، بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا، یہ معتدل

روش جو اس علمی نزاع میں اختیار کی گئی ہے وہ شبلی ہی کا حصہ تھا جو نئے پرانے
خیال والوں کے متفق علیہ پیشوائے علمی ہیں، ان کی ثقاہت نے جہاں مذہب
کی حق تلفی نہیں ہونے دی، سائنس و فلسفہ کی مغائرت بھی دور کردی اور انکو مذاہب کا
دست و بازو بنا دیا، آیندہ زمانہ میں جب ہماری عقلی ترقیات کا شباب ہوگا، شبلی کو
اپنے مساعی جمیلہ کی پوری داد ملے گی، تاہم آجکل کا تعلیم یافتہ طبقہ جو عموماً مذہب سے
بے پروا ہو رہا ہے، مذہب فطری یعنی حکیمانہ اسلام سے دست بردار نہ ہوسکیگا،
معقول و منقول کی تطبیق کی غایت اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے جو شبلی کی دوسری
کا بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے،

خدا جانے میں رَو میں کہاں سے کہاں نکل گیا، لیکن یہ قصورِ انشا پردازی نہیں
ہے، بلکہ پروفیسر شبلی اس کے ذمہ دار ہیں، ناممکن ہے کہ ان کی ذات کے ساتھ
ان کی صفات غالب یعنی جزئیات متعلق سامنے نہ آجائیں، اس لئے ان بے ربط
خیالات کا اعادہ کچھ ناگزیر سا تھا، مختصر یہ کہ جہاں ان کی مؤرخانہ عظمت قطعی الثبوت
ہے، ایک خاص امر جس کی طرف ناظرین کو اس وقت متوجہ کرنا منظور ہے یہ ہے کہ
"عربی کا یہ فاضل پروفیسر نہایت سخت عجمی ہے" تو یہ کیا کہہ گیا؟ ہاں تو یہ وصف
اضافی ان کی عربیت میں اس قدر دب دیا گیا ہے کہ بہتیروں کو یہ بات معلوم
نہیں ہوگی کہ دنیا کی سب سے شیریں زبان یعنی فارسی شبلی کی خاص زبان ہے،
ان کو کس حد تک صحیح مذاقِ سخن ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو خود
اہلِ زبان ہیں یا کم سے کم ذوقِ سلیم رکھتے ہیں، ہندیوں کی متعارف فارسی یا یہ

انگلش" کی طرح ایک بالکل جداگانہ چیز ہے، جو قریب قریب یہاں سے رخصت ہو چکی ہے، اور جس سے مَیں یہاں کوئی غرض رکھنی نہیں چاہتا، میری غرض پروفیسر براؤن کی فارسی سے ہے جو اس قوم کی زندہ یادگار ہے، جو بلحاظ گذشتہ عظمت و ترقیات دنیا کی قدیم متمدن اقوام میں خاص تاریخی وقعت رکھتی ہے، انگلستان مستشرقانہ مشاغل کے لحاظ سے یورپ کے اور ممالک سے بہت پیچھے ہے، تاہم وہاں ایک جماعت موجود ہے جو السنۂ مشرقی میں اہلِ زبان کی سی مہارت رکھتی ہے، حال میں پروفیسر براؤن نے ادبی حیثیت سے "تاریخ ادبیہ" لکھی ہے جس کی دو مبسوط اور ضخیم جلدیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں "دو راخمانیاں" یعنی فارسی قدیم کے ساتھ اس نے "ساسانیوں" کے عہد کے لٹریچر یعنی زبان پہلوی کا پورا مرقع کھینچا ہے جو تمام و کمال گویا "زرتشتی" لٹریچر ہے اس نے نہایت قدیم کتبوں اور تاریخی اسناد سے اس عہد کی علمی معلومات بہم پہنچائی ہیں جس کی یادگار پارسیوں کا صحیفہ غیبی یعنی "اوستا" ہے جس کی تفسیر پہلوی شرح الشرح "زند پازند" ہیں، عجمیوں کی ایام جاہلیت کی تاریخ کے بعد جو نہایت عسیر الحصول ماخذوں سے مرتب کی گئی ہے، تیسرے دور میں فاتحین اسلام کے تصرفات یعنی عربی کی آمیزش نے زبان پر جو اثر ڈالا ہے، ان جزئیات کی تفصیل کے ساتھ ارتقائی حیثیت سے یہ دکھایا ہے کہ فارسی جدید کس طرح عالمِ وجود میں آئی، اسی طرح مسلمانوں کی مفصل دماغی تاریخ لکھی ہے اور اس کو متعدد دور میں تقسیم کیا ہے، جدت یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ عجمی عنصر کو الگ کر کے دکھاتا گیا ہے، پہلی

مقدمہ کی حیثیت سے ہے، دوسری میں جو ابھی شائع ہوئی ہے فردوسی سے لے کر سعدیؒ کے وقت کی لٹریری سرگذشت ہے جس میں مختلف عہد کے لٹریچر کے ساتھ لگے لپٹے واقعات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے جو کسی حیثیت سے تاریخی وقعت رکھتے ہیں، پھیلاؤ غضب کا ہے، لکھنے والا سب کچھ سمیٹتا گیا ہے، لٹریچر کی تاریخ تو اس سے پہلے بھی لکھی گئی ہے لیکن مسلمانوں کی دماغی تاریخ پر قلم اٹھانا ان اصلی ماخذوں کی چھان بین کے بعد جو یورپ کی عظیم الشان لائبریریوں میں لائق حصول ہیں، پروفیسر براؤن کا حصہ تھا، یہ نمونہ جس کی نظیر انگریزی کے سوا مغربی لٹریچر میں بھی موجود نہیں ہے، اپنی ندرت اور دلچسپی کے لحاظ سے ہر طرح پیروی کے لائق ہے لیکن شبلی کے سوا آج ملک میں اسلامی لٹریچر کے متعلق کون اس قسم کے وسیع لٹریری تحقیقات کا ساتھ دے سکتا ہے،

موجودہ دور میں پروفیسر آزاد کا نام نامی ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہے، شبلی کے دائرہ میں یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی تحقیقات کی تکمیل ایران میں جا کر کی، ان کا ایک بے نظیر رسالہ سخندانِ پارس شائع ہو چکا ہے، لیکن نہایت افسوس ہے کہ دنیا آزاد کے سرمایہ زندگی یعنی جامع اللغات فارسی سے محروم رہ گئی جس کی ترتیب ان کی عمر کا اصلی کارنامہ تھی، آزاد کی نکتہ آفرینیاں جن پر خود اہلِ ایران کو تعجب و رشک ہوتا تھا، تمام علمی دنیا کو حیرت میں ڈال دیتیں، لیکن ملک کی بدنصیبی سے ایک زبردست ماہر السنہ جیتے جی ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا، معلوم نہیں اس کے خزائنِ علمی کا ضروری حصہ اب کہاں تک لائق حصول ہے،

اسی طرح "تذکرۂ شعرائے فارسی" میں خدا جانے فرمانروائے سخن نے کیا کچھ لکھا ہوگا، لیکن ان دونوں تالیفات کے متعلق کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی، دارالاشاعت پنجاب نے ایک حد تک حقِّ رفاقت ادا کیا لیکن اب مدّت سے بالکل ساکت ہے۔

جس طرح فارسی کے صحیح ادبی مذاق کا بہت بڑا حصّہ آزاد کو ملا تھا، شبلی پر مع نئے زمانہ اُس کا خاتمہ ہوجائے گا، اس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، مَیں دیوانِ شبلی کو استشہاداً پیش کرنا چاہتا ہوں، شستہ، رفتہ، کلام کی برجستگی اپنا مرتبہ آپ بنائیگی، صاف معلوم ہوتا ہے سچے جذبات میں ڈوبا ہوا شاعر خالص اہلِ زبان ہے، جس کو ہند کی ہوا تک نہیں لگی، اساتذہ کے ہزاروں اشعار کا نوکِ زبان اور روزمرّہ اور محاورات کا ناخنوں میں ہونا اضافی امور ہیں، جن کو شبلی کی بلند پائیگی کے ثبوت میں پیش کرنا ایک مبتدیانہ فعل ہوگا، ان کا اصلی فن کچھ اور ہے "شعرالعجم" جو آج کل یہ لکھ رہے ہیں، ان کے مذاقِ سخن کی اصلی جولانگاہ ہوگی، جس میں فارسی شاعری کی محققانہ تاریخ اور فلسفۂ شاعری کے دقیق رموز پر مفصل بحث ہوگی، جس سے معلوم ہوگا کہ فارسی شاعری کی ابتداء کیا حالت تھی، پھر اس نے کیا صورت اختیار کی، کیا کیا تغیرات اور اضافے ہوئے، اور اب کس لباس میں جلوہ گر ہے۔

شاعری جیساکہ عربوں کا خیال تھا صرف کلام موزون نہیں ہے نہ شعرائے عجم کے خیال کے مطابق صرف تخییل یعنی ایک طرح کے مقدمات موہومہ کی ترتیب کا نام ہے، بلکہ جیساکہ علامہ شبلی نے خود ایک موقع پر تصریح فرمائی ہے جو چیز مدرکات انسانی میں ہمارے جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے اور ایک خاص طرح

کی موزونیت کے ساتھ مصوری اور موسیقی کی جامع ہے آج اسی پر شاعری کا اطلاق ہو
سکتا ہے، یہ بحث نہایت دلچسپ ہے جسے شبلی جو فطری شاعر ہیں، من حیث الفن
اچھی طرح سمجھائیں گے، ہم کو معلوم ہے کہ یورپ کے دو زبردست مستشرق آجکل
تاریخ فارسی لٹریچر لکھ رہے ہیں، جن میں سے پروفیسر براؤن کی بے نظیر کتاب کے
دو حصے جن کا ذکر آچکا ہے شائع ہو چکے ہیں، دوسرے صاحب ڈاکٹر ڈینی سن راس
ہیں، ان کی فارسیت کا بھی لوہا مانا جاتا ہے، مستشرقین یورپ کی ایک خاص
طرح کی وسیع النظری میں کلام نہیں، یعنی اصولِ ارتقا نے تحقیقات کے راستے
اس قدر صاف کر دیئے ہیں کہ ہر شئے کے مدارج اور طبقاتِ ترتیبی کی کڑیاں ملتی
جاتی ہیں، لٹریچر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تاہم مذاقِ سخن میں جو ایک ذوقی چیز
ہے، ان فلسفیانہ انکشافات سے کوئی مدد نہیں مل سکتی، شبلی جو کچھ لکھیں گے آشنائے
فن ہو کر لکھیں گے، اس لئے ان کی تصنیفِ موعود (شعر العجم) میرا خیال ہے،
معاصرانہ التفات سے جو حسنِ اتفاق سے ساتھ ساتھ لکھی جارہی ہیں، بالموازنہ
فائق رہے گی، بہرحال فارسی شاعری سے پروفیسر شبلی کو جو طبعی مناسبت ہے
اور آئندہ جس حد تک یہ کھل کر دادِ سخن دے سکیں گے اس کی نسبت ابھی کچھ کہنا
قبل از وقت ہے،

میں سرِدست سوانح مولانا روم کو پیش کرتا ہوں جس میں مثنوی پر مفصل تقریظ
کی گئی ہے اور جو شبلی کی طرف سے فارسی لٹریچر کے سلسلہ کی گویا پہلی قسط ہے،
مثنوی فارسی کی ان چار کتابوں میں ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں،

لیکن وہ عموماً ایک تصوف کی کتاب سمجھی جاتی ہے، جس کی نسبت عام خیال ہے کہ تمثیلی زبان میں وہ اسرارِ نہاں بیان کیے گئے ہیں جو صوفیوں میں سینہ بسینہ چلے آتے ہیں، شبلی نے بالکل ایک جدید حیثیت سے اس مثنوی پر نظر ڈالی ہے، یعنی ان کا دعویٰ ہے کہ تصوف یعنی فلسفۂ باطنی کے سوا، کلام وعقائد کی یہ بہترین تصنیف ہے جو اسلامی لٹریچر کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ تقریظ میں اس قدر شواہد بہم پہنچائے گئے ہیں کہ دعویٰ آپ اپنی دلیل ہو رہا ہے، عقائد وکلام کے جس قدر اہم مسائل ہیں، ایک ایک کر کے متفرق عنوانوں کے تحت میں لائے گئے ہیں، اور ان پر حکیمانہ استدلال کے ساتھ فاضل مؤلف نے دکھایا ہے کہ یہ تمام مسائل مثنوی سے ماخوذ ہیں، ایک ایسی کتاب میں جو سیکڑوں برس پہلے لکھی گئی اس قسم کے نکات ومعارف کا موجود ہونا جن کا انکشاف جدید سائنس صدیوں کے مسلسل مطالعۂ فطرت اور ارتقائے عقلی کے کر سکا، کہاں تک اس کی معجز بیانی ثابت کرتا ہے،

شبلی نے ایک طرف کوئی ایسی بات نہیں پیدا کی جس کی طرف خود مولانا رومؒ کا ذہن منتقل نہ ہوا ہو، اور ساتھ ہی ان مسائل کو جو مذہبی فلسفہ کی حیثیت سے مثنوی کے اعضائے رئیسہ میں تحلیل کر کے اس طرح دکھا دیا کہ ان کی صحت کا اذعان غالب ہو جاتا ہے اور یہی مسائلِ فلسفہ کی واقفیت کی آخری سرحد ہے، ان کے مقابلہ میں علامہ نذیر احمد کہاں تک ہم کو اپنے ساتھ رکھ سکیں گے جب

وہ بیسویں صدی کی ایک جدید تالیف میں دعائے صحتِ خانہ کی تلقین فرماتے ہیں، حالانکہ زائچہ کے ساتھ صحتِ خانہ کا اصلی مصداق بھی باقی نہیں رہا، اب ان کی جگہ صاف ستھرے غسلخانوں نے لے رکھی ہے،

یہ امر بھی توجہ کے لائق ہے کہ فاضل پروفیسر نے تقریظِ مثنوی میں جو نئے نئے عنوان قائم کئے ہیں اور جن کی طرف بہتوں کا ذہن اس سے پہلے منتقل نہ ہوا ہوگا، وہ زیادہ تر ایسے ہیں جن پر اس سے پہلے شبلی کی قوت صرف ہو چکی ہے، یعنی الکلام و الغزالی میں تفصیل سے ان کا ذکر آچکا ہے کسی ایسے موضوع پر جس پر ایک دفعہ زورِ طبیعت صرف ہو چکا ہو، دوبارہ اس طرح بیچ بیچ کر قلم اٹھانا کہ کہیں سے تکرار و اعادہ نہ معلوم ہو، بلکہ اصلیت کے زور کے ساتھ ہر عنوان اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل اچھوتا ہو، کمالِ انشا پردازی کی دلیل ہے فاضل شبلی نے مثنوی کی خصوصیات کو تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالی ہے جس میں تخصیص کے ساتھ لائقِ ذکر مثنوی کا طرزِ استدلال اور طریقۂ افہام ہے، یعنی مولانا نے فطرت کے سلسلہ سے استدلال کیا ہے، جو بالکل جدید سائنس کے مطابق ہے، مثنوی میں فرضی روایات و حکایات کے ضمن میں جن میں صرف نتائج سے غرض رکھی گئی ہے، اخلاقی مسائل کی تلقین کا جو طریقہ مدت سے چلا آتا تھا پروفیسر شبلی نے دکھایا ہے کہ مولانا نے اس کو کمال کے مرتبہ تک پہنچا دیا، اور چونکہ استدلال میں تمام تر قیاسِ تمثیلی سے کام لیا گیا ہے، اس لئے مسئلۂ زیرِ بحث کی واقفیت دل میں بیٹھ جاتی ہے یعنی

عموماً تشبیہات و تمثیلات کے پیرایہ میں اس قسم کے قرائن پیش کئے جاتے ہیں، جن سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی جو صورت بیان کی گئی ہے، زیادہ تر قرینِ عقل ہے جس سے ایک خاص طرح کی وجدانی کیفیت دل میں پیدا ہو جاتی ہے جو استقراءِ منطقی سے نہیں ہو سکتی اور جس کو تصوف کی اصطلاح میں ہم اطمینانِ ذوقی کہہ سکتے ہیں، مختصر یہ کہ مثنوی معنوی میں عارفِ روم نے جس طرح دادِ سخن دی ہے، اس پر تنقیداً کچھ رائے زنی کرنا میرا منصب نہیں ہے نہ صرف تقریظ پر تقریظ کرنی چاہتا ہوں، یعنی مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ شبلی نے انتقادی حیثیت سے کہاں تک اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کی، اس کیلئے جو کچھ عرض کیا گیا اس کے ساتھ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کتاب کو ایک نظر دیکھ لیجئے وہ اپنا درجہ آپ بتائے گی لیکن آخر میں اتنا کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ الٰہیات کے ضمن میں توحید، نبوت، معجزہ، جبر و قدر، روح، معاد وغیرہ پر جن سلجھے ہوئے اور پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، اور موجوداتِ عالم یعنی مادیات اور مجردات کی نازک تفریق اور اس پر منطقی اور فلسفیانہ تفریعات جس لطافت سے کی گئی ہیں انتقاد کی جان ہیں، ہمارے ہاں ردّیات تو بہت ہیں لیکن اس طرح علومِ قدیمہ و جدیدہ کو ترکیب دے کر کسی نے ست یعنی جوہر نہیں نکالا ہے، صرف فاضل پروفیسر کا حصہ تھا،

تصوف جیسا کہ اکثروں کا خیال ہے ایک طرح کا "خبط متعارف" نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ علامہ شبلی نے تصریح فرمائی ہے دراصل تصحیحِ خیال کا نام ہے جو اخلاق

کی طرح فلسفہ کی ایک مستقل شاخ ہے، لیکن جس طرح توکل کا مصداق ایک طرح کی گداگری ہو رہا ہے، تصوف کی صورت بھی اتنی بگڑ گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیٹ کا ایک مشغلہ رہ گیا ہے، لیکن شبلی نے تصوف پر علمی حیثیت سے نگاہ ڈالی ہے، جس سے ہم یہ سمجھ سکے کہ ذوقی اور وجدانی کیفیت کے ساتھ اس میں ادبی پہلو بھی موجود ہے، یہ بات ذرا دل لگتی یعنی اس گروہ کے مذاق سے ملتی جلتی چیز ہے جو اس کوچہ سے نابلد ہے،

تصوّف کی مفصل تاریخ اور اس کے لفظی اشتقاق و اطلاق کی بحث جس کے متعلق علمائے یورپ اب بھی غلطی کر رہے ہیں "الغزالی" میں مستقل عنوان سے آ چکی ہے، ناظرین اسے اٹھا کر پھر ایک نظر دیکھ لیں، تقریظ مثنوی میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اختصار کے ساتھ ہے لیکن "شریعت" کے ساتھ "طریقت" و "حقیقت" سے جو پردہ اٹھایا گیا ہے اور حدود و اقلیدس کی طرح ان اصطلاحات کی جس قدر جامع و مانع تعریف کی گئی ہے وہ بجائے خود ایک چیز ہے اور ضرورت ہے کہ ان کے اطلاقات معناً ہماری روزانہ زندگی کا ایک جزو ہو جائیں،

میرا خیال ہے اب مجھے کچھ اور کہنا نہیں ہے، ہاں ایک بات رہ گئی، کتاب کے ختم کر لینے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ مولانا روم کے کلام کا جس قدر استقصا کیا گیا ہے کچھ اس سے زیادہ ہونا تھا، لیکن میری رائے اس لئے لائق وثوق نہیں ہے کہ میں چونکہ شبلی کے عالمانہ لٹریچر کا دلدادہ ہوں، پہلی بار پڑھتے وقت نظم کا حصہ چھوڑتا گیا تھا، یہ اضطراری حرکت اوروں نے بھی کی ہوگی، یورپ کے مذاق کے

مطابق پوری مثنوی یا اس کے حصۂ غالب کو ضمیمہ کی حیثیت سے کتاب کا جزو ہوتا
تھا لیکن ملک کا ادبی مذاق اس قدر گرا ہوا ہے کہ یہ خیال مشکل سے توجہ کے
لائق ہے، اس کے سوا تنقیدی حیثیت سے کلام کے جن اجزا پر ریویو کی ضرورت
تھی ہر قسم کے نمونے لے لئے گئے ہیں اور بیاگرافر کا صرف اتنا ہی فرض تھا،

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چونکہ لٹریچر کا لطف اور اس کی دلچسپیاں انسان کی
اخلاقی اور ادبی ترقی کی ممد ہوتی ہیں، ہم علامہ شبلی کے ممنون ہیں کہ ہم کو جلد جلد
ان کے دماغی اکتشافات سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے، اور ہماری
دلی خواہش ہے کہ موجودہ کتاب ان کی تصنیفاتِ موعود کا صرف پیشرو ہوگی،

آجکل کی کاروباری زندگی میں جب ہم کو مشرقی لٹریچر کی طرف توجہ کرنے کی بالکل فرصت
نہیں ہے، صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ عربی فارسی لٹریچر کے بہترین اجزاء عالمانہ تنقید و تقریظ
کے ساتھ نئی نسل کے سامنے پیش کئے جائیں، اس طرح لٹریچر کا وہ حصہ جو جاننے کے لائق ہے
ہمیشہ کیلئے محفوظ رہ جائیگا، ملک میں ناقص لٹریچر کی مقدار اس قدر بڑھ رہی ہے کہ ضرورت ہے
جواہرات کنکر پتھر سے علیحدہ کر لئے جائیں، حکما نے انتخاب کے کچھ قاعدے بتائے ہیں جنہیں لارڈ بیکن کا
خیال بہت ہی چبھتا ہوا ہے، وہ کہتا ہے بعض کتابیں صرف چکھنے کے لائق ہیں، کچھ نگلنے کے اور
تھوڑی ایسی ہیں جو چبانے اور ہضم کرنے کی ہیں، شرر کے ناول پہلی شق میں ہیں، دل راش میں چند
منٹ محض ذائقۂ علمی کے لئے نگلنے کے لائق وہ تصنیفات ہیں جو کم سے کم ایک دفعہ پڑھی جائیں،
(نام نہیں لونگا، اوسیانع ہی) مگر چبانے اور ہضم کرنے کے لائق مجموعۂ غیر فانی یعنی "تالیفاتِ شبلی"
ہیں جنہیں مولانا روم کی لائف ترتیباً آخر ہے لیکن بہ لحاظ اوصاف کسی سے پیچھے نہیں ہے،

(البشیر ۱۹۰۶ء)

افاداتِ وان کریمر

متعلق

تمدّنِ اسلام

(۱)

مسٹر صلاح الدین (خدابخش) ایم، اے بیرسٹرایٹ لا نے تاریخ الاسلام کے متعلق انگریزی میں ایک مجموعۂ رسائل شائع کیا ہے جس میں جرمنی کے نامور مورّخ وان کریمر کی ایک بے مثل اور جامع تالیت کا ترجمہ خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے، وان کریمر کی نسبت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عربی دان تھا یا نہیں ہے تاہم چونکہ مسلمانوں کی تمام قدیم اور نایاب تاریخی تصنیفات قریب قریب ترجمہ کے ذریعہ سے یورپین زبانوں میں منتقل ہوگئی ہیں، یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ وان کریمر نے جو کچھ لکھا ہے اوّل درجہ کے ماخذوں سے لکھا ہے، اس نے متعدد کتابیں متعلقاتِ اسلام پر جرمن زبانوں میں لکھی ہیں، اور آج یورپ میں اس حد تک اس کی تحقیقات کا لوہا مانا جاتا ہے کہ بڑے بڑے فاضل اور پروفیسر بھی اس کی تحقیقات کے نتائج سے بے نیاز نہیں رہ سکتے، اور ادبی (لٹریری) گروہ میں یہ ایک رواج سا ہوگیا ہے کہ اشتہاداً جہاں جہاں کھپت ممکن ہوتی ہے، اس کے خیالات سے جدید

تالیفات کی وقعت بڑھائی جاتی ہے،

بہرحال جس تالیف کے اقتباسات اس وقت پیش کرتے ہیں، اس کا موضوع خاص یہ ہے کہ اسلام نے دوسرے مذاہب سے کہاں تک فائدہ اٹھایا؟ وان کریمر نے اسلام پر ایک ارتقائی نظر ڈالی ہے اور دکھایا ہے کہ اس کی ترکیب اور ساخت میں دوسرے مذاہب کا کتنا حصّہ ہے؟ یعنی یہودی، عیسائی، پارسی اور مانوی مذاہب نے کس حد تک "دنیا کے سب سے نو عمر مذہب" پر اثر ڈالا ہے، یہ بحث نہایت دلچسپ ہے اور آج کل کے محققین کا خیال ہے کہ یہ رسالہ مختص الموضوع اپنی جامعیت اور محققانہ تلاش کے لحاظ سے اس کی اور تالیف میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے، جس میں امورِ زیر بحث کا ایک طرفہ فیصلہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ جو کچھ ہے خالص عالمانہ نکتہ سنجی کا نتیجہ ہے، وان کریمر کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ صرف تاریخی راز کی پردہ دری کرنے والا ہے، کسی خاص فرقہ کا نقیب نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ حق کی تلاش کے سوا اس کی خامہ فرسائی کی کوئی غایت نہیں ہے، اس نے صرف مذہبی مباحث تک اپنی توجہ محدود نہیں رکھی، بلکہ نہایت بیدار مغزی سے مسلمانوں کی معاشرت پر بھی ساتھ ساتھ نظر ڈالی ہے، یعنی جہاں اس نے مختلف اسلامی فرقوں کی ابتدا اور ان کی نشو و نما کی جزئیات دکھائی ہیں، اگلے پچھلے مسلمانوں کی معاشرت کا خاکہ بھی کھینچتا گیا ہے، اس سے ان کے تدریجی تغیرات کا سراغ ملتا ہے، جن سے ایک قدامت پسند صحرائی گروہ کی کایا پلٹ ہوگئی، اور عرب کے سیدھے سادھے نظامات زندگی کی جگہ رفتہ

رفتہ رُومیوں اور عجمیوں کی شائستگی گھر گھر پھیل گئی،

پچاس برس ہوئے مجموعۂ تصنیفات عالم وجود میں آیا لیکن باوصف اس غیر منقطع تحریک کے جو مشرقی تحقیقات کے متعلق یورپ میں جاری ہے (یہ کتاب ایک زبردست مستشرق کی بہترین یادگار ہے جو بلحاظ نوعیت اب بھی بینظیر سمجھی جاتی ہے) لائق مترجم کے مفصّل دیباچہ اور انکے تاریخی انتقادات پر آیندہ نظر ڈالی جائیگی، سردست یہ چند سطریں غالباً تالیف زیر بحث کی تقریب کے لئے کافی ہیں، اصل اقتباسات شروع کرنے سے پہلے یہ بتادینا ضروری ہے کہ اس امر کا فیصلہ علامہ شبلی نعمانی فرمائیں گے کہ اسلام کے مؤثرات میں مذاہب غیر اور خاصکر عیسائیت کو جس حد تک وان کریمر نے پیش رکھا ہے یہ جذبہ تحقیق کہاں تک اعتدال سے بڑھا ہوا ہے اور فاضل مؤرخ کو اپنے فلسفیانہ اجتہادات اور نتائج استقرائی میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے،

تمدّنِ اِسلام

میرا ارادہ تھا کہ اپنی ایک جدید تصنیف کے اخیر میں اسلام کی تاریخ تمدّن کے چند منتخب اور ضروری مضامین ضمیمہ کی حیثیت سے بڑھا دوں، میں بالتخصیص ان مضامین کو یکجا کرنا چاہتا تھا، جس سے عرب کے مذہب و اخلاق پر بیرونی اثر کا اندازہ ممکن ہو، لیکن اس انتخاب کے سلسلہ میں میں نے معلوم نہیں کہاں کہاں سے ریزہ چینی کی، جس سے بڑھتے بڑھتے ایک پاکیزہ مرقع تیار ہوگیا اور میری شگفتگی یہاں تک بڑھی کہ اُسے ایک مستقل وجود کی حیثیت سے پیش کرنے کا خیال

راسخ ہوگیا، میرا مخاطبِ صحیح، گو دراصل میرا ہم مشرب اور ایک محدود حلقۂ مستشرقین ہے تاہم یہ پیرایۂ بیان، معلوماتِ مشرقی کے صرف ایک خشک مجموعہ کے مقابلہ میں ہر طرح لائقِ ترجیح ہوگا، موجودہ تالیف میری گذشتہ تصنیفات سے نسبتِ قریبہ رکھتی ہے، کیونکہ یہ اُن کے مضامین کی متمم اور شارح ہے، مجھے اپنے سلسلۂ انکشافات میں اگر یہ معلوم ہوتا کہ میری قائم کردہ رائے غیر صحیح ہے تو میں اپنی غلطی کے علانیہ اعتراف اور اس سے دست بردار ہونے سے بالکل نہ شرماتا، لیکن یہ صورت پیش نہ آئی، بلکہ مقدماتِ ذہنی اور دل میں جمتے گئے، تاہم ابھی بہت کچھ ٹوہ لگانی ہے، اسلام کے ساتھ اس کے سیاسی نظامات کو اچھی طرح سمجھنے بوجھنے کے لئے (جو اسلام کی بنا پر قائم ہوئے اور جو ہزاروں برس تک اسلامی ہیئت الاجتماعیہ یعنی سوسائٹی کا سنگِ بنیاد ہے) ہم کو سائنس کی اور شاخوں کی طرح سے بھی منطقی حیثیت سے جانچنا اور جزئیات سے کلیات کا استقرا کرنا ہوگا،

اسلام کی عمارت گذشتہ تمدنوں کے کھنڈر پر اٹھائی گئی ہے، اس نے پرانے عناصر کو اپنے ساتھ مخلوط کر لیا، کچھ ان کی صورت بدلی، کچھ اپنی طرف سے جدید اضافے کئے، ان اجزائے ترکیبی کی تحلیل و ترتیب اور ان کے باطنی تعلقات و روابط کی تنقیح اس آزاد اور غیر طرفدار علم کا کام ہے، جو صرف سچائی کا حامی ہے لیکن مشرقی مذاہب اور تمدنوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں بعض اوقات ان مختلف الجنس اجزا میں تمیز کرنا (جو پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں اور جو باہم ایک دوسرے کو مسخ اور کبھی بالکل بدل دیتے ہیں) اور ان کی اصلیت کا ٹھیک پتہ لگانا بہت

مشکل ہوتا ہے، گو بادی النظر میں ایسا معلوم نہیں ہوتا،

مغربی ایشیا میں مذہبی ایجادات کی بھرمار رہی ہے، اس میں چار عظیم الشان مذاہب نے جنم لیا اور ایسی زمین سے بیشمار مذہبی فرقے، فلسفیانہ نظامات اور مذہبی قانون قاعدے پیدا ہوئے، یہیں سے مذہبی خیالات کے زبردست تموج سے وہ چشمہ ہائے رواں نکلے جن سے دنیائے "تاریخی" سیراب ہوگئی، یعنی یہودی، پارسی، عیسائی اور اسلام جن میں سے ہر مذہب نے انسانی خیالات اور احساسات میں ایک قومی تحریک پیدا کردی، یہ ایک عجیب بات ہے جس سے ظاہرا ایک خوش ترتیب نظم اور باقاعدگی کا وجود پایا جاتا ہے کہ یہ مذاہب یکے بعد دیگرے مقررہ فصل کے ساتھ وجود پذیر ہوتے گئے، یعنی حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ سے ۱۵ سو برس پہلے، زرتشت ۶ سو برس قبل مسیح، اور آنحضرت صلعم بعد مسیح ۶ سو برس بعد دنیا میں آئے، ان درمیانی وقفوں میں جانے کتنے مذہبی گھروندے بنتے بگڑتے رہے، بعضوں کے فنا کرنے والے اجرام (جراثیم) ساتھ پیدا ہوئے تھے، بعض ایسے تھے جو پھولے پھلے اور آیندہ نسلوں کے لئے ان سے قلمیں لی گئیں،

مشرقی تمدن طبقاتِ مختلفہ کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے متعدد تہیں تلے اوپر جمائی ہوئی ہوں جس میں ایک طرح کی ہیئتِ مجموعی پائی جاتی ہے، یہ اتصال آسانی سے اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ تمام بڑے ایشیائی مذاہب اس حد تک ہیئتِ متماثلہ اور خاندانی مشابہت رکھتے ہیں جس سے قریب قریب یہ خیال مستحکم سا ہوگیا ہے کہ بانیانِ مذاہب کا وجود صرف مغربی ایشیا کے معتدل

خطّہ کے لیئے گویا مخصوص تھا ہم قریب قریب اس کلیہ کے تسلیم کر لینے کی طرف مائل ہیں کہ شمالی عرب، فلسطین، عراق، عرب اور فارس کی وادئ مرتفع کے طبعی خواص جو لازماً متحد ہیں، ان کی ایک جھلک ان ملکوں کے رہنے والوں کی دماغی استعداد اور خاصکر مذہبی حسیات میں بھی پائی جاتی ہے، یعنی جس طرح ان ممالک کے رنگ روپ مقامی اور ایک ساں ہیں، دماغی مخلوقات میں بھی اسی امتیاز کا پتہ چلتا ہے، پارسیوں کی مقدس کتابوں میں بہتیری باتیں ہیں جو انجیل کو یاد دلاتی ہیں، اسی طرح عیسائیوں اور مسلمانوں کے آسمانی صحیفوں میں بھی ایک طرح کی مماثلت قریبہ ہے،

صحرائے عرب پر ایک نگاہ دوڑائیے تو جس چیز سے آپ دفعۃً پہلے پہل متاثر ہوں گے وہ مخلوقات کے رنگ کی حیرت انگیز ہم طرحی ہوگی، ارضِ صحرائی کے ساتھ نباتی، حیوانی بلکہ انسانی مخلوقات بھی غیر مستقل رہت کے مائل بہ زردی باریک ذرات کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے جس سے آفتاب کی چمکتی ہوئی شعاع میں آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں، غزالہ عربی جو صحرائی بگولوں کے ساتھ اڑتا پھرتا ہے، اس کی گہری زعفرانی جلد میں زمین کے رنگ سے کتنی ملتی جلتی ہے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے، یہی حال "جہازِ صحرا" یعنی اونٹ اور اسکے کلغی دار "برادرِ نصف" شتر مرغ کا ہے، چند چھوٹے سوکھے ساکھے خار دار درخت جو کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں وہ بھی خاک آلودہ ہوتے ہیں، ذرا خالص الاصل بدوی کی جلد اور اسکے لباس کو دیکھئے کس قدر آس پاس کے آثار و کیفیات سے ملتا جلتا ہے کہ غیر عادی

نگاہ تھوڑے فاصلے سے بھی وہاں کی خاک اور ان چیزوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کرسکتی لیکن جس طرح یہاں کے باشندوں کے طبعی حالات اور خصائص میں باہم ایک چبھتی ہوئی مطابقت ہے، یہی مناسبت مادی اشیاء سے گذر کر ان چیزوں میں پائی جاتی ہے جو دماغی اور اخلاقی ہیں، یہ موزونیت متحد الاصل طبعی اسباب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ہزار ہا سال کے روابط و تبادلۂ خیالات کا نتیجہ ہے، جو مغربی ایشیاء کی سامی اور آریا قوموں میں ہوتا رہا، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ فرداً فرداً ہر مذہب کے نظامات کی جانچ اور ان اجزاء کی تحلیل جن میں مختصاتِ مذہب کے ساتھ کچھ خارجی عناصر بھی ہیں کس قدر مشکل ہے،

اس زمانۂ تحقیق سے اس قسم کے موضوعاتِ غیر مثبتہ سے کام نہیں چلنے کا کہ تمام مذاہب کسی ایک ہی درخت کے پھول پتے اور دنیا کے قدیم سے قدیم صحیفے یعنی وید سے ماخوذ ہیں، جس طرح ہم یہ نہیں مان سکتے کہ توحید ہمیشہ سے صرف سامیوں کے حصہ میں تھی، کیونکہ یہ مسلمات ایک طرف، سائنس کے مصرف کے نہیں ہیں،

قبل اس کے کہ تجزیۂ عناصر سے اس قسم کے کلیات کا استخراج ممکن ہو، ہم کو پہلے خاص خاص امور کے متعلق وسیع اور دقیق تحقیقات کرنی ہوگی، اور سائنٹفک تحقیقات بتدریج ہم کو اس شاہراہ پر ڈال دے گی جہاں سے منزلِ مقصود چنداں دور نہیں جس میں سب سے مقدم اصولِ استقرائی کا استعمال ہے، اسلام یعنی پیغمبر مکہ کا مذہب نسبتۂ کم تر مشکلات پیدا کرتا ہے، یہ تمام مذاہب میں کم عمر ہے اور اسکی اصلیت کے متعلق بہتیری دستاویزات مصدقہ لائقِ حصول ہیں جن سے ہم اُسکے آغاز و نشو و نما

کی تدریجی رفتار کا پتہ لگا سکتے ہیں، اسلام نے بہت کچھ مذاہب یہود و نصاریٰ اور زرتشت سے اخذ کیا ہے اور غالباً مذہبِ مانوی سے بھی مستغنی نہیں ہے، اس نے پارسیوں سے بالذات اور بالواسطہ دونوں طرح فائدہ اٹھایا ہے، بہتیرے زرتشتی عقائد اسلام میں کتبِ یہود خاصکر تلمود کی طرف سے داخل ہوئے، عقیدۂ حشر و نشر، بہشت و دوزخ کے متعلق اکثر روایات اور شیاطین وغیرہ کے متعلق جس قدر جزئیات قرآن میں موجود ہیں تمام و کمال مذہب یہود کا عطیہ ہیں، اسی[1] طرح عذابِ قبر اور تصریحاتِ متعلقہ منکر نکیر یہودیوں سے لی گئی ہیں، پُل صراط کا خیال جو بال سے زیادہ باریک ہے اور قعرِ جہنم سے ہوتا ہوا بہشت کو گیا ہے، قطعاً پارسیوں سے ماخوذ ہے، جو مدرنش کے ذریعہ سے قرآن[2] تک پہنچا ہے لیکن اسلام نے براہِ راست بھی زرتشت سے اخذ کرنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے، یہ ایک قطعی امر ہے کہ "دین" کا لفظ جو متواتر قرآن میں آیا ہے، پارسی کتابوں سے لیا گیا ہے[3]، ہوزورش میں بہ لفظ بعینہ اسی ہیئت سے پایا جاتا ہے ۱۲

شعائرِ مذہبی کی نسبت اس قدر صاف اور طے شدہ ہے کہ طواف اور حج کعبہ کے تمام ارکان اسلام میں قریب قریب بغیر کسی تصرف کے وہی چلے آتے ہیں جو ایامِ جاہلیت سے پہلے تھے، یعنی کعبہ کی تمام رسومات وہی ہیں جو ۱۵ سو برس پیشتر

---

[1] عذاب منکر نکیر کے متعلق ایک حرف بھی قرآن مجید میں مذکور نہیں ۱۲ [2] قرآن مجید میں پل صراط کا نام و نشان بھی نہیں، [3] توافق السنہ کی دوسری بات ہے ورنہ دین کا لفظ عربی زبان میں اسلام سے بہت پہلے موجود تھا، اور دین کے موجودہ معنی اس کے سکنڈری معنی ہیں، ۱۲

تھیں، تھوڑا عرصہ ہوا کہ ایک مکّی نے جو بیروت سے مصر تک جہاز میں میرا ہمسفر تھا مجھ سے کہا کہ "نحن اولاد الشمس وخدّا مین الحرام" اور یہ صحیح ہے کہ ایّام جاہلیت کے خیال کے مطابق آج بھی اہل مکہ اپنے کو خادم حرم سمجھتے ہیں، حج کعبہ کی ابتدا کا سراغ جیسا کہ خوب معلوم ہے قدامت بعیدہ میں ملے گا، جو لوگ طواف کعبہ کرتے تھے ان کو جاہلیّت کی رسم کے مطابق برہنہ ہونا پڑتا تھا، عورتیں بھی بلا استثنا لباس عریانی میں ہوتی تھیں، غرض زائرین کو سات مرتبہ کعبہ کے گرد چکّر لگانا ہوتا تھا، قریش تنہا لباس کے رکھنے اور اجنبی زائرین کو مستعار دینے کے مجاز تھے، جس سے اچھی خاصی تجارت پیدا ہوگئی،

آنحضرت (صلعم) نے جو کچھ تغیّر کی حیثیت سے اضافہ کیا وہ زائرین کے لئے لباس مخصوص یعنی دو چادریں تھیں جن میں سے ایک زیر کمر لپیٹی جاتی تھی اور دوسری شانہ اور سینہ پر پڑی رہتی تھی، لیکن سر کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا کیونکہ قدیم الایّام میں بالوں کو ایک لسدار شئے کی مدد سے "وگ" کی قطع کا بنا رکھتے تھے، آج بھی حاجیوں کا لباس مجوزہ یہی ہے، زیارت کعبہ کے بعد جاہلیت میں یہ بھی رسم تھی کہ وہ صفا و مروہ کو جایا کرتے تھے جہاں دو بُت بھی رکھے ہوئے تھے، آنحضرت (صلعم) نے رسم جاہلیت کی یہاں تک رعایت کی کہ صفا و مروہ کا جانا بدستور قائم رکھا،[1] صرف یہ کیا کہ بُت ہٹا دیئے، ارکان نماز، سجدے، وضو اور روزے کی تاریخ کا جہاں تک

---

[1] صفا و مروہ کی رسوم حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے ہیں، بت انکے بعد قائم کئے گئے، اسلئے آنحضرت (صلعم) نے صفا و مروہ کی رسوم قائم کرنے میں حضرت ابراہیمؑ کی تقلید کی ہے نہ جاہلیت کی،

تعلق ہے ہماری معلومات ایک حد تک غیر متعین، مذبذب اور بالائی ہیں، روزۂ عاشورہ آنحضرت (صلعم) سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن رمضان کے روزے کرسچین لینٹ سے ماخوذ ہیں، وضو و سجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالاشتراک یہود و نصاریٰ یا فرقۂ مانویہ سے لئے گئے، جس طرح بانیٔ مذہب عربی نے مختلف ماخذوں سے فائدہ اٹھایا، اسلام نے آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد اس زمانہ میں بھی جب تکمیل کی حیثیت سے مذہب میں ایک طرح کا "انجماد" پیدا ہو گیا تھا، اصولِ آخذہ کو بدستور جاری رکھا، مثلاً واقعۂ معراج کو لیجیے جس کا کچھ یونہی سا[1] اشارہ قرآن میں پایا جاتا ہے، سنہ ہجری کی پہلی ہی صدی میں اس پر شاعرانہ رنگ چڑھ چکا تھا اور رفتہ رفتہ یہ اسلامی عقائد کا ایک جزو غیر منفک ہو گیا، اس واقعہ کی بنیاد عیسائیوں کی ایک معتبر روایت یعنی پیغمبر اشعیاء کے سفرِ آسمانی پر رکھی گئی ہے، یہ اس وقت گھڑی گئی تھی جب شہنشاہ نیرو کے ظلم و تعدی سے عیسائی بالعموم نالاں ہو رہے تھے، پارسیوں سے غالباً بتوسط یہود یہ روایت پہنچی کہ حشر کے روز موت ایک مینڈھے کی صورت میں ذبح کی جائے گی، اور اسکے بعد انسان دائمی زندگی سے لطف اٹھائے گا، یہ خیال باحتمالِ غالب پارسیوں کے اس قصہ سے ماخوذ ہے جو تلمود میں "ہار اوبن کے بیل" کے متعلق موجود ہے[2]۔

بیرونی اثرات کا احساس مذہبی دائرہ کے سوا معاشرت اور مسلمانوں کے

---

[1] یونہی تو نہیں صاف تصریح ہے لیکن وہ درحقیقت ایک خواب تھا جیسا کہ احادیث سے بھی واضح ثابت ہوتا ہے۔

[2] ہم احادیث کے ذمہ دار نہیں ہیں لیکن قرآن مجید میں اس قصہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

سیاسی نظامات میں بھی ہوتا ہے جن پہ بالتخصیص مستقل اور گہرا نقش پڑا ہے، گو عربی
دماغ نے دعویٰ خود سری اور قوتِ خلاقیہ کے اظہار سے قاصر نہیں رہا، مثلاً عمرؓ
کا سیاسی نظام جو مساوات و اخوتِ عامہ پر مبنی ہے، تاریخ کا ایک عظیم الشان اور
عجیب و غریب منظر ہے اور عہدِ سلف اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کرسکتا ہے، تمام
مسلمان کامل مساوی حقوق رکھتے تھے اور کل مداخلِ سلطنت معہ اراضیاتِ مفتوحہ
اسلامی جماعت کی ملک عام تھیں، یہاں تک کہ اخوتِ اسلامیہ کے ہر فرد کو خزانۂ
عامرہ سے سالانہ ایک وظیفہ مقررہ ملتا تھا، عربوں کو حصولِ جائداد اراضی اور زراعت
کرنے کی اجازت نہیں تھی، وہ صرف ایک فوجی جماعت تھی اور یہ مفتوحہ اقوام کا
فرض تھا کہ وہ کھیتوں کو جوتیں بوئیں اور سامان رسد پہنچاتے رہیں،

لیکن باوجود اس کے کہ حضرت عمرؓ میں سیاسی حیثیت سے ایک طرح کی
اجتہادی قوت اور آزادی تھی، انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہر محکمہ کیلئے بہتر سے
عجمی اور رومی آئین سلطنت کو پسند کرکے رواج دیا، مثلاً نقود یعنی سکوں کا رواج،
صوبہ جات کی عاملانہ تقسیم، ٹیکس کے سلسلہ میں جزیہ اور خراج کی تعیین یہ سب گویا
ان کے تقلیدی اجتہادات تھے ٹیکس جائداد (جو ٹیکس غربا کے نام سے بھی مشہور
ہے کیونکہ شروع شروع اس محصول کے محاصل غریب مسلمانوں میں صدقات، زکوٰۃ،
عشر کے نام سے تقسیم ہوتے تھے) ایک ایسا نظام ہے جو قدیم سے قدیم زمانہ میں
کنعانیوں اور اہلِ فینیشیہ اور کارتھیج والوں کے ہاں پیشوایانِ مذہبی کی امداد کے لئے
"محصولِ دیوتا" کے نام سے وصول کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ الفاظ "صدقہ" اور "زکوٰۃ"

یہودیوں کے روزمرہ سے لئے گئے ہیں، یہانتک کہ دفترِ خراج کے لئے جو لفظ تھا اور جس کا اطلاق بعد میں حکومت کے تمام دفتروں پر ہونے لگا، یعنی "دیوان" یہ بھی آرامی یعنی فلسطین کے شمال مشرقی خطہ کی زبان کا لفظ ہے، کیونکہ خلیفۂ ثانی نے مفتوحہ ممالک میں اس محکمہ کو جس طرح پایا تھا بغیر کسی قسم کے تغیر کے بحال خود رہنے دیا، اور اسے اپنی ضروریات کے لئے نافع بنالیا،

فوجی امور میں عربوں نے بہت کچھ عجمیوں سے لیا، لیکن اس قدر یقینی ہے کہ حضرت عمرؓ کے بعد ابتداءً ان کا طریقِ جنگ بالکل بدوی فرقوں سے ملتا جلتا تھا، لیکن بہت جلد وہ ایک عمدہ نیز فوجی تنظیم کے فوائد سے آگاہ ہوگئے، خلفائے امیہ نے اس صیغہ پہ خاص توجہ کی، رومیوں کے تمام ضروری آئینِ جنگ اختیار کرلئے جن سے شہنشاہانِ مشرق کی لڑائی میں انہوں نے واقفیت حاصل کی تھی، فوجی مستقل چھاؤنیوں کا دستور اوائل ہی میں جاری ہوگیا تھا، رومیوں کی طرح عرب جنرل بھی روزانہ کوچ کے بعد جہاں اپنے خیمے نصب کرتے تھے، خندقوں اور حصاروں سے ان کی مورچہ بندی کرلیتے تھے، پہلے عربوں کا قاعدہ تھا کہ نماز کی سی سیدھی صفوں میں ہوکر لڑتے تھے، پھر تعبیہ کی حیثیت سے انہوں نے صف آرائی شروع کی یعنی ایک مربع کی شکل اختیار کی جسے یونانی زبان میں کرادلیس کہتے ہیں، فوج کی صف آرائی بیشتر قبیلہ دار ہوتی تھی، پھر بلا امتیازِ قبائل فوجی حیثیت سے اس کے علیحدہ علیحدہ دستے کردیئے گئے، ہر دس آدمی پر ایک افسر ہوتا تھا، جسے عریف کہتے تھے، پچاس۵۰ پر ایک خلیفہ اور سو۱۰۰ سپاہیوں پر ایک قائد ہوتا تھا، سب سے قدیم طریقۂ صف آرائی یہ تھا کہ فوج

کی ترتیب میمنہ، میسرہ اور قلب الجیش کے لحاظ سے ہوتی تھی، بعد میں مقدمہ اور ساقہ کا اضافہ ہوا، رومیوں کے اثر کا اس سے بھی زیادہ تر اندازہ ان آلاتِ حرب سے ہوتا ہے جن کو عرب محاصرہ کے وقت استعمال کرتے تھے یعنی منجنیق یا عرادہ یہ ایک آلہ حاذف تھا، جو قلعہ شکنی کے کام میں لایا جاتا تھا، کبش سے حصار کو منہدم کرتے تھے اور دبابہ کی پناہ میں محاصرین شہر پناہ تک پہنچ جاتے تھے،)

چونکہ میرا قصد ہے کہ دوسرے موقع پر تفصیل کے ساتھ خلافت کے فوجی نظام سے بحث کروں، اس لئے میں اس کتاب میں جزئیاتِ متعلق کی تصریح زائد سے دست کش ہوتا ہوں، میں نے اس بحث کو اس لئے چھیڑا ہے کہ ان واقعات کی طرف اوروں کی توجہ مائل کرسکوں اور یہ دکھا سکوں کہ محققانہ تفتیش و تلاش کیلئے کس قدر وسیع اور نتیجہ خیز جولانگاہ موجود ہے، ہم کو آیندہ پورے طور پر ٹھنڈے دل سے ان واقعات پر نظر ڈالنی ہوگی جن سے اسلامی تمدن کی تاریخ کی عقدہ کشائی ہوتی ہے اور صرف اسی طریقہ سے ہم ان دلچسپ اور اہم مسائل کی نسبت تیقن کی حالت پیدا کرسکیں گے، آج ایک محقق جیالوجی جس طرح مختلف طبقاتِ ارضی کی ترتیب سے اشیاء مدفون کے زمانہ کی تعین کرسکتا ہے، یا جس طرح ایک ماہرِ السنہ قطعیت کے ساتھ یہ بتا سکتا ہے کہ کسی زبان کے اجزاء میں قدرتی حصہ کے ساتھ باہر کی بیل کتنا ہے، ہم کو بھی کوشش کرکے اپنے تاریخی فن کو اسی سطحِ ارتقائی پر لانا ہے، اسلام کی مذہبی اور تمدنی تاریخ، اگر ہم اسکے وطنی اور بیرونی عناصر کا تجزیہ کریں تو وہ جس قسم کا امید افزا اور صحیح منظر ہمارے سامنے پیش کریگی وہ اس سے بالکل مختلف ہوگا

جو آجتک ہمارے خیال میں رہا ہے، اسلئے میں نے تاریخ اسلام کی ان ہی خصوصیات کو اُبھار کر دکھایا ہے جنہیں بیرونی اثرات زیادہ تر محسوس ہوتے ہیں اور جنہیں قدیم تر تمدنوں کے باقیات الصالحات نے گرد روزگار میں ملنے کے بعد بھی مٹے مٹے نقش یا چھوڑے ہیں اس طرح سطح کاغذ پر گویا ایک قسم کی پچیکاری ہو گئی ہے گو سچ یہ ہے کہ جو مرقع میں نے اس رسالہ کی مختصر وسعت میں کھینچنا چاہا ہے، بہتیری حیثیتوں سے وہ مشکل کامل کہا جا سکتا ہے، میں نے صرف دورِ خلافت تک اپنی تحقیقات محدود رکھی ہے اور ارتقاء مذہبی کیساتھ اُن معاشرتی تغیرات کے دکھانے کی بھی کوشش کی ہے جو بیرونی اثرات سے وقوع میں آئے،

نزولِ قرآن کی تاریخ کے متعلق ڈاکٹر اسپرنگر نے مفصل بحث کی ہے، اسلئے میں اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کرنا نہیں چاہتا لیکن مختصراً میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس امر کے اظہار کیلئے کافی ہے کہ جس حد تک چاہئے یہ بحث پورے طور پر طے نہیں ہوئی، کتب یہود اور زرتشت کا مطالعہ اگر بالموازنہ نہ کیا جائے اور عیسائیوں کے ابتدائی لٹریچر کیساتھ فرقہ ہائے عیسوی اور یہود کی تاریخوں پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو میرا خیال ہے بڑے بڑے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، میرا موضوع بحث آئندہ زمانہ میں ایک مدت تک خلافت کا عروج و زوال ہوگا اور میں یہ امید کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کے رسالہ محقق الموضوع کے ذریعہ سے جو ایک محدود حلقۂ علما کے مذاق کی چیز ہوگا مشرقی زندگی کے دائرہ میں نئے سرے سے ایک طرح کی دلچسپی پیدا ہو جائیگی اور اس زمانہ کی وسیع واقفیت کے شوق کو ترقی ہوگی،

یہ کہنا غالباً تحصیل حاصل ہے کہ اسلام کی پوری سیاسی تاریخ لازماً اس وقت تک عسیر الفہم اور پس پردہ رہے گی جبتک تمدنی تاریخ اس سے علیحدہ لکھی جائے گی،

(رسالہ تمدن دسمبر ۱۹۰۲ء)

افاداتِ والن کریمر

متعلّق

تمدّنِ اسلام

(۳)

اشاعتِ[1] اسلام کی ابتدائی رَو نے عربی قبائل کے بہتیرے جتھوں کو صحرائے عرب سے نکالا جس کے حدود عرب کے شمالی اور مشرقی حصّہ سے لے کر شام اور سواحلِ فرات تک پھیلے ہوئے تھے، مالِ غنیمت اور فتوحات کے شوق نے ان وحشی قبائل کو اپنے افعال میں متحد الغایت بنا دیا اور زیادہ دن گذرنے نہیں پائے تھے کہ شام و بابل کی سلطنتیں خلیفۂ وقت کے قبضۂ اقتدار میں آ گئیں، ان دونوں

---

[1] مجھ کو افسوس ہے کہ اقتباس کا یہ حصّہ علامہ شبلی کی نظر سے نہ گذر سکا، ابھی معلوم ہوا ہے کہ اتفاقیہ بندوق کے چل جانے سے ممدوح کا ہاتھ مبارک زخمی ہوا جس کے کاٹنے کی نوبت آئی، آج لٹریری دنیا میں جو کچھ دم ہے تو آپ کی ذات سے ہے، نہایت افسردگی کی حالت میں اسے بھیج رہا ہوں، پچھلے نمبر میں جو نوٹ دیئے گئے تھے ممدوح کے ایما سے لکھے گئے تھے،

عربی اصطلاحات کے لئے میں مولانا سید کرامت حسین، بیرسٹرایٹ لا کا ممنون ہوں جنہوں نے نہایت مہربانی سے مجھے قیمتی امداد دی، ورنہ لٹریچر اس قدر سخت تھا کہ ترجمہ ظاہرًا اُردو کی استطاعت سے باہر معلوم ہوتا تھا،

(نسیم سیاپچ)

ممالک میں اس وقت ایسی قومیں آباد تھیں جن کے پاس قدیم ترین زمانہ سے ایک حد تک اعلیٰ سے اعلیٰ تمدن موجود تھا، اس لئے عربوں کو ان دماغی عناصر سے سابقہ پڑا جو ان کے لئے بالکل ہی نئے تھے اور جن کی پوری قوت کا اندازہ بھی بحیثیت موجودہ مشکل سے کر سکتے تھے، ملک شام میں اسلام کو ایک ایسا مذہبی نظام ملا جس میں نمو سے اختراعی موجود تھا اور جس کی بنیاد منطقی اصول پر ایک عرصۂ دراز کے منقولانہ مباحث واختلافات کے بعد پڑی تھی، بابل میں بہتیرے مذاہب پہلو بہ پہلو ایسے موجود تھے جن کی باہمی رواداری قدیم جاہلیت کے نظامات مذہبی کے لئے مایۂ ناز تھی، اسلام نے ان قدیم معتقدات سے ایک سخت ٹکر کھائی جس سے وافر مرکبات اور نتائج متنوعہ حاصل ہوئے اور اس دماغی کشمکش اور خیالات کی کایا پلٹ نے جو طبعًا پیدا ہوتی گئی، مشرق کی مذہبی تاریخ مابعد پر نہایت ہی گہرا . . . اثر ڈالا،

ہم راویانِ عرب کی غیر منقطع کوششوں کے ممنون ہیں کہ ان کی بدولت آج ہم کو اس زمانہ کی سیاسی اور فوجی تاریخ کا علم حاصل ہے جو اتنا ہی صحیح ہے جس کی توقع بارہ صدیوں کے طولانی زمانہ کے بعد کی جا سکتی ہے، لیکن اس نادر الوجود عہد کی اندرونی تاریخ اور یہ کہ ایک جدید اور غیر شائستہ مذہب نے کیونکر ان قدیم اور اعلیٰ درجہ کے ترقی یافتہ نظامات مذہب کا مقابلہ کیا، ایک راز ہے جس کے متعلق معمولی جزئیات بھی معلوم نہیں ہیں،

اس لئے یہاں میں اُن واقعات سے بحث کرنے کی کوشش کروں گا جو

آزادانہ تحقیقات پر مبنی ہونے کے سوا پہلے پہل صفحۂ تاریخ پر لائے جائیں گے،
ان واقعات سے اسلام اور عربی تمدن پر بیرونی اثرات کا اندازہ ہوگا، اور ایک
کامل مرقع آپ کے پیش نظر ہو جائے گا،

مذہب عیسوی پہلا نظام تھا جس سے اسلام سے مڈبھیڑ ہوئی، دمشق کسی زمانہ
میں خلفائے بنی امیہ کا مسکن تھا، اور واقعی وہاں مذہبی درسگاہیں اس پایہ کی موجود
تھیں جن سے مشرقی چرچ کے بڑے بڑے فاضل پیدا ہوئے، دار الخلافت
میں دماغی مشاغل زوروں پر تھے، مسلمان اور عیسائی فاضلین میں طرح طرح کے روابط
وتعلقات رہتے ہوں گے، یہ یقینی ہے کہ ان میں مذہبی مباحثے ہوتے رہتے تھے،
گو ان کی تقریریں محفوظ نہیں رکھی گئیں، یہاں تک کہ جان دمشقی اور تھیوڈور ابو قرہ کی
تحریرات بھی ان سے خالی نہیں، ان ہی مباحثوں سے احتمال غالب یہ ہے کہ
اسلام کے وہ ابتدائی مذہبی فرقے پیدا ہوئے جو آگے چل کر مرجیہ اور قدریہ کہلائے،
خلفائے بنی امیہ جو صرف عیش کے بندے تھے ان میں سے اکثر عیسائیوں اور
غیر مسلموں کے ساتھ فیاضانہ پیش آتے تھے، عیسائی محقق دربار شاہی تک
آزادانہ گھس پیٹھ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کو سلطنت کے نہایت معتبر اور ضروری
عہدے بھی ملتے رہتے تھے، سرجیس جان دمشقی کا باپ خلیفہ عبد الملک کے
دربار میں مشیر اعلیٰ کا عہدہ رکھتا تھا، اس کے بعد اس کے بیٹے نے یہ جگہ پائی، ایک
عیسائی خلفائے بنی امیہ کا درباری شاعر بھی تھا، زمانہ عیسائیوں کے اس قدر موافق
تھا کہ یہ بغیر کسی اندیشے کے مسجد والوں کی بار بار پاس آتے تھے اور عام طور پر طلائی

صلیب زیب تن کئے پھرتے تھے، اس بے تعصبی نے جو خلفا کی طرف سے برتی جاتی تھی لازماً مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کی راہ و رسم بڑھائی ہوگی، یونانی رہبوں کی صحبت میں جو فن مناظرہ میں لطیف دستگاہ رکھتے تھے، عربوں نے فلسفیانہ مباحثے سیکھے، جس کی بعد میں انہوں نے اتنی قدر کی، ان ہی سے پھر مسلمانوں نے پہلا سبق "لطائف منقولی" میں حاصل کیا، یہ ایک ایسا فن تھا، جس میں علمائے مشرق ڈوبے ہوئے تھے، اسی طریقہ پر اس غیر معمولی مماثلت کی توجیہ ہوسکتی ہے جو ہم کو مشرقی عیسائیت اور اسلامی منقولات کی خاص خاص صورتوں میں محسوس ہوتی ہے،

اولاً خدا کی ذات و صفات کے متعلق تحقیقات کی گئی جس نے یونانی اور نہایت قدیم عربی علما کی تصنیفات میں سب سے پہلے جگہ پائی ہے، قدیم ترین علمائے اسلام اور کلیسائے یونانی کے ربّی جبر و قدر کے مسئلہ میں بہت متفق معلوم ہوتے ہیں، مغربی چرچ کے خلاف کلیسائے یونانی کے علماء "خلود فی النار" کے مسئلہ سے متفق نہیں تھے اور یہی خیال اسلام کے اس قدیم فرقہ کا تھا جس کو مرجیہ کہتے ہیں،

اس کا بہت افسوس ہے کہ اس فرقہ کے متعلق ہم بہت ہی کم صحیح معلومات رکھتے ہیں، کیونکہ اس نے کبھی اس زمانہ کی تقدیر میں حصہ لیا، عہد بنی امیہ کی تاریخیں بالکل ہی فنا ہو چکی ہیں، اور سب سے پرانی تاریخ جو ہم تک پہنچی ہو عہد عباسیہ کی ہے، مرجیہ کے متعلق جو کچھ اطلاع ہم کو ملی ہے وہ ان منتشر روایات کی بنا پر

ہے، جو کچھ متاخرین کی تصنیفات میں ملتی ہیں، قدیم سے قدیم تحریریں میں اس کا بیان ہے ایک نظم ہے جس پر آجتک توجہ نہیں کی گئی، یہ خلیفہ عبدالملک کے زمانہ میں لکھی گئی تھی، اس نظم کا مضمون جو بہت پرانا ہے اور جو آج تک غیر معلوم حالت میں تھا، مرجیہ کے خیالات کے متعلق جو کچھ متاخرین سے معلوم ہوا ہے اس سے پوری مطابقت رکھتا ہے، مرجیہ بمقابلہ قدیم فرقہ شدید العقائد اور متعصب خارجیوں کے، زندگی موجودہ اور آئندہ پر امید و ثوق کی نظر ڈالتے تھے، خاص کر ان کو خلود فی النار سے قطعاً انکار تھا، اس مسئلہ میں وہ یونانی رہبوں سے بالکل ہی مختلف ہو گئے تھے، کیونکہ جیسا کہ معلوم ہے کلیسائے مشرقی میں اوائل ہی سے نہایت سختی کے ساتھ مغربی علما کی رائے کے خلاف یہ قائم ہو گیا تھا کہ "خلود فی النار" کا عقیدہ صحیح نہیں ہے،

اُریجن مضبوطی سے سزائے خاتم کا قائل تھا، اور اس مسئلہ میں تمام اہل اسکندریہ اس سے متفق ہیں، یہانتک کہ اساتذۂ کلیسائے اینٹی اوک (انطاکیہ) ڈایڈورس آف تارسس (طرسوس) اور تھیوڈور آف ماپسواسٹیا گو اور امور میں اریجن کے ہم خیال نہیں ہیں، لیکن اس مسئلہ میں اعتقاداً اس کے شریک ہیں، وہ "خلود فی النار" کے مسئلہ پر بھی بحث کرتے تھے، ایک دوسرا امر جو کلیسائے یونانی اور اسلام میں متفق علیہ ہے یہ ہے کہ یونانی چرچ کی طرح اسلام بھی کفارہ سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا،

مرجیہ کی نرمی عقائد میں (بمقابلہ اس ہیبت و خوف کے جو قرن اول کے

راسخ الاعتقاد مسلمانوں پر چھایا ہوا تھا، ایک طرح کا سکون اور زندہ دلی پائی جاتی تھی، جو جان دمشقی کی تعلیمات سے بالکل ہی ملتی جلتی ہے جو اس فرقہ کی ابتدائی نشو و نما کے وقت مذہبی غور و خوض میں مصروف رہتا تھا، اور جس نے بنی امیہ کے دار الخلافت میں اچھی خاصی شہرت حاصل کی تھی، وہ کہتا ہے کہ "اس امر کا جاننا ضروری ہے کہ خدا اپنے اصلی اور پیش بین ارادہ کے مطابق ہم سب کے چاہتا ہے کہ اس کی بادشاہت میں حصہ لیں، اس نے ہم کو سزا کے لئے نہیں پیدا کیا، وہ مہربان ہے، اس لئے ہم کو اس کی فیاضی سے مستفیض ہونا چاہئے، گنہگاروں کو وہ سزا دیتا ہے کیونکہ وہ منصف ہے"

مرجیہ کے بہت سے خیالات آگے چل کر اسلام میں داخل ہوگئے، مذہب حنفی جس نے بہت زیادہ رواج پایا، پیروتر کی مسلمانوں کا حصہ غالب ہے، مرجیہ کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اس کے بانی نے مرجیہ کے نہایت ضروری مسائل کو تسلیم کیا اور جہاں تک قدیم تاریخی اسناد کا تعلق ہے، خود مرجیہ کہلایا، ما سوا اس کے عربی لٹریچر میں سب سے قدیم مورخ مذہب یعنی ابن حزم، مرجیہ کی نسبت کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا فرقہ تھا جو پابندی شرع سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہوتا تھا، مذاہب اربعہ میں حنفی ہمیشہ نہایت متحمل اور غیر متعصب رہے ہیں، خدا کی تنزیہہ و تقدیس کا تخم ایک ہزار سال ہوئے کہ بویا گیا تھا، اور تقدیر انسانی صدیوں کی سختیاں اور صعوبات جھیل کر ہمارے عہد تک پہنچی ہے،

بہرحال یہ ایک ایسا منظر ہے جس پر خالص توجہ کی ضرورت ہے یعنی دو عظیم

فرقہ ہائے اسلام حنفی و شافعی ہیں پہلا جہاں نہایت متحملانہ ہے، دوسرے میں تعصب اور تشدد فی المذہب پایا جاتا ہے، پہلے نے عالمگیر وسعت پائی اور دوسرے میں برابر انحطاط آتا گیا، جب میں ان واقعاتِ متذکرہ پر نظر ڈالتا ہوں، تو اپنی اس رائے کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا کہ مرجیہ اپنی اصلیت اور ہیئت کذائی کیلئے کلیسائے یونانی کے مذہبی فلسفہ کے ممنون ہیں، اس کے متعلق کامل تصریحات پیش نہیں کی جاسکتی ہیں، کیونکہ باستثنار دو ایک قطعات کے مرجیہ کی تحریرات قریباً بالکل فنا ہو چکی ہیں، اور ان کے ساتھ وہ مواد بھی جاتا رہا جس سے ان کی تعلیمات کا پورا پورا موازنہ بہ بیانِ یونانی کے ساتھ ہو سکتا،

اور لیجئے، اسلام کا ایک دوسرا ابتدائی فرقہ عیسائیت کے ساتھ اور بھی شباہت اور اتحاد قریبہ رکھتا ہے، میری غرض قادریہ سے ہے جو شہر سے اسلام میں آزاد خیال ہیں اور جنھوں نے آگے چل کر معتزلہ کے نام سے ایک ممتاز درجہ حاصل کیا، اس خیال کے بہتیرے سبب ہیں کہ قادریہ کے مذہبی عقائد عیسائیت سے ماخوذ ہیں اور اس سے کچھ کم متاثر نہیں ہیں، یہ امر لائقِ لحاظ ہے کہ ان کے تصورات بالتخصیص خدا کی ذات و صفات کی طرف مائل رہتے تھے،

یہی رجحان رہبانِ یونانی میں بھی پایا جاتا ہے، ان کے ہاں بھی خدا کی ذات صفات کا مسئلہ پیش پیش تھا، مسئلہ اختیار کو عربوں کے ملک شام فتح کرنے کے تھوڑے سے دن بعد، علمائے عیسوی نے پیش کیا تھا، جو دمشق کے رہنے والے تھے اور عربوں سے ملتے جلتے رہتے تھے، میری مراد جان دمشقی اور تھیوڈور ابو قرہ

سے ہے، اوّل الذکر نہایت استحکام کے ساتھ اس رائے پر قائم تھا کہ خدا
صرف اچھائی چاہتا ہے اور وہ اچھائی کا مخرج ہے . . . . وہ کہتا ہے جس طرح
روشنی آفتاب سے نکلتی ہے، اچھائی خدا سے ظہور میں آتی ہے، ہم دیکھتے ہیں
کہ جان دمشقی کی تحریرات میں معتزلہ کا ایک مسئلہ بہت پہلے بیان کر دیا گیا ہے،
یعنی خدا کی طرف سے جزا و سزا اعمالِ انسانی کے لحاظ سے ہوتی ہے، اس نے
انسان کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ ان کو تلف کرے، یا تاون مزاجی کیساتھ
ان کو بیرحمی کا شکار بنائے، یہ مسئلہ معتزلہ کے ہاں خدا کے ادراک کا اصل الاصول
ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مرجیہ نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہے، اسی طرح یہ بحث
مباحث ہیں جن پر مسلمان علماء نے تفصیل کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے، لیکن جن کا
ہیولیٰ ربّیانِ یونانی کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، میں صرف ایک لفظ یعنی تعطیل کا
ذکر کرونگا جو علمائے عرب نے کنوسس ( ) کے لئے وضع کیا، جو عیسائیوں
کے مذہبی لٹریچر میں خدا کے ادراک کو تمام صفاتِ انسانی سے منزّہ کرنے کے
معنی میں آیا ہے، قدیم ترین نسخہ عربی یعنی فقہ الاکبر میں جو ایک مختصر سی کتاب ہے،
ظاہرا بہتیری باتیں ایسی ملتی ہیں جو ربّیانِ یونانی کو یاد دلاتی ہیں،

فرقۂ معتزلہ کا بھی عیسائیت سے متاثر ہونا پایا جاتا ہے اور ہم اس خیال کیلئے
کافی وجوہ رکھتے ہیں جو نیا ہو تو ہو، تاہم بے بنیاد نہیں ہے کہ ابتدائی اسلام کے
مذہبی فرقوں کا نمو اور کلیاتِ منقولی جو ابتداءً ان سے ظہور میں آئے وہ خاص کر
عیسوی خیالات کے زیر اثر واقع ہوئے تھے اس طرح مسائل مرجیہ اور قادریہ

کا تعلق براہِ راست کلیسیائے یونانی کے اجتہادات سے پایا جاتا ہے جو علمائے دمشق کی تحریرات میں ملتے ہیں، معتزلی مسائل جن کا سلسلہ غالباً دمشق یعنی خلفائے بنی امیہ کے مسکن تک پہنچتا ہے، بہت بڑی ترقی، بالاتبیاز بصرہ، کوفہ اور بغداد میں حاصل کی اور یہ ان سیاسی تشنجات کی بناء میں حاصل ہوئی جنہوں نے اسلامی سلطنت کے مرکزِ ثقل کو دفعۃً دمشق سے بابل کی طرف منتقل کر دیا۔ اس فرقہ کی تدبیر مابعد جو عربوں کی تمام و کمال دماغی حرکت پر عمیق اثر رکھتی تھی، ہمارے موجودہ دائرۂ تحقیقات سے باہر ہے۔

بجائے اس کے ہم ان اقطاعِ ارضی کی طرف متوجہ ہوں گے جو سواحلِ فرات پر واقع ہیں، جہاں اسلام نے بیرونی عناصر سے جن سے سابقہ پڑا بالکل ہی جداگانہ نوعیت کے اثرات حاصل کئے۔ وہ خوبصورت خطہائے ارضی جن پر فطرت کی خاص عنایت تھی اور جو لب دجلہ و فرات واقع تھے، ان میں عربی فتوحات کے وقت پہلو بہ پہلو ایسی قومیں آباد تھیں جو مذاہب مختلفہ کی پیرو تھیں، حکمران تھی مذہب زرتشت رکھتے تھے، عیسائیت نے خاصی ترقی کی تھی اور بعض شہروں میں اسے غلبہ حاصل تھا، تمام بدوی قبائل جنہوں نے عراقِ عرب کو اپنی چراگاہ بنا رکھا تھا، ایک وقت سے آغوشِ کلیسیا میں پہنچ گئے تھے، اسی کے ساتھ مذہب مانوی کے پیرو بھی موجود تھے جو عقائد زرتشت کے ساتھ عیسوی اور ہندی خیالات کے اختلاط سے پیدا ہوا تھا، آخر آخر میں بھی مذاہب جاہلیت کے ماننے والے کچھ کم نہیں تھے، جن میں سب سے آخری جماعت صابئین حران کی تھی جو عہدِ اوسط تک زندہ بچ گئی۔

جاہلیت کی بہت سی رسمیں یعنی "سنت الاولین" عرصہ تک جاری رہیں، مثلاً دعوت عنقود (ایڈونس) بعض خاندانوں کی معبودانہ پرستش جس کی ایک نظیر ہم کو ساتویں صدی ہجری میں بھی ملتی ہے،

فاتح مسلمان جو مفتوحہ اقوام سے خدا کا سا برتاؤ کرتے تھے اور ان پر نہایت سخت قسم کے کاموں کا بار ڈالتے تھے، ان کی فوجی نخوت اور نیز خلیفہ ثانی کے اصول کی سختی اور یک رنگی نے (جنہوں نے قطعاً عربوں کو زمینداری اور کاشتکاری سے روک دیا تھا، تاکہ وہ غیر مشترک طور پر صرف فوج کے ہو کر رہیں) یہ نتائج پیدا کئے کہ ہر طرف لوگ مسلمان ہونے لگے، ارض مفتوحہ کے بہت سے پرانے باشندے غلام کی حیثیت سے بیچے گئے اور اس وقت آزاد کئے گئے جب وہ مسلمان ہوئے اور اپنے آقاؤں کے ساتھ انہوں نے بحیثیت موالی تعلقات پیدا کئے،

جب ہم خیال کرتے ہیں کہ عربی اصول قانون کے مطابق ایک مولی کی اولاد آقا کی اولاد کے مقابلہ میں وہی درجہ رکھتی ہے جو اصلی مولا کو اصلی آقا کے لحاظ سے حاصل ہے تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر مخلوط النسل اشخاص کی تعداد اس قدر تیزی سے بڑھتی گئی جو ممالک مفتوحہ سے لئے گئے تھے اور جو فاتحین عرب سے "موالی" کا تعلق رکھتے تھے یوں تو مسلموں کا روز افزوں دائرہ بڑھتا گیا، ان کا کچھ حصہ تو یا لطف اپنے قدیم معتقدات مذہبی کو صحیح سمجھتا تھا لیکن بہت سے واقعی ایسے تھے جن میں اسلام کی تعلیمات نے طہمانہ سرگرمی پیدا کردی تھی، جن کی حیرت انگیز کامیابی نے ان کی صداقت اور خلوص کا اعلان

کر دیا، یہ ایک مذہب کی بندش عامہ تھی جس نے مختلف اور متفرق عناصر کو یکجا کر دیا، لیکن یہ رشتۂ اتفاق چونکہ ضعیف و کمزور تھا پہلے ہی صدمہ کی تاب نہ لا سکا، اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا،

یہ صورت اس وقت پیش آئی جب علیؓ اور معاویہؓ میں ملکی جنگ چھڑی ہوئی تھی، ایک شایق جمہوریت پارٹی قایم ہو گئی تھی جس میں خاص کر اصلی عربی عناصر شریک تھے جو دونوں مدعیان تخت کے خلاف تھے، علیؓ کے گرد ایک شدید العقائد گروہ کثیر جمع ہو گیا، جو اُن کو پیغمبر کا وارث جائز سمجھتا تھا، اور جو قدیم عجمی خیال کے مطابق سلطنت ربانی کو ان کی طرف منسوب کرنا چاہتا تھا، یہاں تک کہ اس نے علیؓ اور ان کی اولاد کی پیغمبری کی طرح پرستش کی، اس سے شیعیان علیؓ کا ایک بہت بڑا فرقۂ مذہبی عالم وجود میں آیا، جو مشرق کی تاریخ مابعد میں اس قدر ضروری نکلا جس کی انتہائی بلند پروازی یہ تھی کہ وہ علیؓ کو خدا سمجھتے تھے، جو ذرا معتدل خیال کے تھے وہ علیؓ کے جانشینوں کو دنیادی اور روحانی امور میں جائز پیشوایان اسلام خیال کرتے تھے،

شیعیوں کے وجود کے سبب اولی کو صرف قدیم مشرقی یا شاید عجمی خیالات کی طرف منسوب کرنا ایک ناانصافی ہوگی، کیونکہ ہم متقدمین پیروان علیؓ میں عربی نسل کے ممتاز آدمیوں کو دیکھتے ہیں، یہ شیعی اس لئے ہوتے کہ اس بڑی کشمکش میں جو تخت کے لئے علیؓ اور معاویہؓ میں پیش آئی تھی، انہوں نے علیؓ کا ساتھ دیا، جن کی رفاقت میں بہت سے عجمی اور خارجی اشخاص تھے جن کے

مذہبی خیالات نے شیعیوں میں بتدریج قبولیت حاصل کی تھی،

قدیم عربی شیعیوں میں ہم کو ایک ایسا عقیدہ ملتا ہے جو غیر عربی عنصر یعنی سنت الاولین کا صاف اور غیر مشتبہ نقش معلوم ہوتا ہے اور جو کسی طرح وطنی پیداوار نہیں سمجھا جا سکتا، یہ وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر عربی تحریرات میں الرجعۃ یعنی مسئلہ واپسی کے نام سے آتا ہے، عقیدۃ الرجعۃ اس زمانہ کی زبان میں یہ خیال ظاہر کرتا تھا کہ شیعیان علیؓ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونگے اور تمام آدمی ایک مدت کے بعد جو چالیس دن سے کم نہ ہوگی جی اٹھیں گے، اس مسئلہ نے معتقدین میں ایک خاص طرح کی باطنی گمراہی پیدا کر دی کیونکہ اس نے ان لوگوں میں موت کی غیر معمولی تحقیر کو ترقی دی تھی، ایک عربی شیعی جس کا نام خندق تھا اس قدر راسخ العقیدہ تھا کہ اس نے اپنے دوستوں کو یقین دلایا تھا کہ اگر اس کے خاندان کی کوئی کفالت کرے تو وہ اغراض عام کیلئے اپنی جان دینے کو بالکل تیار تھا، ایک دوست نے اسے اطمینان مطلوبہ دلایا، اور وہ مکہ چلا گیا، جہاں اس نے بآواز بلند اہل مکہ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور یہ الزام لگایا، کہ انہوں نے خاندان رسالت کو جو اسلام کے جائز پیشوا ئے مذہبی تھے چھوڑ رکھا تھا، شیعیوں میں واقعی بہتیرے سخت خیال ایسے موجود تھے جن کا عقیدہ تھا کہ شہادت حضرت اولاد علیؓ کا حق تھا، ان کو پختہ یقین تھا کہ جلد ہی اٹھیں گے، اس لئے بے تکلف موت سے ہم آغوش ہوتے تھے اور آج بھی شیعیان عجم میں عقیدہ رجعۃ موجود ہے جس کے شواہد بابیوں کے ہنگامہ کی تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں،

نصیریوں میں بھی یہی مذہبی خیال آج تک چلا آیا ہے، کیونکہ وہ اپنے عقیدہ میں

مسئلۂ رجعت کو یوں چسپاں کرتے ہیں کہ ظہورِ الوہیت بار بار انسانی صورت میں ہوتا رہتا ہے، اس کے سوا ایک عربی شیعی یعنی شاعر کثیر کی نسبت (جو فرقۂ کیسانیہ یا خشبیہ سے تھا) کہا جاتا ہے کہ وہ تناسخ اور مختلف صورتوں میں خدا کے تجسم کے مسئلہ کی تلقین کرتا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسائل مذہبِ مانوی سے ماخوذ ہیں، مسئلۃ الرجعۃ اور حشر و نشر یہود و نصاریٰ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ زندہ ہونے کی روایت سے پایا جاتا ہے، یہ صاف ظاہر ہے کہ عقیدۂ رجعۃ اس وقت بلکہ اس سے پہلے مشہور ہو چکا تھا، عام عقیدے کے مطابق پیغمبران یونسؑ و الیاسؑ مرے نہیں تھے، بلکہ ان کے زندہ اجسام حرّان کی قبروں میں وقفِ استراحت تھے ۴۰ دن کی مدت عیسوی روایات میں اسی طرح پائی جاتی ہے، جس طرح ان ابتدائی فرقہ ہائے اسلام میں، اس خیال کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی دنیوی زندگی کی مدت دوبارہ زندہ ہونے کے بعد تاریخ حواریّین میں چالیس دن کی قرار دی گئی ہے، "اعمالِ حواریّین" کے ایک فقرہ میں رجعۃ کا ذکر ہے، جہاں تمام چیزوں کے دوبارہ پیدا کرنے کا بیان آیا ہے، اسی سے عہدِ عیسوی کی پہلی صدی میں اس "ہزار سالہ مدت" کا خیال پیدا ہوا جس میں مسیح پھر آکر سلطنت کریں گے،

یہ تنقیدات مثلاً ان اہم تغیرات کے دکھانے کیلئے کافی ہیں، جو بیرونی تمدن کے اثر سے اسلام پر طاری ہوئے، لیکن یہ مؤثرات صرف مذہبی امور ہی میں پوری قوت کے ساتھ اپنا کام نہیں کر رہے تھے بلکہ اجتماعی (سوشل) دائرہ ان سے کہیں زیادہ متاثر ہو رہا تھا، (باقی دارد)

(مخزن جون ۱۹۰۷ء)

"البیان"

(ایک ماہوار ادبی رسالہ)

ملک میں "الندوہ" کے سوا بھی ایک رسالہ ہے جس کا موضوعِ سخن عالمانہ اُردو کے ساتھ عربی لٹریچر کے مذاق کی تجدید ہے، یہ وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ادبی رسالوں میں یہ علانیہ ممتاز ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ رسالہ بھی کچھ عرصہ سے سِسک سِسک کر نکل رہا ہے، اور وہ وقت ظاہراً کچھ دُور نہیں معلوم ہوتا کہ "معارف" کی طرح یہ بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے، مرض وہی ہے جو ملک کے وقیع پرچوں کو آئے دن لاحق رہتا ہے، یعنی خریدار نہیں ملتے، جو ملتے ہیں، وہ قیمت نہیں دیتے، فرمائیے یہ تو مادیت کا دَور دورہ ہے، نرے توکّل سے تو کام چلنے سے رہا، سرسید کے زمانہ کو ابھی کئے دن ہوئے، کل کی بات ہے کہ نئے پُرانے ہر خیال کے آدمیوں میں دفعۃً پڑھنے لکھنے کی ایک قومی تحریک پیدا ہو گئی تھی، جس کو دیکھ دیکھ کر اہلِ نظر سمجھنے لگے تھے کہ مسلمانوں میں ارتقائے دماغی شروع ہوا چاہتا ہے، یعنی ملک میں ادبی (لٹریری) مذاق کا رنگ اگر عام طور پر پہنچ گیا تو وہ حالت ہم پر طاری ہو کر رہے گی، جو جاپان میں عملی ترقیات سے پہلے دیکھی گئی، لیکن یہ کایا پلٹ کچھ سمجھ میں نہیں آتی، کہ آجکل سرے سے کوئی پڑھنا ہی نہیں چاہتا،

اہلِ صرف کی طرح زمانہ کے تین حصّے کیجئے، ماضی، حال، استقبال، فلسفیوں کا خیال ہے کہ مستقبل ہمیشہ ہماری حالتِ گذشتہ اور موجودہ کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، لیکن مَیں آیندہ قطع نظر کر کے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ حال اگر ماضی کا بیٹا یعنی اس کا پیدا کردہ ہے تو آخر اس قدر ناخلف کیوں ہے؟ وارثِ طبعی کے لحاظ سے کچھ تو پچھلے اور موجودہ وقت میں خصائص مشترک ہونے تھے، یہ کیا کہ باوا اچھے خاصے پڑھے لکھے، اور بیٹے اس قدر کورے کہ الف کے نام بے نہیں جانتے، آخر دورِ موجودہ ادبی حیثیت سے اتنا گیا گذرا کیوں ہے؟ یہی لیل و نہار ہیں تو پوتے یعنی مستقبل کی قطعاً خیر نہیں! دنیا میں ہر چیز نظاماتِ مقررہ کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے، گذشتہ دماغی تحریک کے ساتھ موجودہ بے حسی کو ربط دیجئے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ایک طرح کی ناگزیر ادبی موت جس کے خیال سے دم گھٹتا ہے، موت کیا ہے؟ صرف قوائے حِس کا جانا ہے! یہ تو قطعی ہے کہ نئے تعلیم یافتہ کچھ نہیں پڑھتے، یعنی ان میں خاص علمی مذاق بہیئت اجتماعی نہ پیدا ہوا ہے، نہ آیندہ پیدا ہونے کے منطقی آثار ہیں، بڑی مصیبت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زبان بگاڑلی ہے، ایک صاحب جو خاصے گریجویٹ ہیں اور جن کو کہنا یہ منظور تھا کہ "بیوی کا انتقال ہوگیا" مزاج پرسی پر نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ

"میری وائف کا ڈتھ ہوگیا ہے۔"

مَیں اُن کا منہ دیکھنے لگا، اور مجبوراً عرض کرنا پڑا کہ حادثہ سے اظہارِ خیال کے طریقے پر افسوس ہے! یہ نمونہ ہے اس ٹکسالی زبان کا جو آجکل ہماری تربیت گاہوں میں زوروں کے ساتھ رائج ہے، اچھے اچھوں کو دیکھا پورا فقرہ اپنی مادری زبان کا بغیر

اختلاطاً انگریزی نہیں بول سکتے، ایک خاص طرح کا روزمرہ ایجاد ہوا ہے، جس میں
آدھے سے زیادہ بے ضرورت انگریزی کی بھرتی ہوتی ہے، گوروں کی بگڑی
اُردو اور بیگانگی زبان کی وجہ سے پھر بھی لائقِ درگذر ہے، لیکن یہ نئی بات ہے
کہ اہلِ زبان اور گونگے! یعنی ادائے خیال پر اس وقت تک قادر نہیں جب تک
زبانِ غیر کی پیوند کاری نہ ہو جس پر ہر شخص گویا مٹا ہوا ہے، "دائی پرغش اور ماں سے
بیگانگی"، یہ وہ پیمانہ شایستگی ہے جو مادرِ زبان کیلئے جدت سے خالی نہیں، اس پر ستم ظریفی
یہ ہے کہ کسی کو اصلاح کا احساس تک نہیں ورنہ آج "البیان" ہاتھوں ہاتھ ہوتا،

ہم مولانا عبد اللہ عمادی کے ممنون ہیں کہ وہ اس کس مپرسی میں بھی دادِ سخن
دیتے رہتے ہیں، علم الصنائع اور کیمیائے اسلام پر جو کچھ لکھا گیا، فاضل عمادی کے
سوا کس کا قلم یوں اُٹھ سکتا تھا، یہ مضامین اور جو آجکل ان کے قلم سے نکل رہے
ہیں، اس پایہ کے ہیں جن سے اُردو لٹریچر کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے، اور سچ یہ ہے کہ
معلم شبلی کے بعد مستشرقانہ حیثیت سے کچھ لکھنا پڑھنا وہ بھی یورپ سے دور
یہاں کی غیر متحرک آب و ہوا میں جامعِ کمال عمادی کا حصہ ہے، جن کو تعلیم یافتہ
طبقہ بھی اچھی طرح نہیں جانتا، ان کے ذاتی اجتہادات کے سوا ایک نظر میری
مصری لٹریچر پر بھی ہے، جو اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ کسی طرح جی نہیں مانتا ہم
اس سے بیگانہ ہو کر رہیں، ہماری بدمذاقی خود سفارشی ہو کہ "البیان" اپنی وضعداری کو
ہاتھ سے نہ دے، اور وہ صرف ہے پیش کرتا ہے جن میں گراں پایہ ادبی مضامین کے سوا
پُرزور معقولات کا بھی ایک کافی حصہ ہو، معقولات پر توجہ کی ضرورت اس وجہ سے

ہے کہ جن مسائل کو ہمارے لٹریچر اور روزمرہ کا ایک جزو ہونا تھا، اب بھی وہ اتنے اہم ہیں کہ مستقل عنوانوں سے ان پر اظہارِ خیال کی ضرورت ہوتی ہے پچھلے دنوں ایک صاحب جن کی رواجی عربیت خاصی معلوم ہوتی تھی، علامہ شبلی کے منہ اس لئے آئے تھے کہ ممدوح نے مسئلۂ ارتقاء پر عملی حیثیت سے نظر ڈالی تھی، لیکن ان کو مولانا کے انتقاد سے اس قدر بحث نہیں تھی جس قدر نفسِ مسئلہ یعنی اصولِ ارتقاء کی تردید پر اصرار تھا، نہ جاننا بھی مزے کی بات ہے، غریب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس حد تک جہلِ مرکّب کا حامی ہے! بہرحال "البیان" میں چوٹی کے فلسفیانہ مضامین کو عنصر غالب ہونا چاہیئے، یہاں یہ بات بھی جتا دینے کی ہے کہ ہمارا مذہبی لٹریچر مصریوں سے گرا ہوا نہیں ہے، اس لئے منقولات اور ان میں بھی ایسے اقتباسات جن سے کسی بحث کا خاتمہ نہ ہوتا ہو گو دلچسپ ہوں، تاہم وقت کی چیز نہیں،

آخر میں مولانا عمادی کو جس امر کی طرف بالتخصیص متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور جو دراصل ان چند سطروں کا موضوعِ اصلی ہے وہ یہ ہے کہ "البیان" کے دو ایک کالم اصطلاحاتِ جدیدہ کیلئے وقف کر دیئے جائیں، یہ ایک ضرورت ہے جس کو تعلیم یافتہ طبقہ عرصہ سے محسوس کر رہا ہے اور جس پر اُردو لٹریچر کی آیندہ ترقی کا بہت کچھ انحصار ہے، وہ اس قدر گئی گذری نہیں جتنی ہماری "علمی ناداری" اسے ذلیل کر رہی ہے، سچ یہ ہے، کوئی مغربی خیال اُردو میں شایستگی سے ادا نہیں ہو سکتا، جبتک اس کیلئے اصطلاحات پہلے سے موجود نہ ہوں، اور چونکہ انگریزی اصطلاحات صرف عربی غالب ہیں

ڈھل سکتی ہیں جن کی ترکیب ایسی واقع ہوئی ہے کہ علمی حیثیت سے وہ ہماری زبان کی کفیل ہو سکتی ہے، اس کے لئے جدید عربی میں معمولی آگہی سے زیادہ دستگاہ پیدا کرنی ہوگی، اور یہ ہر شخص کے بس کی چیز نہیں، اس لئے "البیان" میرا خیال ہے بہت احسان کریگا، اگر مصر سے وہ ہمارے لئے ذخیرۂ اصطلاحات بہم پہنچاتا رہے، یہ اس قدر ضروری مسئلہ ہے کہ "البیان" کے مقاصد میں اسے سرِ فہرست ہونا تھا، لیکن مولانا عمادی جو اس فن کے اختصاصی (اسپشلسٹ) ہیں، دبی زبان سے فرماتے ہیں کہ: "جو آگ برف کے ٹکڑوں پر سلگائی جائے وہ جل چکی! زمانہ میں کہیں علمی مذاق نہیں، لٹریچر سے لگاؤ کا نام نہیں، پھر یہ کاوش و دردسری آخر کس کے لئے؟ یہ بارِ گراں (پرچہ کا خرچ) چلیگا کیونکر؟"۔

یہ حالت جس قدر مایوس کن ہے اس سے زیادہ لائق افسوس ہے، مگر ایک مشہور انشا پرداز کا خیال سُن رکھیے کہ جس طرح ہر مشغلہ محبت مصیبت کا گھر ہے مشغلۂ سخن سب سے بڑھ کر ہے، حسن کلام کے مارے ہوئے پنپتے نہ دیکھے، سارے اہلِ قلم بُری طرح جیئے اور عمر بھر روٹیوں ہی کے محتاج رہے، اور بہت کم ہیں جو اپنے قلم سے زندگی بسر کر سکے،

"مصائب اہلِ تصنیف" دیکھیے جو اس موضوع پر ایک مستقل کتاب ہے، تو معلوم ہوگا خلاقینِ سخن پر کیا کیا سختیاں گذریں اور گو یکتائے روزگار ہوتے مگر مصیبتیں وہ وہ اُٹھائیں کہ اُن کا دل ہی جانتا ہوگا"

لیکن دُنیا میں جب کسی قوم نے ترقی کی تو اس کے ادب وانشا یعنی لٹریچر کو

ضرور ترقی ہوئی، اور اس کی ذلت اس قوم کی نحوست کا سبب رہی ہے، عرب کے اس وقت کے لٹریچر کو دیکھیے جب یہ تمام دنیا کے فتح کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے، اندلس جو تمدن کے لحاظ سے تمام دنیا کا مرکز شائستگی تھا، ادبی حیثیت سے مجمع الفصحاء (اکیڈمی) ہو رہا تھا، یورپ کو آج جو عظمت و کمال حاصل ہے کم کسی زمانہ میں نصیب ہوا ہو گا، اس لئے ان کے لٹریچر کو بھی دیکھیے کس مرتبہ کو پہنچا ہوا ہے،

اخباروں اور کتابوں کا ایک ایک کارخانہ بجائے خود گویا عظیم الشان ریاست ہے، جہاں معاوضہ تصنیف کی تعداد لاکھوں روپیہ پہنچ جاتی ہے ہر شخص کو لٹریچر کی طرف ایسی توجہ ہے کہ مشہور اہل کمال شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں ایشیا کے اہل قلم میں مجھ کو حضرت شبلی کے ساتھ ایک خاص حسن عقیدت ہے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ بمبئی سے دور کا لے کوسوں یورپ میں یہ پیدا ہوتے ہوتے تو انکے کمالات کی قدر ہوتی۔ دادی دادے کہ کوئی کافر ادا کمرے میں بے تکلف چلی آتی ہے اور کہتی ہے "میں تمہاری کتاب پڑھتے پڑھتے آئی ہوں میں تمہاری اور یہ دولت تمہاری، ساتھ ہی ساتھ آٹھ دس لاکھ کے نوٹ سنبھال دیتے اور ہاتھ گلے میں ڈال دیتے" ؎

لیلیٰ اسکی ہے دماغ اُن کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

جس سے ایک تذکرہ کیا، لکھنؤ میں مشرقی یونیورسٹی قائم ہو سکتی ہے لیکن لوگوں کا

دل و دماغ خوش کرنے کے لئے کتنی ہی محنت کیجئے، یہ نصیب ہمارے ابھی کہاں؟ یہاں ہر چیز کی قدر ہے، اسی کی نہیں، اس لئے عمادی کو بھی سردست اپنی ادبی خدمات محض فلسفیانہ صلہ پر قناعت کرنی ہوگی، تسکین کے لئے یہ کافی ہے کہ ہر فعل خود اپنی مکافات ہے،

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ عموماً طبائع میں اس قدر سکون و انجماد ہے کہ پڑھنے لکھنے کا مشغلہ ضروریات زندگی میں داخل نہیں ہے، لیکن خوش نصیبی سے لائق التفات لٹریچر کی مقدار کا اوسط بھی بہت ہی کم ہے یعنی سال میں ایک کتاب بھی مشکل سے شائع ہوتی ہے جس کی خریداری سے گرانباری جیب کا احتمال ہو، مثلاً نظام الملک طوسی کی لائف کو لیجئے،

مؤلف "البرامکہ" کی طرف سے کم و بیش پانچ برس ہوئے اس کی اشاعت کا اشتہار دیا گیا،

مدت ہوئی ایک معتد بہ حصہ چھپ چکا ہے، کچھ اجزا باقی ہیں جن کیلئے برسوں سے کاتب نہیں ملتا، پریس شاکی ہے کہ مسودہ نہیں ملتا، لائق مؤلف اب دور ہیں کہ وہاں سے کوئی آواز نہیں آتی، نتیجہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک اس کی اشاعت کا بالکل خوف نہیں! حال میں ایک نہایت قابل قدر تالیف ایک اچھے پریس کو اس لئے نہ دیجا سکی کہ کم سے کم دو سال امیدواری کرنی پڑتی، اس تیز رفتاری کے ساتھ ہماری عقلی ترقیات کا کیا ٹھکانا ہے، صدیاں بھی کافی نہیں! جن صاحبوں کو ہمارے اسباب نحوست کے دور کرنے کی فکر

ہے وہ دیکھیں گے کہ جو قوم اپنے لٹریچر کی طرف سے غافل رہی وہ کبھی نہیں پنپنی، اس لئے ہم کم سے کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ دو ایک موقفت الشیوع پرچے یا لاالتزام دیکھتے رہیں، خاصکر "البیان" جس کی طرف خواص کو متوجہ کرنا منظور ہے، اگر تین روپیے پیشگی ایک وقت میں گرہ سے نہیں نکل سکتے، تو کچھ الزام نہیں، کیونکہ ہمارے ہاں اونچے لوگوں میں بھی "بدل الاشتراک" (یعنی قیمت اخبار) ایک امر غیر عادی ہے، مگر یہ تو ممکن ہے کہ چار آنے کے ٹکٹ ہر مہینے میں دفتر کو بھیج دیئے جائیں، اور رسالہ ملتا رہے،

یورپ میں جہاں علمی مشاغل بہت زیادہ ہیں اور جہاں مضطرب طبائع نچلی نہیں بیٹھ سکتی ہیں، اور چھوٹی آمدنی والے یہی کرتے ہیں کہ روز کے، وز اور مہینے کے مہینے خاص خاص پرچوں اور رسالوں کے نمبر لے لئے، اس طرح چند آنوں میں متعدد پرچے نظر سے گذر جاتے ہیں، اور دائرۂ معلومات بڑھتا رہتا ہے "الینتیر" خاص پسند ہے، میں ناظرین کو اس سستی اور چلتی ہوئی ترکیب کی آزمایش کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، اگر لاکھوں پڑھے لکھے مسلمانوں میں ایک ہزار بھی ایسے نکل آئیں، جو چند آنے ماہوار دل کڑا کر کے صرف کر گذریں تو دو ایک پرچوں کا زندہ رکھنا کچھ بڑی بات نہیں، ہم میں اتنا افلاس نہیں جس قدر کاہلی اور پست ہمتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اس روداد کے ساتھ میں نہیں جانتا بیسویں صدی میں ہم کو دنیا میں رہنے کا کیا حق حاصل ہے؟

(مشرق ۱۹۰۸ء)

ایک خط

پیارے جناب!

یاد فرمائی کا شکریہ! میں نے بہت خوشی کے ساتھ "مشرق" کا ایک نمبر دیکھا، لیکن آپ معاف فرمائیں گے آپ کو دیر میں میرا خیال آیا اور یہ ایک حد تک میری لٹریری حق تلفی تھی،

صفحۂ دوہم سے "مشرق" جہاں تک میں دیکھ سکا ملک کے رائج الوقت پرچوں کی ایک "ارتقائی" صورت ہے اور امید ہے، آپ کے قلم کے سایہ میں وہ جراید عصریہ میں ایک نصابی پرچہ ہو کر رہے گا،

آجکل مہذب ممالک میں جتنے نمود کے پرچے ہیں ان میں لٹریری یعنی ادب کے ساتھ سیاسیات کا پہلو قوی تر ہوتا ہے اور میرے خیال میں کسی پرچے کی تکمیل کے لئے جن اجزائے ترکیبی پر بالتخصیص توجہ کی ضرورت ہے وہ بھی دونوں عناصر ہیں، یعنی ادب و سیاسیات جنہیں اخبار کی روح رواں یا دل و دماغ جو چاہے کہیے، آپ کا مذاقِ سلیم خود ان سے طبعی مناسبت رکھتا ہے، اس لئے میرا کچھ کہنا سننا "حکمت بہ لقمان آموختن" سے بھی زیادہ گیا گذرا ہوگا، پالیٹکس تو وقت کی چیز

ہے، آپ مسائلِ متوثرہ پر سنجیدگی سے لکھتے رہتے ہیں، ہاں مصری لٹریچر پر ایک نگاہ سے ہے، آپ کی عربیت خاصی ہے، اقتباسات میں امتیازی جھلک ہونی چاہیئے، جو رفتہ رفتہ آپ کے پرچہ کا ایک خاصہ ہو جائے،

آپ نے اپنے عنایت نامہ میں "چندے" کا کچھ ذکر نہیں کیا، ہمارے ہاں اونچے طبقوں میں بھی "بدلِ الاشتراک" ایک امرِ غیر عادی ہے، یعنی ادائے قیمت کا دستور نہیں!

اخبار صرف توکل پر چلتے ہیں، لیکن میری نیت میں فتور نہیں ہے، گو اس وقت باتیں بنانے پر اکتفا کر سکا، اور جب تک چندہ ادا نہ ہو جائے میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ میری بہترین خواہشات آپ کے ساتھ ہیں،

(مشرق۔ ۱۹۰۹ء)

مشرق

اور

انشا پردازی کا دورِ جدید

پیارے برہم! میں دیکھتا ہوں "مشرق" موضوعِ اخباری کے لحاظ سے نسبتہً اور پرچوں کے مقابلہ میں اس قدر سطحِ فائقہ پر ہے کہ میں نہیں جانتا غور کرنے پر بھی کوئی نئی بات کہہ سکونگا جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آپ اس کے قوام میں بہتر سے بہتر اجزا سے مدد لیتے ہیں جو لائقِ حصول ہو سکتے ہیں،

لیکن اس وقت مجھے اس کی ایک حیثیتِ اضافی یعنی انشا پردازی پر مختصراً کچھ عرض کرنا ہے، کچھ دنوں سے آپ نے لٹریچر کے بعض نازک مسائل چھیڑ دیئے ہیں، آپ کے دلچسپ عالمانہ تنقیدات کے سوا اشہری کا پچھلا مضمون نہایت قابلیت سے لکھا گیا تھا، اس لئے ضرورت ہے کہ "مشرق" میں ایک مستقل عنوان یعنی "دائرۂ ادبیہ" قائم کیا جائے جس کے تحت میں شائقینِ قلم کی نکتہ سنجیاں جگہ پاتی رہیں، آپ کے ساتھ اگر اور صاحبوں نے بھی توجہ کی تو اس سلسلہ کا جاری رکھنا

بڑی بات نہیں،

میں اس لحاظ سے کہ آپ میری تحریک کو محض زبانی جمع خرچ نہ سمجھیں اپنے خیالات کی پہلی قسط بھیجتا ہوں جس کا موضوعِ سخن "ناصر علی کا اُردو لٹریچر ہے جن کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی کی نسبت مجھے اصرار ہے کہ ملک کی انشا پردازی میں امتیازِ خاص رکھتی ہے، اور ظلم ہے اگر اُردو کے آشنائے ازلی کے کمالات کی داد نہ دی جائے، جس کا فیاضانہ اعتراف خود لٹریچر کے فرائض میں سے ہے"

آپ نے میری ایک سرسری تحریر کو پچھلی دفعہ اس قدر چمکایا کہ میں دیکھتا ہوں، مجھے بہ تکلّف بننا پڑا ! جس کے آثار آپ کو ان اوراقِ پریشان میں ملیں گے جو بھیج رہا ہوں،

(مشرق ۱۹۰۹ء)

دائرۂ ادبیہ

کھلی چٹھی

بخدمت جناب خان بہادر سید ناصر علی صاحب بالقابہ ایڈیٹر "صلائے عام" دہلی

جناب من! یاد فرمائی کا شکریہ! پوچھے دیکھے، مدت کی چوٹ ہوول کا چوری ہوئی تھی اُبھر آئی، میں آپ کے لٹریچر کا اس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا، کم و بیش بیس برس ہوئے جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری کیا یعنی "تیرھویں صدی" میں داد سخن دی "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار مضامین لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس سلیقہ اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی شہرانی رسم پیدا کی ہے وہ اُردو لٹریچر کی جان ہیں، آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہل قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دینگے لیکن میں کھل کر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس وقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے، آپ کا ادبی مذاق اور خاص طرح کا مادۂ اختراعی (اریجنیلٹی) دراصل آپکے ادبیات میں داخل ہونے کے لائق ہے، موجودہ نسل تمامتر "تہذیب الاخلاق" کے ادبی دور کی پیدا کردہ ہے، جب

آپ کے لٹریچر کا شباب تھا، اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے "تیرھویں صدی" میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں آپکا عنصر غیر فانی ہے، لیکن افسوس ہے آپکو یہ خیال نہ آیا کہ جس سے پچھلے دنوں استنے دماغی سابقے رہے ہیں وہ ہیئتِ مجموعی کتابی صورت میں جلوہ گری کا حق رکھتی، اس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اُردو ادب العالیہ (کلاسکس) میں آپکی طرف سے مستقلاً قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگارِ زمانہ رہتا، آپ معاف فرمائیں گے، یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے، یہ خیال قطعاً صحیح نہیں ہے کہ ملک میں اچھے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں، نئی نسل کو آپ کی اُردو سے کچھ واسطہ نہیں ہے، نہ ہیئتِ موجودہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ آیندہ کچھ کر سکے، صاف بات یہ ہے کہ جس لٹریچر پر آپ مٹے ہوئے ہیں، سر سے اس کی جان ہی کے لالے ہیں، جس زبان کی حیاتِ طبعی اوڑھے نذیر احمد اور حالی و شبلی کے دم تک ہو وہ سسک سسک کر کب تک چل سکتی ہے؟ آپ سے کچھ امیدیں تھیں مگر اس وقت تک آپ کا صحیح مصرف کچھ معلوم نہ ہو سکا، سنتا تھا لٹریچر بڑھاپے میں جوان ہوتا ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں آپ کے ساتھ آپ کی طبیعت کا رنگ بھی کچھ بدل سا گیا ہے، یعنی خیالات میں ایک طرح کی بے رنگی پائی جاتی ہے اور وہ بات نہیں رہی جو کبھی پہلے تھی، شاید اس لئے کہ "تہذیب الاخلاق" کی طرح کوئی چیز ابھار پیدا کرنے والی نہیں رہی، یعنی جذبات کے اکسانے کا سامان نہیں رہا،

ملک میں اچھے لکھنے والے کم ہیں، ان میں بھی تھوڑے سے ہی ایسے ہیں جو آپکے رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکیں، مرحوم ریاض (خدا ستم تنوں زندہ رکھے) اور ہم تم

اشہری کے دل سے پوچھئے، ناصر علی پھر کہاں؟ صلائے عام کی ترکیب با وصف حُسن ظن کے جو آپ کی طرف سے ہے کچھ پسند نہ آئی، اس سے تو ناصری اچھا تھا، "خاصے کی چیز" اور "وقفِ عام"! ایک طرح کا بے تکا پن ہے، اس سے آپ کے مذاقِ انشا پردازی پر نکتہ چینی منظور نہیں، بلکہ آپ کو اپنے ڈھب پہ لانا ہے! بیسویں صدی میں جو پرچہ آپ سے باکمال کے قلم کے سایہ میں اور وہ بھی عروسِ سخن کے میکے یعنی "دلی" سے نکل رہا ہو اس کا نام میں آپ کی جگہ ہوتا تو بے سوچے سمجھے

"ارتقاء"

رکھدیتا، نام اتنا باکیف تو ہو جس سے پرچے کی علتِ غائی یعنی آپکے ادبی تخیل (لٹریری آئڈیل) کا پتہ چل سکے، تقطیع بھی مجھے پسند نہیں، ولایت کے نامی رسالے تو آپکے پیشِ نظر ہونگے، دُور کیوں جائیے؟ "الندوہ" کی نصابی تقطیع کو اختیار کیجئے جو نہایت موزون ہے، بنیوں کا بہی کھاتہ ٹھیک نہیں! یہ لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا آپکے قدردان کہاں سے آئینگے؟ موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی یا کم سے کم میری طرح نہیں جانتی، اور یہ آپ ہی کا قصور ہے لیکن "ہر فعل خود اپنی مکافات ہے" دنیا میں رہنے اور اچھی طرح رہنے کا اس قدر حق ہے کہ جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑ جیئے، اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہ ہے کہ تیرہویں صدی اور متفرق پرچوں میں آپ نے جو کچھ لکھا لکھایا ہے، اہتمام کے ساتھ ایک دم سے شائع کردیجئے لیکن مضامین نمبر نہ ہوں، آپ رسالہ میں گاڑھے کا پیوند بے جوڑ رہیگا، اگر یہ نہ ہوا تو میں سمجھونگا میرے منہ میں خاک! آپ جیتے جی مر گئے، اور لٹریچر کے خونِ ناحق کا بارِ گراں جو گردن پر رہا

وہ علیحدہ، یہ اصرار آپ کے خاص مرتبۂ انشاپردازی کے لحاظ سے ہے، آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے اختصاصی (اسپشلسٹ) ہیں،

میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں، آپ کی چشمِ سخن جہاں "جنسِ لطیف" اور اس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے، وہ نزاکتِ خیال کی آخری حد ہے، تیرہویں صدی میں بہتیرے نشتر ہیں جو آج تک دل میں چبھ رہے ہیں، ابھی ابھی ایک فقرہ نظر سے گذرا،

"یہ پان اُن کے لئے ہے"

بے اختیار جی بھر آیا، اگلے پچھلے قصے پیشِ نظر ہو گئے، پوچھیے تو بتا نہیں سکتا، لیکن کچھ تو ہے جو دل پر چوٹ لگی، رکھ رکھاؤ اتنا تو ہو، ایک چھوٹا سا فقرہ اور عطرِ زندگی!

بوڑھے حالی جو شاعر ہیں، جذبات کے ساتھ بھی عورت تو خیر "چھوٹے کپڑے" سے گھبراتے ہیں، اس قسم کی نزاکتِ خیال کو پسند نہیں کرتے، لیکن انشاپردازی ان سے کبھی قطع نظر نہیں کر سکتی، شوق کی مثنویوں میں سے اگر زوائد کو نکال ڈالئے تو جو کچھ بچ رہے گا، فلسفۂ اخلاق کی جان ہو گا،

یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں پان کل کیلئے بناتے جائیں

ان سیدھے سادے مصرعوں میں جو رکھ رکھاؤ ہے کسی رازدارِ فطرت سے پوچھیے کیا دنیا کی شاعری اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ یورپ میں جو آج بڑے پایہ کے لکھنے والے ہیں، ان میں مذاقِ حسن پرستی اس قدر رچ گیا ہے کہ قریب قریب ان کی ہستی

کا ایک جزو ہو رہا ہے، عورت جسے "خوابِ طفلی اور آرزوئے شباب کہئے،

"ہر بات تری فسانۂ حسن"

ہیئتِ اجتماعی (یعنی سوسائٹی) کی رُوحِ رواں ہو رہی ہے، جس سے کوئی شایستہ لٹریچر دست بردار نہیں ہو سکتا، آپ ان نزاکتوں سے خوب واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ

"عکسِ رُخ موتیوں کے دانوں میں"

"صنفِ نازک" آپ کے دائرۂ تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے آ ہی جاتی ہے، مہر النساء کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے جب اس نے باغ کی ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوترے کر چھوڑ دیئے تھے، پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اس کو دکھایا ہے، انشا پردازی کو آجتک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے، آپ وہ سماں دکھائیے جب مہر النساء "جوانِ بیوہ" کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے، لیکن ہائے وہ حُسنِ افسردہ جو خود اپنی قوتوں سے واقف ہو خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی،

شبِ امید بہ از روزِ عیدمی گردد　　　　که آشنا به تمنائے آشنا خفته است

جہانگیر ایک روز اسکے کمرہ میں جا نکلا جو ضیائے حسن سے "شیش محل" ہو رہا تھا، حور وش کنیزوں کے حلقہ میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے "فطرت کی لاڈلی" "ہمہ غمزہ ہمہ عشوہ ہمہ ناز" نہایت سادے باریک سفید لباس میں تھی، لیکن شیشے کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا،

کلائی وہ نازک سی ہیرا تراش　　　وہ محرم ہیں سربستہ اک راز فاش

"مقیاس الشباب" کی سرکشی بتا رہی تھی کہ وہ دستانے کی طرح چپکی ہوئی محرم سے زیادہ اُودی اُودی رگوں کے پیچ وخم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے، اس پردہ کا فوری برہنہ حصہ اُفق! خیال کیلئے کیا باقی رہا؟ غرض مہرالنساء عالمِ تصویر بنی ہوئی تھی، شاہی نگاہیں جسم کرحُسنِ عریانی کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھیں کہ ایک کہربائی قوت نے بجلی کے تاروں میں نہیں! زلفِ عنبریں کے پیچوں میں "جہاں پناہ" کو جکڑنا شروع کیا، شاہانہ تمکنت نے دیکھتے دیکھتے حُسنِ گلوسوز سے شکست کھائی، جہانگیر سے ضبط نہ ہوسکا، دل کا چور زبان پہ بول آیا:-

"تمہارے اور تمہاری لونڈیوں کے لباس میں کیوں فرق ہے؟"

اس کا جواب جو کچھ ملا، اسی کا حصہ تھا جو آگے چل کر "نورجہان" ہونے والی تھی:-

"یہی میرا لباس لازماً اوروں سے مختلف ہوگا، کیونکہ اسے شاہی خواہشات کے زیر اثر ہونا چاہیے"

ذرا دیکھئے گا کیا کہہ گئی؟ جتنا کہا نہیں اس سے زیادہ تخیل کے لئے گنجائش چھوڑ دی،

ایک فلاسفی نے کیا پھبتی ہوئی بات کہی کہ "دنیا میں جہاں کہیں حسین عورت ہے، میری رشتہ دار ازلی ہے، یہ تعلق فردِ انسانی میں ہمیشہ سے ہے اور وراثتِ طبعی کے قاعدے سے ہمیشہ رہیگا، ہماری تمہاری خاک سے اور اٹھیں گے! اور یہ سلسلہ قائم رہیگا، وہ کہتا ہے "مجھ کو صرف ایک تخیل کی ضرورت ہے جو فانی زندگی کا ایک خیالی سہارا ہو اور اسی پہ نہایت خوشی سے قانع رہونگا، کیونکہ معلوم ہے دنیا دیکھنے کے لئے ہے، برتنے کے لئے نہیں ہے۔"

اس قسم کے بہتیرے نکتے ہیں، مگر دکھائے کون؟ "آزاد" جیتے جی مر گئے، آپ باتوں باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں، کیا اچھا تھا اگر آپ "بیسویں صدی کا مناظرہ" لکھتے "اخوان الصفا" کے رنگ میں ایک خیالی مجمع الفصحاء (لٹریری اکیڈیمی) ترتیب دیجئے، پورا دائرہ ہو، اراکین بحث یعنی اخلاقی، مذہبی، افادی، اقتصادی اور فلسفی وغیرہ مختلف الموضوع عناصر اگر جمع ہو گئے اور ان سبھوں میں آپس میں دماغی ٹکر ہوئی تو لطف آجائے گا، کچھ نہ سہی خیام کے فلسفہ پہ ریویو کر ڈالئے اور اور جو ننے پتے کی کہہ گیا ہے، ناآشنایانِ حقیقت کو سمجھا دیجئے، بیچارہ یورپ کے ہاتھوں جی رہا ہے، ایشیا میں بے طرح اس کی مٹی خراب ہے، ثقہ لوگ اُسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے، نہ جاننا بھی ایک مزے کی بات ہے، اس قسم کی بے مہریاں لٹریچر پر ایک بدنما داغ ہیں،

آجکل سرمایہ دار وہی سمجھا جاتا ہے جو پچھلوں کے جمع کردہ مواد میں تصرف بیجا یا بجا کر سکے، آپ میں مادۂ اختراعی کی کمی نہیں، مواد موجود ہے، یورپ سے لیجئے اور خیالات کو پھیلا کے سمیٹئے اور لکھئے، غزالی اور ابن رشد کا محاکمہ بہت دلچسپ تھا لیکن ضرورت تھی کہ زیادہ پھیلاؤ ہوتا اور لگے لپٹے مسائل میں سے کچھ نہ رہ جاتا، مختصر یہ کہ جس پیمانہ پر آپ لکھ رہے ہیں میرے توقعات اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں اور یہ امر آپ کی عظمت کے ثبوت میں ہے، نری باتوں سے خواہ وہ کتنی ہی پیاری ہوں اگر بار بار دہرائیے تو جی اکتا جاتا ہے۔ متعدد ادھورے مضامین کی جگہ ایک آدھ لکھئے لیکن ذرا دل لگا کر، کم سے کم ایک مضمون خالص فلسفیانہ

رنگ میں ہو جیسے جامعیت اور رکھ رکھاؤ کی حیثیت سے آپ اختراعِ فائقہ (ماسٹر پیس) کہہ سکیں،

نئے گروہ سے کچھ امید نہ کیجیے، ان کے ہاں اس وقت تک صحیح علمی مذاق کا پتہ نہیں، نہ پڑھنا لکھنا ضروریاتِ زندگی میں داخل ہے، قومی لٹریچر سے بیگانگی، جیسا اس سے پہلے کسی موقع پر لکھ چکا ہوں، ایک طرح کی نمود سمجھی جاتی ہے، اور سچ یہ ہے کہ انگریزی شاید کچھ آتی بھی ہو، اردو تو خیر سے قطعاً نہیں آتی، انگریزی کی غیر ضروری آمیزش نے روزمرہ کا جس طرح خون کر رکھا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں، اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی کو احساس نہیں، مغربی تمدن اور شایستگی کے دلدادہ جہاں یورپ کی تقلید پر مٹے ہوئے ہیں، ایک خاص مسئلہ میں اجتہاد سے نہیں چوکتے، یعنی تکلفاتِ زندگی کے اسراف کے ساتھ بھی قومی لٹریچر پر کچھ صرف کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایسا گناہ ہے جس کی باز پرس ہو کر رہے گی، ایسے افراد کہاں تک آپ کے توقعات پورے کر سکیں گے؟

بہر حال آپ سے جو کچھ ہو سکے کئے جائیے اور یہ تو میں تفصیل کہہ عرض کر چکا کہ آپ سے کیا چاہتا ہوں! مغربیت کے اثر سے نئے نئے عنوانِ زندگی پیدا ہو گئے ہیں، ان میں سے کسی بحث کو چھیڑیئے، آجکل عوائدِ رسمیہ (ایٹی کیٹ) اور ارتقائے لباس پر جو نہایت اہم مسائل ہیں کچھ لکھئے لکھائیے تو سب سے پہلے آپ کے دل و دماغ کے نتائج کی داد جس سے ملے گی وہ میں ہوں،

(صلائے عام سنہ ۱۹۱۰ء)

خوابِ طفلی

اور

آرزوئے شباب

"آپ کے خیال میں صنفِ نازک یعنی عورت کو کیا ہونا چاہیئے؟"

"صرف خوبصورت! جس کی سرسری جلوہ گری یعنی ایک جھپک اچھے اچھوں کے لئے صاعقۂ جانسوز سے کم نہ ہو۔" ایک مغربی شاعر کہتا ہے:۔

"عورت او عورت تو مجسم عشوہ گری ہے! اور دُنیا میں بے فوج کی سلطنت کر سکتی ہے، تیرے فتوحات خالص اخلاقی ہیں یعنی تو دِلوں پر حکومت کرنے والی ہے!"

میرا خیال ہے اس پر کچھ اضافہ کی ضرورت نہیں،

سچ کہئے عذرا واقعی بہت حسین ہے؟ حسین تو ایک معمولی اور سرسری لفظ ہے" عورتیں سبھی اپنی اپنی جگہ حسین ہوتی ہیں، لیکن میں اپنے تخیل میں اوروں سے اس قدر مختلف ہوں کہ صرف گوشت پوست سے کام نہیں چلتا، عذرا میری عذرا تو نظمِ زندگی یعنی پوری شاعری ہے اس کی آواز کامل موسیقی، اس کا تبسم میرا عنصرِ حیات ہے، وہ قطعاً توبہ شکن ہے، توبہ شکن اور کافرِ بیان، ناممکن ہے کہ نظر پڑتے ہی اس پر قابو حاصل کرنے کو جی نہ چاہے جہاں آنکھیں ملیں، بس یہ معلوم ہوتا ہے تمام جسم میں

بجلی دوڑ گئی، مدت ہوئی جب میں پہلی نظر میں شہید ہوا، دل سے آواز آئی: "خدا بخیر"!
جس کا نتیجہ آجتک بھگت رہا ہوں، مجھ پر اتنا سخت وار کبھی نہیں ہوا، کچھ تو ہی جسکی
وجہ سے مٹا ہوا ہوں، میری آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت ہی لیکن خود مجھے معلوم
نہیں کس ادائے خاص کا دلدادہ ہوں، پچھلی دفعہ بہت اتری ہوئی حالت میں دیکھا،
پھر بھی ایک بات تھی، آجتک عالم تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہی! "کیا عذرا آپکے دل
کا راز جانتی ہی؟" ہاں ہاں خوب جانتی ہی کہ میں اس پر مٹا ہوں لیکن تم کو ہندوستانی
سوسائٹی کی حالت معلوم ہی، ہمارے ہاں جائز عشق کا پتہ نہیں، نہ جذبات قوت سے
فعل میں آسکتے ہیں، یہ بات مہذب اقوام میں ہی کہ عقد سے پہلے بیگانگی نہیں رہتی، اسکا
افسوس ہی کہ میں نے عذرا کے لئے ایک نئی خلش پیدا کر دی اور ایک ایسی فضائے
بسیط پیش نظر کر دی جس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں، برسوں کے فتنۂ خوابیدہ کو چھینٹے دے
دے کر جگا دینا بھی ظلم تھا، حصول آرزو جسے شعرا اپنی اصطلاح میں "وصل" کہتے ہیں، ایک طرح
کی خود غرضی ہی، انتظار و ناکامی میں ایک لذت خاص ہی، اور چونکہ مجھ کو عذرا کے ساتھ
خالص روحانی تعلق ہی، اس لئے گو وہ مجھے گلے کا ہار نہ بنا سکے تاہم میں اس کی پرستش سے
جیتے جی کبھی دست بردار نہ ہوسکونگا، وقت گزر جائیگا، قصے رہ جائیں گے، خیر سے میں
کیا ہوگا؟ یہ نہ پوچھو، میں وہ پھل چاہتا ہوں جو ڈال میں ٹپکا اور پکا پکایا ہو، ادھ کچرے
یعنی ثمر خام کی ضرورت نہیں نہ پال ڈالنے کی فرصت، عذرا کا موجودہ سن و سال
عطر زندگی ہی اور عشق و محبت کے ولولے اسی زمانہ میں زیادہ ہوتے ہیں، سو بات کی ایک
بات یہ ہے کہ مجھ کو پسند ہی اور وہ مدتوں اتنی رہیگی کہ مجھ پر فتوحات حاصل کرتی رہے،

مجھے اسکے ہوتے دنیا میں کسی اور کی ضرورت نہیں بعضوں کا خیال ہے جنت میں حوریں ملیں گی لیکن جنکو ملیں گی ان ہی کو مبارک! میں ادھار پر نقد کو ترجیح دیتا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ "خیام" کا ہمخیال ہوں، جھونپڑوں میں محلوں کا خواب دیکھنا نہیں چاہتا کسی سبزہ زار یا بہتے ہوئے چشمے کے کنارے عذرا کی مخمور آنکھیں اور ایک جام شراب میری اصلی غایت زندگی ہے جس کے سوا دنیا سے کچھ نہیں چاہتا، یہ بہشت موجودہ دوبارہ نہیں پیدا ہوگا، اس لئے کس قدر ضرورت تھی کہ وہ چار پہریں جو لطف سے کٹنے تھے بیکار نہ جاتے، کل کی بات ہے میں نے شاہی کھوئی ہے، پھولوں کی سیج یاد ہے، کاش عذرا مل جاتی، وہ میری نوجوانی اور زندگی کے تمام صیغوں کی حکمران ہوتی، اسے دنیا کے سامنے شائستگی اور زندہ دلی کا نمونہ بنا کر پیش کرتا، اس کی موزونیت سے طرح طرح کے فائدے اٹھاتا، بہرحال خدا جانے کیا کیا کرنا چاہتا ہوں لیکن کوئی چیز چاہت کی اکسانے والی تو ہو؟ عذرا، میری اسسٹنٹ ہوتا اور وہ لٹریچر میں جان آجاتی لیکن لوگ نہیں سمجھتے اور سمجھیں کیونکر! ان کے ہاں "جنس لطیف" کا مصرف یہ ہے کہ ہانڈی چولھے کے لئے وقف رہے، گول خانے میں چوکھنٹی چیز کس قدر بے تکا پن ہے! افسوس! مجھے سرے سے مطلب برآری کی امید نہیں دیکھنا محض عالم خیال سے سروکار رہا، شروع سے میرا حصہ رسدی اتنا ہی تھا! دنیا میں غایت زندگی کیا ہے؟ صرف حصول مسرت! اور یہ ایک خیالی چیز ہے جاگے تو کسی خیال میں اور سوئے تو اس طرح :-

شبِ امید بہ از روزِ عید می گذرد   کہ آشنا بہ تمنّائے آشنا خفتہ است

غرض اٹھتے بیٹھتے ہر وقت ایک "عالمِ تصویر" خیال میں ہو جس سے جینا تو جینا مرنا کس قدر آسان ہوا جاتا ہے؟

فلسفیوں سے آج تک "حسن" کی جامع تعریف نہ ہو سکی، بہت زور لگا کر بھی اس قدر کہہ سکے کہ حسن ایک طرح کے تناسبِ اعضا کا نام ہے، لیکن آؤ میں تمہیں بتاؤں، یہ جو گوری چٹی، کشیدہ قامت، چھریرے بدن کی، کچھ چرائے چھپائے بجتی ہوئی آ رہی ہے، ذرا غور سے دیکھنا! اندھیرے میں بھی اس کا چہرہ کتنا چمک رہا ہے، یہ جیتی جاگتی "زہرۂ شب" تمہارے دل میں جگہ پائے گی، کچھ معلوم بھی ہے کون ہے؟ غور سے دیکھو، وہ بہترین "عطیۂ فطرت" جسے شعرا "دفینۂ حسن" کہتے ہیں، اور آجکل کی اصلاح میں آپ "مخزنِ جذبات" (یعنی بیٹری) کہیے،

بیخود تھے شراب پینے والے   مستی میں اُلٹ دیئے پیالے

جس سے برقی رو تمام جسم میں دوڑ جاتی ہے، اُسے امنگوں کی طرح بیتابانہ اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہے! ذرا پردے پردے میں جوانی کی سرکشی دیکھئے گا، چھنتے ہوئے کپڑے گویا خود سانچے میں ڈھل گئے جس کا جائزہ آنکھوں آنکھوں میں بھی جلشِ خالص سے کم نہیں، فطرت کا یہ نازک تر، لطیف تر ثمرِ "پلیٹن رس" دراصل فلسفۂ حسن کا عنوانِ اولین ہے، یہاں ہوس سے کام نہیں چلنے کا، اس چیز کی تلاش ہے جو فطرت کی عام فیاضیوں کے ساتھ بھی نایاب ہے، کیونکہ میں جس صاف شفاف سینہ کو سینے سے لگانا چاہتا ہوں ضرورت ہے کہ پہلو میں

وہ ایک شریفانہ دل رکھتا ہو" رفیقِ زندگی" ہونے کی پوری صلاحیت کے ساتھ ہمدرد و ہمخیال ہو یعنی دائرۂ اوصاف کے لئے کچھ باقی نہ رہے، کتنا اچھوتا تخیل (آئیڈیل) ہے، فلسفۂ اخلاق سے جانچئے "اقتضائے نفس" ایک دم سے "شایانِ حال" ہوا جاتا ہے! بڑے بڑے زاہد و مرتاض عمروں کے ریاض اور مکاشفہ کے بعد بھی "رازِ ہستی" کو نہ سمجھے، نہ کسی نے زندگی کو "از گہوارہ تا گور" نظرِ غائر سے دیکھا، مقصودِ اصلی کی تلاش تو خیر! ابھی سرے سے یہی نہیں معلوم "زندگی کیا ہے"؟ کہاں سے آئے؟ کیوں آئے؟ کہاں جائیں گے؟ اور یہ چند روزہ ہستی فنا سے پہلے کیا چاہتی ہے؟ ہستی موجودہ بری ہو یا بھلی اسکے حقوق کا اقتضار کیا ہے؟ بس یہی کہ "کسی کو گلے سے لگائیے" بڑے سے بڑا فلسفۂ زندگی یہی ہے، یعنی "حصولِ مسرت" کے سوا کوئی غایتِ ہستی نہیں، یہاں کی ہو یا آپ کے حسنِ ظن کے مطابق کہیں اور کی، بات ایک ہی ہے، ہم یہاں نپٹے لیتے ہیں، آپ وہاں سمجھ لیجئے گا، بشرطیکہ یہاں وہاں دونوں جگہ احمق نہ رہئے! یہ صاف صاف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرے ہاں دل اور زبان ایک چیز کے دو نام ہیں، دوسرے چھپاتے ہیں، یعنی وہ نہیں کہتے جسے دل چاہتا ہے،

بھئی کہتے تو ٹھیک ہو، ایک بات اور بتادو کیا عذرا تم کو چاہتی ہے؟

بوڑھے بچے! یہ اس کا راز ہے تم نہ پوچھتے تو اچھا تھا! (دل کی بیقراری آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑی) ہاں وہ دل سے چاہتی ہے، خیالی کانوں سے سنو! وہی زبان سے کڑھی کیا کہہ رہی ہے،

دل تو نذر کر چکی جان باقی ہے وہ بھی قربان کر دوں گی، آپ کہتے تھے عذرا
چور ہے، لیکن چوری کی اچھی سزا مجھے ملی، راتیں رو رو کر کاٹتی ہوں، خدا جانے
کیا روگ ہو گیا ہے، کھانے پینے کی طرف رغبت نہیں، نہ کسی بات میں جی
لگتا ہے، کوئی پوچھتا ہے تو ٹال دیتی ہوں کہ "طبیعت اچھی نہیں"! مصیبت یہ
ہے کہ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی، صرف گنہگارِ محبت ہوں!

دل تو نذر ہوئی کھو چکی، ہاتھ بھی اب حاضر ہے، کیونکہ اب اس لائق
ہو گئی ہوں، آپ اطمینان رکھیں، عذرا اور بے وفائی؟

خدا اس دن کے لئے نہ رکھے! بیوی بنوں گی تو آپ کی، ورنہ عمر یونہی
گذار دوں گی، یاد رکھئے میں آپ کی ہو چکی! ذرا دل میں وہم نہ لائیے گا، اسے پتھر کی
لکیر بلکہ نوشتۂ تقدیر سمجھئے، آپ کی اور صرف آپ کی،

سیرتِ صورت پرستاں اور ہے — مذہبِ الفت پرستاں اور ہے
دُرد چکھتے ہیں وہ صہبا اور ہے — بادۂ نابِ مصفا اور ہے
جس کے ہم جویاں ہیں وہ شئے اور ہے — چور ہم جس سے ہیں وہ خُو اور ہے
شے ہوائی اور پیمانہ ہے اور — عشق کے مستوں کا میخانہ ہے اور
جب سے دیکھا اس کا جلوہ آنکھ سے — غیرِ عذرا کچھ نہ دیکھا آنکھ سے
سامنا ہے آفتابِ عشق سے — مست بے خود ہوں شرابِ عشق سے

راقم

ہم ہنسی کھیل سمجھتے تھے لگانا دل کا — اب یہ جانا کہ اسے کہتے ہیں آنا دل کا

([illegible] سنہ ۱۹۱۰ء)

پر

ایک فلسفیانہ نظر

آجکل کے معیارِ زندگی میں بڑی مصیبت یہ ہے کہ "دوم درجہ" کوئی چیز نہیں، یا تو صرف "لنگوٹی" ہو! جہاں اس سے بڑھے پھر بیچ میں رکنے کی گنجایش نہیں، ایک دم سے "اوّل درجہ" اختیار کرنا ہوگا، اصولِ ارتقاء کی "تدریجی رفتار" سے کام نہیں چلتا، درمیانی کڑیاں ملائیں، یعنی اپنی طرف سے کچھ "ایجاد بندہ" کی اور گئے! ذلیل ہوئے وہ علیحدہ! بہرحال یہ مغربیت کا ایک راز ہے جس سے کسی طرح مفر نہیں، ہزار سمجھئے چلائیے "بیچ" سے کام نہیں چلنے کا! "گر یا" شوق سے رکھئے پھر بھی یکرنگی (یعنی ایجنیٹی) ہے، مگر جہاں ایک قدم آگے بڑھایا یاد رکھئے، قطعاً "مغرب" رکھنا ہوگا! یہ فقرہ معترضہ خود ایک مستقل عنوان چاہتا ہے، جسے پھر کبھی دیکھئے گا، یہاں میری غرض "دوم درجہ" کے اظہارِ خیال یعنی "شعر العجم" پر ایک غیر مستاثر جنبشِ لب سے ہے۔

ایک صاحب نے اپنے دوستوں کے اصرار سے "شعر العجم" پر تنقید نہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ صرف تنقیص کی ٹھہرائی ہے اور بزعم خود "تصویر کا رخ تاریک" دکھایا ہے، لیکن

ان کے خود رو خیالات کا بیشتر حصہ اہل تنقید (یعنی کریٹک) کی قلم آزمائی کیلئے بجائے خود ترغیب دہ مواد ہے، ملک میں اچھے لکھنے والے دو چار سے زیادہ نہیں ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو کسی موضوع پر "تنقید عالیہ" (یعنی ہائر کریٹی سزم) کی صلاحیت رکھتے ہوں شکسپیر کا وقیع ریویو ڈاکٹر جانسن لکھ سکا جو باعتبار وسعت معلومات اور مذاق "ادب القدما" (یعنی کلاسیکل حیثیت سے) دنیا کے سب سے بڑے "شاعر" کا گویا مدّاعلیٰ تھا،

میرا خیال ہے ملک میں ایسے نفوس قدسی صدیوں میں پیدا ہوں گے، جو منصفانہ تنقید اور تنقیص بیجا یعنی عیب گیری کی حدّ فاصل کا احساس کرسکیں، اس لئے بے محل جنبش لب سے خاموشی اچھی، آپ خیر سے گونگے ہوں تو اعتراض کی بات نہیں، لیکن بولئے آدمی کی طرح نہ بولئے تو مجھے ضرور شکایت ہوگی، اس خلوص اور سچ کا کیا ٹھکانا ہے کہ "شعر العجم" کے جزئی عیوب بھی ریویو نگار کے خیال میں اتنے ہیں کہ اگر وہ ابھار کر دکھائے جائیں تو ایک دوسری کتاب تیار ہوسکتی ہے،

حضرت کی نیت کی طرف سے اگر شروع ہی میں مجھے شبہ پیدا ہوگیا اور آگے چل کر میں ان کا ساتھ نہ دے سکوں تو یہ میرا قصور نہیں! خود ان کے دل کا کھوٹ ہے، جو بگڑی ہوئی زبان پر آہی گیا، اور جس سے ایک کافی حد تک انکی پاک نیتی کی غمازی ہوتی ہے،

(۱) اسلم کا یہ اعتراض کہ ہر زمانہ کی شاعری کے جداگانہ دور نہیں قائم کئے گئے، صرف فصاحت کا ایک دھوکا ہے "شعر العجم" کے تین حصے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں اور جہانتک میں دیکھ سکا پہلے حصہ میں متقدمین کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے، دوسرے میں متوسطین اور تیسرے حصہ میں شاعری کے آخری دور یعنی متاخرین سے بحث کیگئی ہے، کتاب کی

اجمالی ترتیب جیسا کہ خود علامہ شبلی نے تصریح کردی ہے، یہی ہے اور یہ نہیں جانتا، ادبی حیثیت سے جو خاکہ فاضل مؤلف کے پیشِ نظر تھا، اس میں "ایجاد بندہ" کی کہاں تک گنجایش ہے،

مجھ کو معلوم ہے پروفیسر براؤن نے مسلمانوں کی دماغی تاریخ لکھی ہے، اس کے دور سیاسی اور ملکی حیثیت سے قائم کئے ہیں، ہر دور کے ادبی ترقیات وہ ساتھ ساتھ دکھاتا گیا ہے، اور عجمی عنصر کو الگ کرتا گیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ میں کیمبرج کے ایک دوسرے پروفیسر کی جدید تالیف سے بھی واقف ہوں جو عربی لٹریچر کی ایک جامع تاریخ ہے لیکن مؤلف نے صرف ادبی دور سے غرض رکھی ہے اور دیباچہ میں صاف لکھا ہے کہ اس کا "موضوعِ بحث" عربوں کے "ارتقائے خیال" کے سوا کچھ نہیں ہے، "شعر العجم" کی ترتیب بھی نفسِ لٹریچر کے لحاظ سے ہے، لیکن اسلم کی "بہ شیر اللہ" چشم پوشی ہے کہ وہ چار آنکھیں رکھکر بھی دیکھ نہیں سکتے، یا شاید دیکھنا نہیں چاہتے اور بڑی متانت سے فرماتے ہیں کہ "مولانا شبلی اپنے فرضِ اولین تک کا احساس نہ کرسکے"! اے ہے ہر دور کی خصوصیات اور ان کے اسباب یعنی شاعری کے ارتقائے تدریجی کی موشگافیاں! اس نکتہ کو شبلی اسلم سے زیادہ سمجھتے ہیں،

شبلی، ملک میں پہلے شخص ہیں جنکو تاریخ و فلسفہ میں ربطِ باہمی کا خیال پیدا ہوا، اور وہ ان جواہرِ عقلی کی تحلیل و ترکیبِ کیمیائی اس طرح کرسکے جس سے لٹریچر میں ایک خاص امتزاج پیدا ہوگیا ہے، انہوں نے اپنے متعدد قیمتی تصنیفات میں ہمیشہ اپنا درجہ قائم رکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ آجکل کے ترقی یافتہ مذاقِ ادبی کے مطابق وسیع سلسلۂ تحقیقات اور زبردست قوتِ استقرائی سے اسباب و نتائج کے تعریفات فلسفیانہ میں

کس طرح کام لیا جا سکتا ہے (مجھ کو اصرار ہے کہ شبلی کی تحقیقات سے جو انکے اولیات
میں داخل ہونے کے لائق ہے ہندوستان کی علمی قلمرو میں ایک نیا تاریخی دور
شروع ہو گیا) سلّم کا سلیقہ تحریر میرے دعویٰ کے ثبوت میں ہے، گو اس کا افسوس
ہے کہ وہ تاریخ کے "معلم اول" سے جس پر ملک کو فخر کرنا چاہئے بُری طرح پیش آئے،
بہر حال شبلی چوتھے حصہ میں نہایت تفصیل سے شاعری پر فلسفیانہ نظر ڈالیں گے اور
یہی حصہ ان کی طبع آزمائی کا اصلی جولانگاہ ہوگا،

(۲) شبلی نے بعض نمود کے شاعروں کو چھوڑ دیا ہے اور بعضوں کا خیال ہو کہ یہ اسی قسم
کی فروگذاشت ہے جو آزاد سے "آب حیات" میں ہوئی لیکن یہ قاصر النظری نہیں ہے بلکہ
ایک مجتہدانہ فعل ہو جس کی تصریح ایک صاحب نے کر دی ہے اور جس کے اعادے
کی ضرورت یہاں نہیں ہے، تاہم اسلم کی خاطر سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں چاہتا تھا کہ
ہر دور کے شعراء کے نام ان کو گنوا دیئے جاتے اور جو مفصل تنقید کے لائق نہیں
تھے ان پر کم سے کم مختصر نوٹ ہوتے، یعنی ارتقائے شاعری کے مستقل ارکان
یعنی اصلی صورتوں کے ساتھ ان کا ہیولیٰ بھی نظر انداز نہ ہوتا، یا منطق کی اصطلاح
میں یوں کہئے کہ جوہروں کے ساتھ اعراض متعلقہ بھی لگے لپٹے رہتے، بات ذرا الگنی ہو گئی
ہے لیکن مجھ کو معلوم ہے کہ چوتھے حصہ میں یہ سب کچھ ہوگا، اور شبلی کی جدت اجتہاد نے
جن شعراء کو ترجیح دی ہو یا جن کو چھوڑا ہے ان کے وجوہ تفصیل سے دکھائے جائینگے،

(۳) یہ تو بالکل ہی غیر صحیح ہے کہ ہر شاعر کا کلام مولانا اس قدر نقل کرتے ہیں کہ جی اکتا
جاتا ہے" میرا خیال ہو جس قدر اقتباسات کئے گئے ہیں ضرورت سے کم ہیں، فارسی

لٹریچر مہذب دنیا میں ادب العالیہ یعنی کلاسیکس کا ایک ضروری عنصر سمجھا جاتا ہے، لیکن آجکل کی کاروباری زندگی میں جب ہم کو مشرقی لٹریچر کی طرف توجہ کرنے کی بالکل فرصت نہیں ہے صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ عربی فارسی لٹریچر کے بہترین اجزاء فلسفیانہ تنقید و تقریظ کے ساتھ نئی نسل کے سامنے پیش کئے جائیں، اس طرح قدیم لٹریچر کا وہ حصہ جو جاننے کے لائق ہے ہمیشہ کیلئے محفوظ رہ جائیگا، لیکن اسلم نہیں سمجھتے،

(۴) اسلم کی "غیر سعادتمندانہ" اُپج میں سب سے زیادہ مجھے جس بات پر لطف آیا، وہ "حکمت بلقمان آموختن" کی جدتِ بے محل ہے، شبلی کی وسیع النظری اور ان کے لائقِ رشک ذرائعِ معلومات پر منہ آنا! سچ یہ ہے "سورج کو چراغ سے دکھانا!"

لیکن اگر "گھر کی مرغی کو ساگ کے برابر" نہ سمجھئے تو مجھ کو مجبوراً اعادہ کرنا پڑتا ہے کہ شبلی کا دائرہ تحقیقات اتنا وسیع ہے کہ وہ یورپ کے مورخین کی صفِ اوّل میں جگہ پاسکتے ہیں، فارسی لٹریچر کے متعلق جن مغربی تصنیفات کی طرف اسلم نے اشارہ کیا ہے وہ ایک ایک کرکے شبلی کے ناخنوں میں ہیں، اسلم نے علی گڑھ کے صدقہ میں ایک آدھ کتاب کا صرف نام سن پایا، یا طاہر ہمدانی کے ہیرن الین ایڈیشن کو کہیں دُور سے دیکھ لیا، لیکن مجھ کو معلوم ہے کہ خود ہیرن الین جس نے رُباعیاتِ خیام کے متعدد مطبوعات خاصہ شائع کئے ہیں اور جن میں سے ایک نہایت قیمتی ایڈیشن صرف دو سو ممبروں کے لئے چھاپا گیا تھا اور جو قطعاً اسلم کی نظر سے نہیں گذرا، شبلی کی ایک سرسری تحقیقات سے بے نیاز نہ رہ سکا، جس میں فارسی کے مسلّم الثبوت استاد "پروفیسر ڈینی سن راس" نے بھی ٹھوکر کھائی تھی لیکن اس کی تصریح کا یہ موقع نہیں؛

بہر حال مجھ کو اصرار ہے کہ فارسی اور عربی لٹریچر کے متعلق جس قدر مواد آج موجود ہے، وہ سب شبلی کے پیشِ نظر ہی نہیں بلکہ جس طرح ولادت سے پہلے جنین کا پتہ چل جاتا ہے، شبلی کے دائرۂ نظر میں یہ بات بھی رہتی ہے کہ انقطاعِ دماغی میں کہاں کہاں نئی داغ بیل پڑنے والی ہے، اور ایشیا میں تو کچھ دم نہیں رہا، مگر یورپ دنیا کے معلومات میں کیا کیا اضافہ کرنے والا ہے؟ اسلم اگر اپنی تنگ نظری کے ساتھ شبلی کے مستشرقانہ کمالات کا اندازہ نہیں کر سکتے تو ہم ان کو معذور سمجھنے کے لئے تیار ہیں، لیکن مجھے جو کچھ شکایت ہے یہ ہے کہ "وہ نہیں جانتے کہ کچھ نہیں جانتے" آج کسی غیر ذمہ دار قلم نے شبلی کی بوالعجب تلقی کی ہوتی تو خود اسلم کہہ اُٹھتے کہ گولر کا کھنگا فضائے دہر پہ معترض ہو یا بر سانی کیڑا زمانہ کے حدوث قدم پہ رائے زنی کرے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا! لیکن میرا خیال ہے میرے معصوم دوست نے جو کچھ خامہ فرسائی کی وہ محقق قصورِ استعداد ہی، اس لئے ہم شبلی سے سفارش کرتے ہیں کہ مشرقی لٹریچر کے متعلق مطبوعاتِ یورپ جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہے ان کی ایک فہرست اسلم کو بھیجدیں، ہندوستان میں بیٹھ کر یہ کیا کم ہے کہ انکو اکٹھے بہت سے نام تو معلوم ہو جائیں گے،

(۵) شبلی کی مسلم الثبوت فارسیت کا اعتراف نہ کرنا، مولانا حالی کے ساتھ حسنِ ظن کے افراط کو صرف تحسین ناشناس ثابت کرتا ہے، ملک میں پروفیسر آزاد کے بعد صرف شبلی ہیں جو فارسیت کا وجدانی مذاق رکھتے ہیں، فارسیت سے میری غرض اس فارسی سے نہیں ہے جو بابو انگلش کی طرح اسلم نے بچپن میں پڑھی ہوگی، بلکہ میری غرض دنیا کی سب سے شیریں زبان سے ہے جو اس قوم کی زندہ یادگار ہے، جو بلحاظ گذشتہ عظمت د

ترقیات کے دُنیا کی قدیم متمدن اقوام میں بھی خاص تاریخی وقعت رکھتی ہے،

انگلستان مستشرقانہ مشاغل کے لحاظ سے یورپ کے اور ممالک سے بہت پیچھے ہے، تاہم وہاں ایک جماعت موجود ہے جو السنۂ مشرقی میں اہلِ زبان کی سی مہارت رکھتی ہے جس میں پروفیسر براؤن آجکل بہت پیش پیش ہیں، یورپ کی ایک خاص طرح کی وسیع النظری میں کلام نہیں، یعنی اصولِ ارتقاء نے تحقیقات کے راستے اس قدر صاف کر دیئے ہیں کہ ہر شئے کے مدارج اور طبقاتِ ترتیبی کی کڑیاں ملتی جاتی ہیں، لٹریچر بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں، تاہم مذاقِ سخن میں جو ایک ذوقی چیز ہے" ان فلسفیانہ اکتشافات سے کیا مدد مل سکتی ہے؟ شبلی جو کچھ لکھتے ہیں آشنائے فن ہو کر لکھتے ہیں" اس لئے ان کے تالیفات مغربی معاصرانہ تصنیفات سے جہاں تک ادبی مذاق کا تعلق ہے نسبتہً ہمیشہ فائق رہیں گے اور یہاں مجھے صرف یہی دکھانا تھا،

(نمبر ۶ - ۷ - ۸) یہ بھی صحیح نہیں کہ شبلی کو موازنۂ انیس و دبیر میں کامیابی نہیں ہوئی" "سوز خوان" طبقہ جو چاہے کہے لیکن "موازنہ" میں جو تعلیم یافتہ فرقہ شبلی کا مخاطب صحیح ہے وہ اس کتاب کو مؤلف کے کمالات میں اختراعِ فائقہ (یعنی ماسٹر پیس) نہ سہی! تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ اُردو ادب میں وہ اسے ایک قیمتی اضافہ سمجھتا ہے" اور جس طرح شبلی کی پیداوارِ دماغی عموماً باستحقاق "صفِ اوّل میں جگہ پاتی رہتی ہے" "موازنہ" بھی تنقیدِ ادبی کی حیثیت سے ایک نصابی (اسٹنڈرڈ) چیز ہے اور وہ میرے آپ کے اعتراف کا محتاج نہیں!

ایک بزرگ سے جو ملک میں لکھنے پڑھنے کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں "موازنہ"

کا ذکر آیا، وہ کچھ چپ سے ہو گئے، مجھے مجبوراً عرض کرنا پڑا کہ موازنہ میں جو کچھ نقص ہے یہ ہے کہ آپ کے قلم کا نتیجہ نہیں ہے، اس برجستہ گرفت پر وہ پھڑک گئے اور ان کو اقرار کرنا پڑا کہ موازنہ سے اہلِ قلم کو جو کچھ شکایت ہو سکتی ہے، اسی قبیل کی ہے، دہلی لکھنؤ والوں سے قطع نظر کئے لیتا ہوں، کیونکہ وہ سمجھتے ہوں گے شبلی کی طرف سے "ارضِ ممنوعہ" یعنی ان کی قلمرو میں مداخلت بیجا کی گئی،

اگر اشعار کی لطافت اور خوبی ایک وجدانی چیز ہے اور اس کا سمجھنا ذوقِ صحیح پر منحصر ہے، اور ان خوبیوں کا دکھانا بڑے اہلِ کمال کا کام ہے" تو میں خوش ہوں کہ شبلی حضرت حالی کے حریف مقابل نہ سہی تاہم وہ شاعری کے ملکۂ راسخہ، اور ادبی نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے اتنی اونچی سطح پر ہیں کہ بڑے بڑے مستشرقینِ یورپ بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے،

یہ بھی غلط ہے کہ شبلی کو تصوف سے مناسبت نہیں ہے، میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ تصوف جیسا کہ اکثروں کا خیال ہے ایک طرح کا خبط متعارف نہیں ہے بلکہ جیسا کہ خود شبلی نے تصریح کی ہے دراصل "تصحیحِ خیال" کا نام ہے جو اخلاق کی طرح فلسفہ کی ایک مستقل شاخ ہے، لیکن جس طرح توکل کا مصداق ایک طرح کی گداگری ہو رہی ہے تصوف کی صورت بھی اتنی بگڑ گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیٹ کا ایک مشغلہ رہ گیا ہے، ہم تصوف کو صرف اس نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں ذوقی اور وجدانی کیفیت کے ساتھ ایک ادبی پہلو بھی موجود ہے، اگر وہ کوئی راز ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آیا ہے تو ہم کو بیسویں صدی میں اسکی طرف متوجہ ہونے کی بالکل فرصت نہیں،

بہر حال تصوف اگر ایک خاص طرح کی لطافتِ جذبات کا نام ہے جو حکیمانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو اور خیام و حافظ اس میں رنگے ہوئے تھے تو شبلی پر بھی اس کی چھینٹیں پڑی ہیں، صوفیانہ ریاضت و اعمال جو قطعاً غیر فطری ہیں بے وقت کی شہنائی سے کم نہیں! ہم مردوں میں "ہیسٹریا" یعنی اختناق الرحم کے خواص پیدا کرنا نہیں چاہتے، نہ تشنج اعصابی اور حرکاتِ رقاصی کے لئے بوڑھے شبلی کہیں سے موزوں ہیں! اسلم اور اُن کے یارانِ طریقت کو یہ ناچ ناچنا (افعالِ صوفیانہ) مبارک دیکھئے یہ نہ کہئے گا؛

اے کہ آگاہ نہ حالتِ درویشاں را — تو چہ دانی کہ چہ سودا بسرست ایشاں را

ایک چیز پر آپ اس لئے سر دھنتے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ آپ کے اچھے اچھوں کی سمجھ میں نہیں آئی، بڑے بڑوں کو ارمان ہی رہا، ہم اس لئے اس سے پیچھا چھڑاتے ہیں کہ ہمیں اس خبط میں پڑنا منظور نہیں، نہ ہماری اخلاقی زندگی کی تکمیل کے لئے کہیں سے اس کی ضرورت ہے، آپ تزکیہ باطن کے پیچھے پڑے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ نفس خود پاک ہے، ذرا دعویٰ کی شرافت دیکھئے گا! یہ اگر جہالت ہے تو دنیا کے بڑے بڑے مستشرق اپنی "بیگانہ وشی" پر ناز کر سکتے ہیں، جنہوں نے تصوف پر نہایت شرح و بسط سے فلسفیانہ بحث کی ہے،

یہ بھی غلط ہے کہ شبلی "بزرگانِ اسلام" کا احترام نہیں کرتے، وہ ان کو لائق ادب "انسان" سمجھتے ہیں جس طرح میرزا قتیل "مجمع صفاتِ کمالیہ انسانی" سے ہی جو سچی تعریف کی آخری حد ہے، اسلم یا ان کے اوہام مشربوں کی طرح ہر کس و ناکس کے ساتھ شبلی اس فیاضی سے پیش نہیں آتے کہ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" پڑھے لکھے

آدمیوں میں "عزتِ نفس" کا خیال اس قدر بڑھ رہا ہے کہ جہاں ہم خود صرف "انسان" ہونا چاہتے ہیں، دوسروں کو بھی اس سے زیادہ "بڑھانا" نہیں چاہتے، آجکل کے عوائدِ رسمیہ (یعنی ایٹی کیٹ) کی رو سے غیر ضروری حسنِ ظن کی افراط صرف "متروکات" میں داخل ہونے کے لائق نہیں، بلکہ ایک طرح کی وہم پرستی اور بیکار دور دوسری ہے جو تقویم پارینہ کی طرح پیچھا چھڑانے کی چیز ہے،

خیام بیچارہ یورپ پہنچکر کچھ غیر ثقہ سا ہو گیا، لیکن حافظ کی بات ایشیا میں اس قدر بنی کہ چھوٹے پیمانہ کے "پیغمبر" سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ رندانہ تو یہ صوفیانہ "خیالاتِ موزون" کے لحاظ سے ان کو صرف شاعر ہونا تھا، شبلی تو پھر بھی ان کو "رئیس الشعراء" سمجھتے ہیں، خیام کی مصطلح مے نوشی کی ضمن میں شبلی کی یہ شاعرانہ شوخی کہ

"افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا، صوفی نہ تھا اور نہ حافظ کی طرح

"یہی شرابِ معرفت بنجاتی"

ادبی نکتہ سنجی کی آخری حد ہے، شعر العجم میں یہی ایک فقرہ تو ہے جو اس قدر "باکیفت" اور صوفیانہ رنگ میں ہے کہ دیکھتے ہی بس یہ معلوم ہوتا ہے جسم میں ایک برقی رَو دوڑ گئی، یہ اسلم کے بھونڈے مذاق کا پھوہڑپن ہے کہ وہ اس نزاکتِ خیال سے لطف نہ اٹھا سکے! اور ستم ظریفی یہ ہے کہ میری بدنصیبی سے ان کو سوجھی بھی تو اعتراض کی سوجھی!

اسی سلسلہ میں محمود کی غیر ضروری ثقاہت پر جہاں اسلم کو اصرار ہے آپ نہایت بلند آہنگی سے فرماتے ہیں کہ شبلی محمود اور اس کے زمانہ کی تاریخ ہی سے

ناواقف نہیں بلکہ ان کو تاریخ کا صحیح مذاق بھی نہیں ملا ہے"۔ غریب اسلم کو معلوم نہیں کہ شاہانہ معیارِ اخلاق بالکل ایک جداگانہ چیز ہے، یورپ میں جو ہیئتِ اجتماعی یعنی سوسائٹی کی مساوات کا مدعی ہے، حلقۂ شاہی آج بھی ایک عرضی شئے یعنی اپنے خصائص کے لحاظ سے دنیا سے بالکل الگ تھلگ خیال کیا جاتا ہے، طبقۂ اوسط تو خیر، اعلیٰ طبقہ بھی بلحاظِ خصائل اس سے اس قدر مختلف ہے کہ دونوں ایک قوم کے افراد مشترک نہیں معلوم ہوتے لیکن ان شاہی حلقوں کا "جلوہ پسِ پردہ" دیکھئے، تو معلوم ہو کہ موقع موقع سے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے، مسلمان بھی اپنے "عہدِ زریں" میں نرے زاہدِ خشک نہیں تھے: "الف لیلہ" کیا ہے؟ اس زمانہ کے شاہی گہوارۂ عیش (رائل کورٹ) اور اس وقت کی اونچی سوسائٹی کی خلوت آرائیوں کا اصلی مرقع ہے، ہارون رشید تو علانیہ رند مشرب تھا، لیکن محمود کی ایک رخی تصویر جو اسلم دکھانا چاہتے ہیں وہ ان کے لائق رحم دوم درجہ کے معلومات کا نتیجہ ہے، ایک مورخ کو جو طبائع عالم کا نباض ہو، محمود پر اگر وہ تاریخی وقعت رکھتا ہے، گہری نظر ڈالنی ہوگی، اور یہ ناممکن سا ہے کہ خصائل کے مختلف پہلو دائرۂ نظر میں نہ آئیں، محمود میں اوصاف کے ساتھ کمزوریاں بھی تھیں، وہ انسان تھا فرشتہ نہیں تھا،

میں اس ضمنی بحث کے سلسلہ میں یہ بھی دکھانا چاہتا ہوں کہ ایاز کا وجود خیالی اسلم کے وجود یقینی سے زیادہ غیر مشتبہ ہے، اسلم جن باتوں کو بازاری گپیں فرماتے ہیں وہ افسانی سلسلہ روایات اور افسانہ کہن کی ضروری کڑیاں ہیں جن سے ہم ایک منٹ کے لئے بھی دست بردار نہیں ہو سکتے، یورپ کا ایک زبردست

مستشرق ایسی سرد اور بے غایت تحقیقات کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے، جو کسی لطیف انسانی تخیل (آئیڈیل) کو جو وراثتہً زمانہ ہائے دراز میں منتقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے، بغیر کسی کافی معاوضہ کے دفعتہً چھین لے" وہ کہتا ہے کہ مغربی سرد مہریاں یعنی تر سے مادے اور سائنٹفک اکتشافات، مشرق کے وسیع عالمِ خیال اور اس کی لازوال دلچسپیوں اور نزاکتوں کی قائم مقامی نہیں کر سکتے، جن میں ایک خاص طرح کی گرمجوشی اور ایسی قوتِ اخلاقی موجود ہے جو سخت سے سخت مصائبِ انسانی میں ہمارے آنسو پونچھتی رہتی ہے، ہم ہر مادی پیشقدمی کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھو رہے ہیں جس کی بنا کسی شریف تر اور اعلیٰ تر اصولِ خیال پر ازل ہی میں پڑ چکی تھی؟

خیر یہ باتیں اسلم کے دل و دماغ سے مناسبت نہیں رکھتیں، یونانیوں کی سی لطافتِ خیال اور مذاقِ حسن پرستی کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے حکمائے ادب (ڈاکٹر آف لٹریچر) میں صرف شبلی کا حصہ ہے،

میرا خیال ہے اب مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے، ایک فقرہ رہ گیا تھا، وہ بھی لیجئے! شبلی پر یہ بھی الزام ہے کہ "وہ جوش میں آکر ایک (شاعر) کو دوسرے پر بیجا فوقیت دیتے ہیں، یا جس کے حالات لکھتے ہیں، اسی کے ہو رہتے ہیں۔" اسلم کو معلوم نہیں کہ اس قسم کا جوش خاصۂ انسانی ہے، ایک انشا پرداز جہاں کسی اہلِ قلم کے وصفِ غالب کو ابھار کر دکھاتا ہے، وہاں تنقید کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دوسرے جزئیات پر بھی نظر ڈالے، اس طرح جب مختلف شعراء پر جو قریب قریب ایک ہی سطح پر ہوں نظر ڈالی جائے گی، تو لازماً صفاتِ مشترک میں تصادم ہو جائے گا، ان کا تجزیہ

کرنا، ان کو بیچ بچکر اس طرح دکھانا کہ ایک کا دوسرے سے امتیاز رہے، اور ساتھ ہی صفت غالب آنکھوں کے سامنے آجائے ہر شخص کا کام نہیں ہے، اسلم نے ساری عمر میں لے دے کر "حیات حافظ" لکھی اور اس وقت لکھی جب "شعرالعجم" کے اجزاء مسلم علی گڈھ پریس میں ان کے پیش نظر تھے، وہ تصنیف کی اہم ذمہ داریوں سے ناآشنا ہیں ورنہ یوں شبلی کے منہ نہ آتے،

"شعرالعجم" میں "حیات سعدی" سے علیحدہ ہو کر سعدی پر اور خاص کر فردوسی پر جس قدر نفاست سے تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے وہ بجائے خود ادبی فتوحات میں داخل ہونے کے لائق ہے لیکن "چہ کنم کہ چشم بدبین نکند بروں نگاہے"

مجھ کو افسوس ہے کہ اسلم کو ذرا سختی سے ٹوکنا پڑا لیکن یہ بھی انکے مرتبہ انشاپردازی کے لحاظ سے ہے جس کی ذمہ داری ان کی غیر ضروری اپج ہے،

شعرالعجم کی تنقیص سے جس میں انہوں نے بڑی چوٹی کا زور لگایا ہے انہوں نے شبلی سے زیادہ لٹریچر کی حق تلفی کی، خاصکر اس لحاظ سے کہ ملک میں پڑھے لکھوں کی تعداد کسرات سے آگے نہیں بڑھتی، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو اردو ادب کا مذاق صحیح رکھتے ہیں یا جن میں اظہار خیال سے پہلے صحیح رائے قائم کرنے کا سلیقہ ہو، ایسی حالت میں اسلم کی تنقیص بجائے رہنمائی کی جگہ صریحاً گمراہی کا سبب ہوگی" ادبی حیثیت سے عبدالسلام ندوی، اسلم کا نوٹس لے چکے ہیں، میں نے جو کچھ لکھا ہے صرف تذکرہ کی حیثیت سے جس کی غایت ہشیاری کی قوتیں ہیں سے زیادہ نہیں ہے لیکن برا ماننے کی بات نہیں، میں نے صرف معاوضہ بالمثل سے کام لیا ہے اس کی

نظیر میرے سامنے موجود تھی،

یہ چند سطریں مجھے اُمید ہے ایک "بے ادب" کے لئے جو مذہبی مذاق رکھتا ہو، محتسب کے دُرّے ہیں جو حدودِ اخلاق کے توڑنے کا شرعی علاج ہے، اچھا ہوتا اگر اسلم میری خاطر سے آیندہ اس فقرے کو عنوانِ زندگی بناتے "ایاز قدرِ خود بشناس"

اسی سلسلہ میں آجکل شبلی کی "الکلام" پر جو لے دے ہو رہی ہے اور جو میرے موجودہ موضوعِ بحث سے خارج ہے، کچھ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں کسی آیندہ موقع پر مستقلاً نظر ڈالوں گا،

"تنقید الکلام" میں لائق "متعلم" نے نہایت قابلیت سے سائنس اور فلسفۂ حال کے معرکۃ الآرا مسائل سے بحث کی ہے، اس طرح اس سے پہلے "راز" سے کبھی پردہ نہیں اُٹھایا گیا لیکن صاحبِ تنقید کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے پیمانہ تذبذب فی المذہب (یعنی ایگنا سٹک خیالات) کی زد پر صرف شبلی نہیں ہیں بلکہ خود مذہب مسائلِ مختلف فیہ کا ذمہ دار ہے، شبلی سے اگر غلطی ہوئی تو صرف اس قدر کہ انہوں نے مذہب کو آجکل کے عقلیات سے ٹکرایا، یہ غلطی اس سے پہلے بھی جب مسلمانوں کے اچھے دن تھے ہو چکی ہے اور علمِ کلام کو عباسی دور کے دماغی ترقیات کے لحاظ سے "یادِ ایام" سمجھیے جو عقائد اسلام اور فلسفۂ قدیم کے گذشتہ اختلاط کی ادبی تاریخ ہے لیکن اس زمانہ میں اسلام کو صرف فلسفہ یعنی ایک حد تک محض اصولِ نظری سے سابقہ تھا، اس لئے جس طرح لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا اور کچھ ابرہ سے اور دونوں کا جھول جھال لیکر برابر کر دیا، دونوں حریف جو چھری کٹاری ہو رہے تھے، گلے ملوا دیئے گئے لیکن آج مذہب کو

اپنے دشمنِ ازلی یعنی سائنس کا مقابلہ کرتا ہے جو قوی تر حریف ہے اور جو اپنے سوا دنیا میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا، مذہب کے اوّلیات کا انحصار کلیتہً امورِ غیر مادی یعنی ایسی چیزوں پر ہے جو سرے سے مدرکاتِ انسانی سے باہر ہیں، یعنی ہمارے قوائے فطری ان کے سمجھنے بوجھنے سے عاری ہیں اور سائنس صرف مادیت سے غرض نہیں رکھتا، بلکہ اس کا دعویٰ ہو کہ عالمِ غیر کا خیر سے وجود ہی نہیں جس پر ہم آپ اس قدر مٹے ہوئے ہیں، بہرحال فلسفہ پھر بھی اتنا بُرا نہیں کہ "سُنی سُنائی" بھی کبھی مان لیتا ہو لیکن سائنس اتنا کٹر ہے کہ جب تک "آنکھوں دیکھی" نہ ہو ہزار کہیئے، کتنے ہی بڑے بڑے جبہ اور دستار پیش کیجئے، مذہب کی دہائی دیجئے، ایک نہیں سُنتا، ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کافر بر خود غلط کسی "شریعتِ سہلہ" کی گرفت میں کہاں تک آسکتا ہے؟

لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم مذاہب سے عموماً دست بردار ہو جائیں؟ اس کا فیصلہ میں انسان کی اگلی پچھلی اخلاقی تاریخ پر چھوڑتا ہوں جس کی تکمیل کی نسبت خود فلسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ بغیر مذہب کے ہو ہی نہیں سکتی، شبلی نے "الکلام" میں نفسِ موضوع کے لحاظ سے جو روش اختیار کی اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا، آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیں تو پہلے ضرورت ہو کہ بڑے میاں سے آپکو حسنِ ظن بھی ہو، یہ نہیں کہ ایک دم سے پگڑی اتارلی اور دعویٰ یہ کہ ہم آپکے خالص بہی خواہ ہیں، لگی لپٹی نہیں رکھتے۔

طبائع انسانی کے لئے اگر مذہب کی ضرورت ہو تو اس کے مسلمات اعتقاد سے ایک طرح کی مجبوری کہیئے تسلیم کرنے ہونگے، رہی معقول و منقول کی تطبیق جہاں تک مذہب میں استطاعت ہو آپ دونوں کو ٹکرا سکتے ہیں، علمِ کلام کا اتنا ہی فرض ہے،

شبلی حکیمانہ خیالات کے ساتھ پھر بھی مذاقِ مذہبی رکھتے ہیں اور "مولویت" کو اپنی کسرِ شان نہیں سمجھتے، اور انہوں نے جو کچھ لکھا ہے حمایتِ مذہب میں لکھا ہے، لیکن اس پر بھی جہاں لائق "متعلم" سائنس کے انکشافاتِ عالیہ کے مقابلہ میں خالی الذہن ہو کر فلسفیانہ استدلال سے مذہب کی دھجیاں اڑا رہا ہے، لکھنؤ کے ایک مشہور انشا پرداز شبلی کی مذہبی تحریرات سے عام سوءِ ظن پیدا کرنا چاہتے ہیں، نہ جاننا بھی مزے کی بات ہے حضرت کو "اعتزال" کی فکر ہے جس میں پھر بھی ایک مذہبی رنگ ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں سرے سے مذہب کی جان ہی کے لالے ہیں اور آج کسی "مذہبِ آسمانی" میں اتنی قوت نہیں کہ وہ منحرف سائنس کو زیر کر سکے!

میں شعر العجم پر لکھتے لکھتے جانے کہاں سے کہاں بھٹک گیا، ان بے ربط خیالات کی تلافی اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب شبلی کے "تذکرۂ شعرا" کا چوتھا حصہ شائع ہو لیگا، جس کے لئے ابھی سے تیار رہئے، شبلی دنیا کی عام شاعری پر مفصل تنقیدی نظر ڈالیں گے اور دکھائیں گے کہ فارسی شاعری "ارتقائے ادبی" کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے، یہ بحث جس قدر دلچسپ ہے اس قدر نہایت مشکل ہے، پروفیسر براؤن سا محقق بھی اسے ٹال گیا، لیکن شبلی لکھیں گے اور اچھی طرح لکھیں گے،

چند سطریں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے خوش ذائقہ بریانی کی جگہ آ سکتی ہیں سادے شگے یعنی اصغری حیثیت سے ہیں، تاہم ادبی چاشنی سے خالی نہیں! پر تکلف سامان ان شاء اللہ آیندہ جس کے لئے ابھی سے وعدہ ہے،

(مشرق ۱۹۱۰ء)

فلسفۂ حسن و عشق

یونانیوں کے نقطۂ خیال سے

عورت کیا ہے؟ وہ دُنیا میں کیوں آئی؟ اس کی ہستی کی علّتِ غائی یعنی اس کا موضوعِ اصلی کیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہتیرے سوالات ہیں جو ایک شائستہ دماغ کو متوجہ کر سکتے ہیں اور جن پر ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ غور ہوا ہے لیکن ان سب کا مختصر مگر جامع جواب یہ ہے کہ "وہ محبت کی چیز ہے اور دُنیا میں محض اسی لئے آئی"

محبت کیا ہے؟ ایک انتہائی طبعی کشش ہے! عورت بغیر چاہنے والے کے رہ نہیں سکتی، اس کی نزاکتِ فطری چاہتی ہے کہ کسی کا سہارا ہو، یعنی دو ایک ہو کر رہیں، جہاں پہ نوجوان مٹنے کو تیار ہے، یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس پہ بھی مرتا ہو، دُنیا میں یہ صرف محبت کے لئے آئی اور گلے کا ہار بننے کے لئے، پھولوں کی سیج پہ اس کی بہار دیکھئے کہ تھوڑی دیر کے لئے افکارِ دنیا بھلا کر رہتی ہے،

عالمِ خیال عورت کی ایک وسیع دنیا ہے جہاں وہ اپنے جذبات کو فضائے بسیط میں چھوڑ دیتی ہے اور جو باتیں در اصل اس کو حاصل نہیں ہیں ان کا بھی لطف

اٹھا لیتی ہے،

اس کی ساری زندگی حسن و عشق کا فسانہ ہے، وہ خود کسی پر مرتی ہوگی یا کوئی اس پر جان دیتا ہوگا! عورت پھنستی ذرا مشکل سے ہے لیکن جہاں پھنسی اس سے چھٹکارا پسند نہیں کرتی، اس کی اصلی غایتِ زندگی دوسرے کی پھانس ہے، لیکن اُسے معلوم نہیں کہ جال ڈالنے سے پہلے وہ خود شکار ہو چکتی ہے،

عورت کتنی ہی پاکیزہ وش ہو، اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی کافر ادائی کا شیدائی ہو، اس کی "فتوحات" اس کا سرمایۂ نشاط ہیں جن سے اُس کے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتی، وہ وار کرے گی، کیونکہ یہ امر اس کی فطرت میں داخل ہے! شانہ سے آنچل خود نہ گرائے لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی، یہ اس کی فطرت کا راز ہے جسے وہ ہی خوب سمجھتی ہے! لہرائے ہوئے آنچل میں دراصل اُسے سینے کا ابھار غائب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر جما کر دیکھئے! محرم کا جائزہ نظری ایک طرح کی دادِ حسن ہے جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لیکر رہیگی!

اسی لئے جوانی کی آرائشوں میں دستانہ کی طرح چھپی ہوئی چیز اسے دل سے پسند ہے جس میں یہ اُن "سرکشوں" کو قید رکھتی ہے جنہیں عورت کے "ارمان" کہئے!

"ہے دو آتشہ وہ بھی شباب کی" جب کھچ کھچا کر قدرتی کنٹروں میں بھری ہو، تو کون ہے جوان کیفیت مستی اور بیخودی کے "مجسموں" کی پرستش کا دلدادہ نہ ہوگا! "ترکیبِ عناصر ہی تو ہے، ذرا "فطرت" کی شوخی دیکھئے گا! "فتنۂ قیامت" زرا!"

کے لئے گنجایش نکالی بھی تو کہاں؟

دنیا میں معیارِ حسن ہمیشہ مختلف رہا ہے اور آج بھی اختلافِ مذاق کے لحاظ سے حسن کے لئے کوئی نصابِ مشترک قائم نہ ہو سکا، تاہم ہر زمانہ میں عورت کا "مقیاس الشباب" دائرۂ حسن کا مرکزِ عام رہا ہے، آج تک سننے میں نہیں آیا کہ اہلِ چین کی چپٹی ناک کی طرح "سپاٹ" سینہ بھی کہیں پسندِ طبائع ہو،

موجودہ قیصرِ جرمنی کو اپنی غیر معمولی شخصیت کے ساتھ بھی عورت کی "شہنشاہی" کے آگے جھکنا پڑا، آپ صنفِ نازک کے شائق ہیں، لیکن اس کے جو خوبصورت ہاتھوں کے ساتھ ابھرا ہوا، اور قائم بالذات سینہ رکھتی ہو،

اسی لئے حکما، "بحرِ حسن کے اس زوردار تموج" کو "بہترین عطیۂ فطرت" کہتے ہیں، آپ "انسانیت کا اعلیٰ زیور" کہیئے، اس میں کالی، گوری کی تخصیص نہیں، کوئی ہو، کہیں ہو، صرف جوانی کے "آلۂ حرب" اچھی طرح مسلح ہونے کی ضرورت ہے، پھر تو اس کی فتوحات کے لئے فضائے کائنات بھی کافی نہیں، دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہو گی،

عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ باکیفیت ہوتی ہے، اور جن ترکیبوں کی طرف مرد کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا یہ ان کو بھی سوچتی اور قوت سے فعل میں لانا چاہتی ہے، جیسے بھی کسی خوبصورت عورت کی پرستش کا موقع ملے تو سمجھئے خدا نے دنیا میں وہ چیز دی جو بڑے بڑے زاہدوں کو سر رگڑنے کے بعد بھی نصیب نہیں، بہشت کا بھی وعدہ ہے! چاہنے والی عورت سے بڑھ کر جو پاکباز ہو، دنیا میں کوئی چیز نہیں، لیکن قابو میں لانے

کے بعد یہ ایک سکنڈ کے لئے بھی چھوڑنے کے لائق نہیں،

وہ انتہا درجہ کی حساس اور نازک مزاج بھی ہوتی ہے، دنیا میں اس کو کسی سے پیار ہے تو چاہنے والے سے، دوپٹہ میلا ہے تو سمجھ لیجئے چاہنے والے کا قصور ہے، عورت سمجھتی یہی ہے کہ ان ہی کو پروا نہیں تو بدلیں کس کے لئے؛ وہ خوش ہیں تو بات بات میں بانکپن دیکھ لیجئے، کنگھی چوٹی کا ورد ہر ایک وقت بھلا معلوم ہوتا ہے جیسا دل سے دل ملا ہو، اور اس کی مانگ ہو، عورت کے بناؤ سنگار یعنی آرائش کی چھوٹی چھوٹی باتیں اسکے دل کی حالت کی غماز ہوتی ہیں، کسی سے آنکھ بدلی اور یہاں صورت بگڑی، وہاں دلداری ہے تو ادھر بھی دل آرائی دیکھ لیجئے، جسم کے بند اگر کھنچ کر بندھے ہوں تو سمجھ لیجئے "زد" پر کوئی ہے جس کے لئے یہ سینے کو "دھرتے پایہ" پر رکھنا چاہتی ہے!

حسین عورت کے لئے کسی لازمی نہیں کہ چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں زیادہ خوشگوار ہوتی ہے، فلسفہ حسن و عشق کا یہ نہایت باریک نکتہ ہے جو لائق غور ہے، عورت وہی پاکیزہ ہوگی جو لذت آشنا ہو، اور جس میں لذت احساس کامل ہو، یہ عالم فطرت کی نیرنگیاں ہیں، شراب کی طرح کہ جتنی پرانی ہو مزیدار ہوتی ہے عورت کی عمر کا وہ حصہ جو تیز روشنی کی جگہ تاروں کی چھاؤں یا پچھلے پہر کی چاندنی سے مشابہ ہے یہاں وست دینے کے لائق ہوتا ہے، ۲۵-۲۶ برس کی حسین عورت یا عورت کے ساتھ حسن پرستی بھی رکھتی ہو، اور جس میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہو، انسانی تخیل کا بہترین مرقع ہے،

عورت باعتبارِ جذبات، ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس کی ساخت میں نہایت نازک پھول پتیاں صرف ہوئی ہیں، جس طرح پھول کی پتیوں میں نازک رگیں، نسیں اور باریک نقش و نگار ہوتے ہیں، عورت کا دل و دماغ بھی ہر طرح کی لطافتوں اور نزاکتوں کا مخزن ہوتا ہے جس کے بیل بوٹے قدرت کی بہترین نقاشی ہیں، ان ہی باریک حسیات اور جذبات کا ابھارنا، اور ان کے نشوو ارتقائے تدریجی کے سلسلہ کو قائم رکھنا چاہنے والے کا اصلی فرض ہے،

عورت ہماری زندگی کے ہر صیغہ کو مَس کرنا چاہتی ہے، وہ ہماری عقلی اور اخلاقی قوتوں کو حرکت میں لاتی ہے لیکن ایک شائستہ عورت پر وہی قابو حاصل کرسکتا ہے جس میں عورت کے فطری اوصاف کے مقابلہ کی قابلیت موجود ہے، جس کے قوی تر جذبات عورت کی قدرتی نزاکتوں اور لطافتوں سے ہم آغوش ہوسکیں،

اس کے خیال میں صرف آرزوئے "وصل" جس پر ہمارے شعرا سر دھنتے ہیں، نری حیوانیت ہے، وہ "خوش عیشی" کے مقابلہ میں "فلسفۂ ناکامی" میں کہیں زیادہ لذّت پاتی ہے، جو اس کے نازک سے نازک جذبات اور حسیات کو تحریک میں لائے، عورت کی ایک آہ جو دل سے نکلی ہو، ہزار صوفیانہ ریاض و اعمال پر بھاری ہے، جس میں شائبۂ خلوص نہ ہو!

یہ دنیا میں فطرت کی تکمیل کے لئے آئی، اور اسی لئے مہذب دنیا میں اسے انسان کا "نصف بہتر حصہ" کہتے ہیں، محبت، دلسوزی، خلوص و ہمدردی، اس کا خاصّہ فطری ہے، یہ جہان ہماری خوشدلی کو بڑھاتی ہے، رنج و غم کو بانٹ لیتی ہے، عورت

ہیں یہ رفیقِ زندگی، علالت میں خوش سلیقہ دایہ، اور موت کے بعد ہماری خوبصورت سوگوار ہے جس کی ہیرا تراش کلائی میں پھنسی ہوئی سیاہ چوڑیاں اور کھلے ہوئے لمبے بال وہ علاماتِ ماتم ہیں جنھیں جیتے جی دیکھنے کو دل چاہتا ہے!

آہ عورت! تو فسانۂ زندگی ہے، تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے شیش محل بنا سکتی ہے، بڑے سے بڑے ایوانِ عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اُس میں نہ پائے جائیں!

اس کے لئے چھڑوں کی جھنکار ضروری نہیں، محض تیرا پسِ پردہ ہونا، کہیں ہو، کسی کے لئے ہو، کافی ہے! شکسپیئر نے سچ کہا ہے کہ "تو مجسم عشوہ گری ہے، اور دنیا میں بے فوج کی سلطنت تیرا اور صرف تیرا حصّہ ہے"!

یہاں تک تو "حسن" اور اس کے لطیف متعلقات پر شاعرانہ نکتہ سنجیاں تھیں، لیکن مجھے دیکھنا ہے کہ عشق کیا چیز ہے، حکماء کی رائے کے مطابق یہ ایک جوہرِ وجدانی ہے، انسانی اجسام، انسانی حافظے، انسانی خواہشات فنا ہو جائیں گی، لیکن یہ جوہرِ غیر فانی یعنی عشق ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے،

"تصوف" صرف مذہبِ عشق ہے، آپ فرطِ سنجیدگی سے "حقیقت" کے پیچھے پڑے، اور جیسے آئے تھے، ستر اسی برس کے ریاضات و مجاہدات کے بعد ویسے ہی گئے! میں نے آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھ سکا، اس لئے آپ کی اصطلاح میں صرف "عشقِ مجازی" سے غرض رکھی، یعنی اپنا "معبود" خود پیدا کر لیا، اور تھوڑی سی عمر جو لے کر آیا تھا، اس خیال میں گذار دی،

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

گوشوارہ پر آپ دیکھیں گے، میرا پاکیزہ تخیل بڑے بڑے زاہدوں کے "صعوباتِ لاطائل" سے کتنا اچھا رہا، وہ عمر بھر روتے رہے اور روتے گئے، اور مَیں نے ہنستے کھیلتے دن کاٹ دیئے!

یہ فقرہ معترضہ تھا، اہلِ سائنس کا خیال ہے کہ عشق چاہنے والوں میں سے کسی کا اختیاری نہیں بلکہ ایک جذبۂ اضطراری ہے جو گذشتہ زمانہ کے ہزارہا میلانِ طبائع نے وراثتہً ہمارے لئے چھوڑا ہے، ہم کسی عورت کو اس لئے نہیں چاہتے کہ وہ نازنین ہے، پری پیکر ہے، خوش ادائی اور دلفریبی میں آپ اپنی نظیر ہے، بلکہ وہ ہمارے دائرہ پرستش کا مرکز اس لئے بنی ہوئی ہے کہ وہ ایک ناقابلِ بیان طریقہ سے جنسِ مقابل یعنی مرد کے لئے ایک ایسا "نغمۂ مستانہ" چھیڑتی ہے جسے مرد ہی خوب سمجھتا ہے، اور جو ہماری زندگی کے جوہر خالص یعنی روح کو اُن طبقاتِ بالا تک پہنچاتا ہے جہاں خیال کے سوا کسی چیز کی رسائی نہیں! یہ بحث نہایت دلچسپ ہے! لیکن مستقلاً اظہارِ خیال چاہتی ہے، یہاں اسکے چھیڑنے کی گنجائش نہیں، پھر کبھی دیکھئے گا، سرِدست ایک مغربی شاعر کے خیالات سنئے جو جذبات میں ڈوبا ہوا ہے اور اپنی معشوقہ یعنی اپنی بیوی کے فراق میں یُوں اظہارِ خیال کر رہا ہے،

"رات کا پچھلا پہر اور دل ہی دل میں کچھ باتیں"

"تیری ہستئی بے ثبات کا سب سے بڑا کارنامہ تیری محبت پر قابو حاصل کرنا تھا،

میں نہ ہوتا تو تو یقیناً غیر مفتوح رہتی، یعنی کسی کے بس میں آنے والی نہیں تھی، کیا دنیا
کی کوئی قوت جیتے جی تجھ کو مجھ سے چھڑا سکتی ہے؟ پھر یہ علیحدگی کیسی؟ دیوانگی استغراق
فنا، مذہبِ عشق کی صرف اصطلاحات ہیں! میں تو تجھ میں اس طرح تحلیل ہو گیا ہوں کہ
وجودِ ذاتی کا سرے سے پتہ نہیں! آخر کیوں؟ کیا تیرا دلفریب حسن تیری کافر ادائیاں
اس کا باعث ہیں؟ نہیں! تو عشقِ مجسم ہے! تو مستیِ شباب کے سوا جذبات میں
اس طرح ڈوبی ہوئی ہے کہ تیری غایتِ زندگی صرف محبت ہے اور کچھ نہیں!

ہاں تو نے عشق کی کاٹ عشق سے کی اور میں مقابلہ میں ٹھہر نہ سکا، یعنی بازی
ہاری! ہائے کتنی دلچسپ فتح ہے! لیکن آخر مجھے اپنی شکست پر ناز کیوں ہے؟ اسلئے
کہ یہ شکست "دنیا کے اور دیوانوں کے حصے میں کبھی نہیں آئی" آرزوئیں اور قصے
ہی رہے! مطلوب کا ملنا دوسری دنیا کیلئے اٹھا رکھا گیا، یہ خیال کہ تو مجھے چاہتی
ہے جان دے دینے کے لئے کافی ہے!

تجھ کو پاکر چاہیئے تھا کہ بیقراری کچھ کم ہوتی، لیکن یہ کیسا روگ ہے جو کسی طرح
پنپنے نہیں دیتا، میں دیکھتا ہوں کسی طرح چین نہیں، خاص کر آجکل کی جدائی
بلائے جان ہو رہی ہے،

عرب کی جوشیلی عورت اپنے عاشق سے جدا رہنا پسند نہیں کرتی، یعنی وہ فطرۃً
ہم آغوشی و ہمبستری کی شائق ہوتی ہے! میری پیاری کیا تو کم پرجوش ہے؟ تیری
تو رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بجلی بھری ہے، یہ تیری دبی ہوئی چنگاریاں تھیں،
جن سے میری زندگی کی بجھی ہوئی حرارت دفعۃً بھڑک اٹھی!

پیاسے کو انگاروں پر لٹانا جب چند قطروں سے پیاس بجھتی ہو! یہی شرطِ وفا ہے؟ تُو نے کیوں مجھے وہ گُر سکھائے جن سے آج تک ناآشنا سا رہا! تُو نے میری ایک سوئی ہوئی قوت کو جو حاسۂ انسانی میں سب سے زیادہ لطیف و شیریں ہے چھینٹے دے دے کر جگا دیا، تیری تطبیقِ اعضائی اور انگوٹھی پر نگ کی سی موزونیت تیری نفاست اور پاکیزگیِ فطرت کا ایک راز ہے! سچ یہ ہے کہ تُو یونانیوں کی محض "زہرۂ عریاں" نہیں بلکہ حُسن و عشق کی مشترک دیوی ہے،

جوانانہ خوش فعلیاں ان دنوں خواب و خیال ہو رہی ہیں، جب سے تُو چھوٹی زندگی وہ نہیں رہی!

میری خاک ایک دن خاک ہو کر رہے گی لیکن وہ جوہرِ غیر فانی یعنی تیرا عشق میری یادگار رہیگا، لیکن قبل اس کے کہ یہ صورت پیش آئے، آ کر مجھے گلے لگا لے، زندگی تو آج کا نام ہے، کل اختیاری نہیں! تیرے ساتھ کے چند گھنٹے ہزار زندگیوں کے برابر ہیں، دیکھ! میری عمر کا بڑھانا تیرے لئے کتنا آسان ہے، کیسی مجبوری اور کہاں کا رکھ رکھاؤ؟ جس کوچہ میں تُو نے قدم رکھا ہے وہاں تیرے کا گذر نہیں! ان ڈھکوسلوں سے کیا واسطہ؟ عشق کا فتویٰ تو یہ ہے کہ دو کے سوا تمام دُنیا حرفِ غلط!

(نقاد ۔ ۱۹۱۳ء)

ملک میں تاریخ کا معلّم اوّل

یعنی

شمس العلماء علّامہ شبلی نعمانی

یورپ کے علمی قلمرو میں ایک زندہ دل طبقہ ایسا بھی ہے جو انسان کی دماغی پیداوار یعنی کتابوں کو "علمی حرم" کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ان کا دلدادہ ہے، اُس کے خیال میں کسی کتبخانہ کا ایک گوشہ جہاں اس کی منظور نظر "نازنینوں" کا جھرمٹ ہو، اور جو ہمیشہ اس کی فرصت اور مرضی کی منتظر رہتی ہوں، اس شاہی محل سے کہیں بڑھ کر ہے جس کے لوازم عیش صرف دور سے دیکھنے کی چیز ہیں، بہرحال ایک ایسا گروہ موجود ہے جو علمی دنیا میں درجۂ استغراق رکھتا ہے، اور زمانہ کے سرد و گرم سے قطعاً بے پروا ہے، اس کا دائرۂ مخصوص خود ایک دنیا ہے جہاں ایسے سامانوں کی کمی نہیں جن سے قوتِ احساس ہر طرح کی لذّت و انبساط حاصل کرتی رہتی ہے، اسی حلقہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی نفاست اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ معمولی مطبوعات کو پسند نہیں کرتے، خاص خاص تصنیفات کے قیمتی ایڈیشن شائع کئے جاتے ہیں،

ہندوستان میں اس قسم کے معزز شواہد بہ مشکل پیش کیئے جا سکتے ہیں لیکن طبقۂ اعلیٰ کے مصنفین میں علامہ شبلی کی تصنیفات کو یہ امتیاز حاصل ہے جو حسن سیرت کے ساتھ صورت کی بھی اچھی ہوتی ہیں، قاعدہ یہ ہے کہ لفافہ اچھا ہو تو ملفوف کو اس سے کہیں زیادہ اچھا ہونا چاہیئے،

علامہ شبلی اپنے موضوع سخن اور اس لحاظ سے کہ انہوں نے اپنے ملکۂ راسخہ یعنی فطری قوت تصنیف سے وہی کام لیا جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا تھا، ملک کے مصنفین میں سرِ فہرست تو تھے ہی، میں دیکھتا ہوں اب بہت آگے نکلے جاتے ہیں، انہوں نے فلسفۂ تاریخ کو صرف اس لحاظ سے کہ وقت کی چیز ہے، اپنا خاص فن قرار دیا، اور ترتیباً جس پیمانہ پر یہ اظہار خیال کرتے رہے وہ ایک منحرف بھی تسلیم کریگا کہ ان کی قوتوں کا صحیح سے صحیح استعمال تھا جو خیال میں آ سکتا ہے، ملک کے اچھے لکھنے والوں میں "قوت فیصلہ" کی ہمیشہ کمی رہی، یعنی دماغوں میں اقتضائے وقت کی رعایت نہیں! وقت ہی آگے چل کر بتائیگا کہ ان کے نتائج فکر ایک طرح کی خودرو پیداوار ہیں، جن کی شادابی صرف ایک رسمی چیز ہے! لیکن علامہ شبلی سے ہم کو اس قسم کی شکایت نہیں، یہ بلا بار تمہید و فرمایش جو کچھ کرتے رہتے ہیں وہ ہمارے توقعات اور استحقاق سے کہیں زیادہ ہے، حالتوں کا موازنہ آجکل کے عوائد رسمیہ (یعنی ڈیٹی کیٹ) کو دیکھتے خلاف شائستگی سمجھا جاتا ہے، تاہم تنقید کا ایک ضروری عنصر ہے، لیکن میں اس وقت ان کو ان کے دائرہ کے دوسرے خلاقین سخن سے ٹکرانا نہیں چاہتا، صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح یہ اپنے

حلقہ میں غالباً سب سے کم عمر مصنف ہیں، ادبی حیثیت سے نسبتہً اتنے ہی بڑھے ہوئے ہیں، اس دماغی فوقیت کا راز صرف یہ ہے کہ خوش نصیب شبلی نے اپنی وہبی اور اکتسابی قوتوں کی رعایت سے جو وسیع موضوع بحث اختیار کیا وہ بلا استثنار اوروں کی دسترس سے باہر تھا، اس سے زیادہ سوز و نیست لائق رشک ہے، جو توانا ان کے ہر حصہ تصنیف کا ایک خاصہ ہوتی ہے، اسلامی تاریخ و لٹریچر، فلسفہ و عقائد سے متعلق جس قدر مواد یہ یکجا کر سکے، قدیم تاریخ کا گویا نچوڑ ہے،

تاریخ اسلامی کی نسبت ایک زمانہ میں یورپ نے جس قدر متعصبانہ رائے قائم کی تھی، اب رفتہ رفتہ ان سے دست بردار ہوتا جاتا ہے، موجودہ دور میں جو ہر قسم کی دماغی ترقیات کا دور ہے واقعات کا ایک خاص معیار صداقت قائم ہو گیا ہے، ہر واقعہ کی جانچ اجتماعی، اخلاقی اور فلسفیانہ حیثیت سے کی جاتی ہے، چنانچہ علمائے مستشرقین کی توجہ سے جدید سلسلۂ اکتشافات میں ایک نیا لٹریچر پیدا ہو گیا ہے جس میں ہمدردانہ التفات کے ساتھ ایک طرح کی سنجیدگی اور بلند نظری پائی جاتی ہے، لیکن باوصف اس حسن ظن کے جو جماعت مستشرقین کی طرف سے پیدا ہو چلا ہے اُن[1] کے خیالات کا بیشتر حصہ نظر ثانی چاہتا ہے، اس قسم کی مثالیں کم نہیں ہیں جن میں مغربی علمار کی اجتہادی لغزشیں اب بھی محسوس ہوتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ استخراج نتائج میں عمداً بے پروائی سے کام لیا گیا ہے، لیکن علامہ شبلی نے ہم کو غیروں سے

---

[1] دیکھئے یورپ کے سرخیل دان کریمر کی تصنیف مختص الموضوع جس میں کہا ہے کہ اسلام اپنی ترکیب ساخت کیلئے مذاہب سابق کا ممنون ہی نہیں بلکہ ادیان سابقہ کی صرف ایک اتفاقی صورت ہے،

قریب قریب بے نیاز کر دیا ہے، یہ جس طرح قدیم تاریخ اور لٹریچر کے جامع ہیں، آج کل
کے فلسفیانہ انتقادات اور نکتہ سنجیوں سے آشنا ہی نہیں بلکہ یہ مذاق ان میں اس قدر
رچا ہوا ہے کہ ان کے طے کردہ مسائل جو دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں، اس
حد تک کامل ہیں کہ زمانہ آیندہ بلکہ "بعید آیندہ" میں بھی ان پر کوئی معتدبہ اضافہ
نہ ہو سکے گا، اسی طرح ان کے اجتہادات کا جن کو تاریخی "الہامات" کہئے، بیشتر حصہ
میرا خیال ہے مدتوں متروک ہونے کے لائق نہیں ہوگا، اس سے زیادہ شبلی کے
غیر فانی ہونے کا ثبوت کیا ہوگا،

اگر موجودہ نسل کے لئے دماغی اور عقلی ترقی کے ساتھ اخلاقی تکمیل کی بھی ضرورت ہے
تو میں خیال کرتا ہوں کہ شبلی نے تاریخی سلسلہ میں جس قدر مذہبی لٹریچر پیدا کر دیا ہے،
وہ ہمارے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ خاصکر اس جدت کے لحاظ سے کہ فاضل شبلی
نے ایک طرف تو "بڑے میاں" یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور ساتھ ہی یورپ
کے نوخیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ و سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے
سے ہاتھ نہیں جڑوائے بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا! یہ معتدبہ روش جو اس "ادبی
نزاع" میں اختیار کی گئی ہے لائق رشک شبلی ہی کا حصہ ہے، جو ہمارے متفق علیہ
پیشوائے علمی ہیں، ان کی ثقاہت نے جہاں مذہب کی حق تلفی نہیں ہونے دی،
سائنس و فلسفہ کی مغایرت بھی دور کر دی، اور ان کو مذہب کا دست و بازو بنا دیا،
آیندہ زمانہ میں جب ہماری عقلی ترقیات کا شباب ہوگا شبلی کو اپنے مساعی جمیلہ کی
پوری داد ملے گی، تاہم آجکل کا تعلیم یافتہ طبقہ جو عموماً مذہب سے بے پروا ہے، مذہب

فطری یعنی حکیمانہ اسلام سے دست بردار نہ ہوسکیگا، معقول و منقول کی تطبیق کی غایت اسکے سوا اور کیا ہوسکتی ہے جو شبلی کی دردسری کا بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے،

ملک کے روشن خیال طبقہ میں کہیں کہیں ایک طرح کے حکیمانہ "تذبذب فی المذہب" (یعنی اگناسٹک خیالات) کی جھلک پائی جاتی ہے، اس لیئے شبلی کی "تنقیداتِ عالیہ" (ہائر کریٹی سزم) کو وہ حمایتِ مذہب میں چنداں وقیع نہیں سمجھتا، لیکن اس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ کوئی نئی اپج نہیں ہے، شبلی سے اگر غلطی ہوئی تو صرف اس قدر کہ انہوں نے مذہب کو آجکل کے عقلیات سے ٹکرایا، یہ غلطی اس سے پہلے بھی جب مسلمانوں کے دن اچھے تھے، ہو چکی ہے! اور علم کلام کو عباسی دور کی دماغی ترقیات کے لحاظ سے "یادِ ایام" سمجھئے جو عقائدِ اسلام اور فلسفۂ قدیم کے گذشتہ اختلاط کی ادبی تاریخ ہے، لیکن اس زمانہ میں اسلام کو صرف فلسفہ یعنی ایک حد تک محض اصولِ نظری سے سابقہ تھا، اس لیئے جس طرح لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا، کچھ ابرے سے، اور دونوں کا جھول جھال لیکر برابر کر دیا، دونوں حریف جو چھری کٹاری ہو رہے تھے گلے ملوا دیئے، لیکن آج مذہب کو اپنے دشمنِ ازلی یعنی سائنس کا مقابلہ کرنا ہے جو قوی تر حریف ہے، جو اپنے سوا دُنیا میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا،

مذہب کے اولیات کا انحصار کلیتہً امورِ غیر مادّی یعنی ایسی چیزوں پر ہے جو مدرکاتِ انسانی سے باہر ہیں، یعنی ہمارے حواسِ فطری ان کے سمجھنے بوجھنے سے عاری ہیں، اور سائنس صرف مادیت سے غرض نہیں رکھتا، بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ "عالمِ غیب" کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے، جس پر ہم آپ اس قدر مٹے ہوئے ہیں! بہرحال فلسفہ پھر

بھی اتنا برا نہیں کہ "سنی سنائی"، کبھی کبھی مان لیتا ہے، لیکن سائنس اتنا کٹر ہے کہ جبتک "آنکھوں دیکھی" نہ ہو ہزار کہئے، کتنے ہی بڑے بڑے جبہ و دستار پیش کیجئے! مذہب کی دہائی دیجئے، ایک نہیں سنتا، ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کافر بر خود غلط! کسی "شریعتِ سہلہ" کی گرفت میں کہاں تک آسکتا ہے، لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم مذاہب سے عموماً دست بردار ہو جائیں؟ اس کا فیصلہ میں انسان کی اگلی پچھلی اخلاقی تاریخ پر چھوڑتا ہوں جس کی تکمیل کی نسبت خود فلسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ بغیر مذہب کے ہو ہی نہیں سکتی، شبلی نے الکلام میں نفس موضوع کے لحاظ سے جس پیمانہ پر اظہارِ خیال کیا، اسکے سوا چارۂ کار ہی کیا تھا، آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیں تو پہلے ضرورت ہے کہ بڑے میاں سے آپکو حسنِ ظن بھی ہو، یہ نہیں کہ ایک دم سے پگڑی اتار لی اور دعویٰ یہ کہ ہم آپکے سچے عقیدت کیش ہیں، فرطِ خلوص سے لگی لپٹی نہیں رکھتے،

طبائع انسانی کیلئے اگر مذہب کی ضرورت ہے تو اس کے مسلمات، اعتقاداً جسے ایک طرح کی مجبوری کہئے، تسلیم کرنے ہوں گے، رہی معقول و منقول کی تطبیق، جہانتک مذہب میں استطاعت ہے، آپ دونوں کو ٹکرا سکتے ہیں، علم کلام کا اتنا ہی فرض ہے، شبلی حکیمانہ خیالات کے ساتھ گہرا مذاقِ مذہبی رکھتے ہیں، اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے حکمائے اسلام کی طرح "متکلمانہ" لکھا ہے، اس پر بھی لکھنؤ کے ایک مشہور انشا پرداز، فاضلِ عصر کی مذہبی تحریرات سے عام سوءِ ظن پیدا کرنا چاہتے ہیں، حضرت کو "اعتزال" کی فکر ہے جس میں پھر بھی ایک مذہبی رنگ ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں جو سائنس کے انکشافاتِ عالیہ کا دور ہے، سرے سے مذہب کی جان ہی کے لالے ہیں اور آج

کسی مذہبِ آسمانی میں اتنی قوت نہیں کہ منحرف سائنس کو زیر کر سکے،

میں ردِ میں سلسلہ سے کسی قدر دور جا پڑا، کہنا یہ تھا کہ اردو لٹریچر کے پیدا کرنیوالے تھوڑے ہیں، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آجکل کے معیارِ قابلیت کے لحاظ سے اہلِ قلم کی صفِ اوّل میں شامل ہونے کے لائق ہوں، شبلی[1] بلحاظِ فن میرا خیال ہے صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں ہیں، اسکو میری قاصر النظری پر نہ محمول کیجئے، فلسفۂ تاریخ جو آجکل تمام علوم میں سر فہرست ہے، ایک مستقل فن ہو گیا ہے، اور اس قدر اہم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مؤرخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلۂ ہستی سمجھتے ہیں، مصری اور ترکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس قدر موجود ہے ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں، لیکن جن مضامین پر وہاں سرگرمی سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں وہ شبلی کے ہاں دست فرسودہ اور مسائل ابتدائی ہیں جن کو فاضل مؤرخ کی سرسری جنبشِ قلم مدت ہوئی ایک سے زیادہ موقع پر طے کر چکی ہے، سچ یہ ہے کہ شبلی بلحاظ جامعیت اور وسیع النظری اور نیز مؤرخانہ تدقیق اور کمالِ فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مؤرخ سے پہلو بہ پہلو ہو سکتے ہیں، یورپ کو شکایت ہے کہ مسلمانوں میں متقدمین بلکہ متاخرین میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہوا جسے صحیح معنوں میں اگر حفظِ روایات سے قطع نظر کی جائے تو "مؤرخ" کہنا درست ہو، یعنی استقصائے روایات کے سلسلہ میں

---

[1] یہاں میری غرض تاریخی لٹریچر سے ہے، ورنہ ادب اور معقولات پر سرسید کی قلمی فتوحات دراصل انکی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہیں جن سے ملک میں کوئی اہلِ قلم بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے،

جہاں اصلی ماخذوں کی چھان بین کی گئی غیر مرتب مواد سے کسی دور میں ایسے نتائج حاصل نہیں کئے گئے جن میں طبیعتِ انسانی کے اقتضا، زمانہ کے ماحول اور خصائصِ طبعی یا قرائنِ عقلی سے مدد لی گئی ہو،

ابنِ خلدون کا نام بار بار لیا جاتا ہے جس نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا، مگر خود اسکی تاریخ بتاتی ہے کہ اسکے خیالات قوت سے فعل میں نہ آسکے، یہ بالکل صحیح ہے، لیکن آج ہم بیسویں صدی کے ایک فاضل مؤرخ کو پیش کرتے ہیں جس کا دائرۂ معلومات اس قدر وسیع ہے کہ وہ اپنے سلسلۂ تحقیقات میں صدیوں کی فروگذاشت کی تلافی کرتا جاتا ہے، اور اگر وقت نے مہلت دی اور اس کا تخیل پورا ہوسکا تو تاریخ اسلامی کے مہماتِ مسائل ایک ایک کرکے طے کردیے جائینگے،

کہا جاتا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے گوشوں میں بہتیرے علماء پڑے ہیں، ممکن ہے! لیکن کسی شخص کا دماغ دوسروں کے علوم و فنون سے بھرا ہوا اور خود اس میں تحقیق و اختراع کا مادہ نہ ہو تو ایک بیکار سی چیز ہے، اس لئے ایک فلسفی کے خیال کے مطابق اصلی قابلیت صرف وہ وسائل یعنی طریقۂ استعمال ہے جس سے مواد گذشتہ کارآمد بنایا جاسکے، یہی تصرفات ہیں جن کی بنا پر ایک ادیب یا مؤرخ کو لائق سے لائق شخص پر جو صرف "جامع اللغات" ہو ترجیح فائقہ حاصل ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ نرے الفاظ مؤخر الذکر کے ہاں کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں،

انسانی احساسات و خیالات، تحقیقات و اختراعات کی مسلسل تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے، اور کارلائل کہتا ہے کہ جس شخص کو "چھپے ہوئے حرفوں" کا راز معلوم

ہے وہ انہیں قوتِ آخذہ سے اپنا کرسکتا ہے، صرف "صدائے اصلی" کی تلاش کا ذوق صحیح ہونا چاہیئے، ہاں شبلی، فاضل شبلی "نقوشِ حرفی" کے راز دار ہیں، انہوں نے اپنے ماخذوں کی چھان بین میں صرف "صدائے اصلی" سے غرض رکھی، اور اپنے وسیع سلسلۂ تحقیقات میں زبردست قوتِ استقرائی کے ساتھ اسباب و نتائج کی تفریعاتِ فلسفیانہ سے آجکل کے ترقی یافتہ مذاق کے مطابق اس طرح کام لے سکے جس سے اُن کی آوازِ بازگشت تمام ملک میں گونج اٹھی، اور ہندوستان کے ادبی قلمرو میں ایک نیا تاریخی دَور شروع ہوگیا،

مختصر یہ کہ آجکل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو ان کے اور ہمعصروں کے حصہ میں نہیں آیا، ان کے سخت سے سخت حریفِ مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچتے،

نہ جاننا بھی مزے کی بات ہے، اس لئے بعضوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئیگی، لیکن ہندوستان کیا اور ممالک میں بھی دو چار سے زیادہ نہیں ہیں جو مذاقِ موجودہ کے مطابق مسائلِ قدیمہ کے طے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، شبلی ہم میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ و فلسفہ میں ربطِ باہمی پیدا کیا، اور ان جواہرِ عقلی کی تحلیل و ترکیب اس طرح کرسکے کہ لٹریچر میں ایک خاص امتزاج پیدا ہوگیا ہے، جس کے آثار اُن کے مستقل سرمایۂ تصنیفات کے سوا ان کے متفرق مضامین میں بھی ملتے ہیں، جو مُدتوں ان کے قلم کے سایہ میں مسلسل طور پر وقفِ عام ہوتے رہے،

(نقاد ۱۹۱۳ء)

تنقیداتِ عالیہ

آجکل معیارِ فوقیت اس قدر بڑھ رہا ہے کہ جب تک کوئی کام اوّل درجہ کے پیمانہ پر نہ جاری کیا جائے، چل نہیں سکتا، محمد علی آکسن نے جس قابلیت اور خوش سلیقگی سے کامریڈ نکالا میرے دعویٰ کے ثبوت میں ہے، قوم کے ہاتھ میں انگریزی اخبار ہی کتنے ہیں، لیکن جتنے ہیں ان میں ایک بھی نہیں جو کامریڈ کی گرد کو پہنچ سکے، ایڈیٹر کی زبردست شخصیت نے پرچہ کو ادبیات اور سیاسیات کا مخزن بنا رکھا ہے؛

زبان تو محمد علی کی گویا "مغربی کنیز ہے" جسے وہ ولایت سے ساتھ لگا لائے لیکن مسائلِ عصریہ پر جس نفاست اور آزادی سے یہ لکھتے رہتے ہیں، ان کا حصہ ہے، موجودہ دورِ حریت میں جہانتک جائز مطالبات کا تعلق ہے رُک رُک کر قدم اُٹھانا جس طرح ایک اخلاقی کمزوری ہے اسی طرح یہ بھی ٹھیک نہیں کہ بات بات پر جامہ سے باہر ہو رہتے ہیں اور جب دیکھئے آواز کی جگہ منہ سے کف نکل رہا ہے، کامریڈ نے دو طرفہ کشمکش سے علیحدہ ہو کر جو مستقل روش اختیار کی ہے وہ دراصل اس کے اوّلیات میں داخل ہونے کے لائق ہے، اس کی تنقیدات خاص کر طنزیات لٹریچر کی جان ہوتی ہیں، یہ تو معلوم ہے کہ

اڈیٹر انگریز نہیں ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا عربوں کی اصطلاح میں ایک "عجمی" زبانِ غیر پر کیونکر اس حد تک قادر ہو سکا؟

جس طرح متقدمین کے کلیات میں ہزلیات کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا تھا، کامریڈ نے مؤقت لٹریچر میں "گپ" کے لیئے گنجایش نکالی ہے، جسے میں "مطائباتِ ادب" کہوں گا، یہ حصہ اس قدر بلیغ اور دلچسپ ہوتا ہے جس کا اندازہ قدر افزایانِ سخن ہی کر سکتے ہیں، جنہوں نے کسی یونیورسٹی میں صرف مروجہ ڈگری نہیں حاصل کی ہے، بلکہ انگریزی لٹریچر کا مذاقِ صحیح بھی رکھتے ہیں،

میں کامریڈ کے ان معرکۃ الآرا کارناموں کو سرِ دست گنانا نہیں چاہتا جن کے مخلصانہ اعتراف کے لیئے ہم کو ملک سے باہر کالے کوسوں جانا پڑے گا، اور جو غایتِ شہرت سے محتاجِ بیان نہیں ہیں، یہاں میں محمد علی کی "مغربیت" کے ایشیائی ثمرے یعنی "ہمدرد" پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جس نے حال ہی میں دنیا میں قدم رکھا ہے،

میں کہہ چکا ہوں صرف اوّل درجہ کی حرکت آجکل کامیاب ہو سکتی ہی، محمد علی نے اخباری دنیا کی عام رفتار سے الگ "تھلگ" "پیروست" کے ٹائپ میں "ہمدرد" کو چھاپ کر چھوڑا، اس کے لیئے ان کو جس قدر مشکلات پیش آئی ہوں گی، اُن کا دل ہی جانتا ہوگا، یہ ٹائپ نہایت خوش سواد اور کثیر الزوایا ہے اور مروجہ معمولی ٹائپ کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے، اس کے پڑھنے میں بالکل دقت نہیں ہوتی، اگر ہو سکتی ہے تو صرف اُن لوگوں کو جن کی نگاہیں سر سے ٹائپ سے

مانوس نہیں ہیں،

جس طرح سانولی صورت جس میں نمک ہو ویسی مذاق ہے، رنگ کو گورا چٹا ہونا چاہیئے، مَیں "ہمدرد" کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ یہ اپنی سج دھج اور خوش وضعی کے ساتھ نک سُک میں بھی اَوروں سے مختلف ہے، یہی امتیاز اس کی رُوحِ رواں ہے جس سے وہ کسی طرح مدِ معمولی میں نہیں آتا، ہم کو پنجاب کے قابلِ نفرت تاجرانہ لٹریچر کی بھرمار سے ایک طرح کا "امتلائے ادبی" پیدا ہو چلا تھا، لیکن "ہمدرد" کا جلوہ کافوری طبیعت کے ٹھہرنے کا سبب ہو گیا، اور اُردو اخبار اتنا تو ہو کہ میز پر رکھتے ہوئے شرم نہ آئے، ردیات میں ڈالنے کے لائق جو پیکنگ کے کام بھی نہیں آسکتے، یوں تو بہتیرے ہیں، یہ تو "ہمدرد" کی مادیت ہوئی، جس میں "الہلال" کے سوا وہ کسی سے دوم درجہ پر نہیں ہے، غیر مادی یعنی ادبی حیثیت سے وہ اچھے اچھے پرچوں سے آگے نکلتا معلوم ہوتا ہے، "اتحاد و ایتلافِ ثلاثہ" پر وہ جو کچھ لکھ رہا ہے، سیاسی لٹریچر کے انتقاداتِ عالیہ میں داخل ہونے کے لائق ہے، اس کا ایک عنوان یعنی "برقیات" اس کی کافی ضمانت ہے کہ وہ اپنے مذاقِ تحریر میں مصر کے اعلیٰ درجہ کے اخباروں کے سوا کسی کو لائقِ تتبع نہیں سمجھتا،

آجکل سیاسیات پر قلم آزمائی کے لئے جہاں کسی مغربی زبان کی واقفیت لازمی ہے، اُردو میں ادائے خیال اس وقت تک ممکن نہیں جبتک کہ مصری لٹریچر کی اصطلاحات اور اس کی خوش ترکیبیوں سے مدد نہ لی جائے، اُردو اخبار اور موقت رسائل صرف اس وجہ سے دوم درجہ کے معیار کو چھوڑ نہیں سکتے کہ ان غریبوں کے

پاس جہاں ذاتی سرمایۂ معلومات نہیں، یہ قابلیت بھی نہیں کہ مصر کے سنجیدہ لٹریچر سے کچھ استفادہ کر سکیں، نری باتیں، روزمرہ اور محاورہ کی نزاکتیں اگر ہوں بھی تو آخر کہاں تک؟

ایک تشنۂ ادب، چند قطرات آب سے کہاں تک سیر ہو سکتا ہے جب اس کے لئے ایک ایسے چشمۂ جاریہ کی ضرورت ہے، جس میں عمق کے ساتھ وسعت بھی ہو، ہندوستان میں سب کچھ ہے بھی نہیں ہے، جس سے کچھ نہیں ہو سکتا، وہ پتھر کی ایک سِل لے کر دنیا کی معلومات میں اضافہ کے لئے تیار ہو جاتا ہے،

بہر حال ہم کو "ہمدرد" سے بہت کچھ توقعات ہیں، اور ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی امتیازی خصوصیت یہ رکھے گا کہ "الہلال" کی طرح ادبی حیثیت سے وہ ایک مصری پرچہ معلوم ہو،

یہاں تک تو صرف ثناسانہ اعتراف تھا، اب کچھ شکایتیں بھی سن لیجئے!

(۱) وقت کسی طرح کافی نہیں، مقررہ قالب اسے جلد اختیار کرنا چاہئے،

(۲) کاغذ بالکل گھاس کا معلوم ہوتا ہے، یہاں سے موٹے نکل جائے گا، اسے کم سے کم "الہلال" کا سا ہونا تھا، سفید تر، چکنا اور نہایت مضبوط، سرورق تقطیع کا مرتبہ سے بھی کچھ نکلی ہوئی ہے، حالانکہ ضرورت نہیں تھی،

(۳) یائے معروف و مجہول میں لازماً فرق ہونا چاہئے، ٹائپ میں یہ غلط مبحث گراں گذرتا ہے،

(۴) ایک پرچہ میں یوں چھپا تھا "جس کی ساخت قوت والے امراء کے

اجتماع سے بنی تھی"، "ساخت" کے ساتھ ہوئی تھی" ہونا چاہیئے تھا، کیونکہ نحو والوں کی غلطی ہے لیکن اس سے زبان کے اعتبار میں فرق آتا ہے،

(۵) "بے ذریعہ کی تار برقی خبریں" یہ ترکیب کچھ پسند نہ آئی، مصر والے "لاسلکی" لکھتے ہیں، آپ اسے غیر مانوس سمجھتے ہیں تو "بے تار کی برقی خبریں" لکھئے،

میں "گورہ اردو" سے گھبراتا ہوں، ایڈیٹر کو بھی اس کا خیال ہے، اور یہی وجہ ہے کہ باوصف اس کے کہ میں نے "ہمدرد" کے شائع شدہ مختصر اجزاء نہایت غور سے دیکھے، تاہم اس سرسری گرفت کے سوا جس کی تصریح کردی گئی ہے، کوئی اہم بات نہ ملی، جس کی طرف لائق ایڈیٹر کی توجہ مائل کی جاتی، آجکل انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال سنجیدہ لٹریچر کے لئے ساقط المعیار ہو رہا ہے، ہم کو مصر سے ذخیرۂ الفاظ مل جائے گا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اگر کوئی دقیق اور اجنبی اصطلاح ہاتھ آئے، تو انگریزی مفہوم قوس میں ضمناً جگہ پاسکتا ہے، اور یہی ایک امر "ہمدرد" کی امتیازی روایات کے قائم رکھنے کے لئے کافی ہوگا،

(نقاد۔ ۱۹۱۳ء)

نقّاد

پر

غیر ستائشی جنبشِ لب

اُردو میں لائقِ قدر رسالے اس قدر کم ہیں کہ کوئی مفید اضافہ درا صل لٹریچر کی خدمت ہے، جس کا اعتراف نہ کرنا خود انشا پردازی کی حق تلفی ہے، حضرت دلگیر نے نقّاد سے آگرہ کی لٹریری تاریخ میں ایک ضروری صفحہ بڑھایا ہے جس کی واقعی کمی تھی، کسی زمانہ میں یہاں سے "تیرہویں صدی" "زمانہ" اور "فسانۂ ایام" اچھے اچھے پرچے نکلے، آج ان میں سے ایک بھی نہیں، صرف یادِ ایام رہ گئی،

کائنات میں کوئی چیز تلف نہیں ہوتی، صرف ہیئت بدلتی رہتی ہے، ہم نقّاد کو بھی گذشتہ رسائل کا خلفِ ارتقائی سمجھتے ہیں، یہ بھی اسی مٹی سے اپنا خمیر لے کر اٹھا ہے، جہاں اس کے بڑوں کی ہڈیاں دبی پڑی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ رگوں میں، رگوں کے دوڑتے ہوئے خون میں جوہرِ شرافت بھی موجود ہو، جو وراثتہً دلگیر کے لٹریری بچے کا حق ہے، جس کی نسبت میں صرف حوصلہ افزا خیالات رکھتا ہوں، دلگیر صوفی صافی ہیں اور وسیع دائرۂ احباب رکھتے ہیں، اسلئے خیال تھا کہ ان کے

ادبی مقاصد سے ہمدردی رکھنے والوں کی تعداد خاصی ہوگی، اور میں خوش ہوں کہ یہ خیال غیر صحیح نہیں نکلا لیکن الناظرین احسن صاحب مارہروی کے خیالات دیکھ کر مجھے نقاد کی کامیابی کی طرف سے ایک طرح کا اطمینان ہوگیا ہے، کل کے بچہ کی بساط ہی کیا؟ لیکن حاسدانہ نگاہیں پڑنے لگیں، اور وہ بھی اس اہتمام کے ساتھ کہ کوئی برائی نہیں جو "نقاد" کے سر نہ لگائی گئی ہو!

میرا خیال ہے دوم درجہ کی خلقت عموماً قابل نفرت ہوتی ہے اور زیادہ تر اس کا جہل مرکب جس میں تنگ نظری اور تنقیص بے جا کے سوا منصفانہ تنقید یعنی شایستگی کا کوئی عنصر نہیں ہوتا حضرت مارہروی نے "فلسفۂ حسن وعشق" کا بھی خاکہ اڑایا ہے اور اسی پر سارا زور ہے، ان کا علوم مشرقی و مغربی دونوں سے "اُمّی محض" ہونا ان کی کافی سفارش تھی کہ میں ان کے مقابلہ میں تضیع اوقات پسند نہ کرتا لیکن چونکہ لٹریچر کی حق تلفی کی گئی ہے اس لئے ان کے کانوں تک مجھے دست شوق نہ سہی اپنی آواز تو پہنچانی ہی پڑے گی،

فلسفۂ حسن کے خیالات کا زیادہ تر حصہ، حضرت کو یہ سن کر مایوسی ہوگی، کہ ذینوفن کے "مقالات غیر فانی" سے ماخوذ ہے، جو سقراط کا شاگرد رشید تھا، یونانیوں میں مذاق حسن اس قدر رچا ہوا تھا کہ وہ عورت اور حسن کو مترادف سمجھتے تھے، ان کے جذبات کی نفاست کے انداز سے آج ہم بھی قاصر ہیں، عورت اور اس کے لطیف متعلقات کی نسبت ان کی نازک خیالیاں اتنی اچھوتی اور دنیا سے نرالی تھیں کہ ہم اپنی زبان میں ادائے خیال کے لئے الفاظ نہیں پاتے بھی جذبات

خیالات بتدریج ترقی کر کے ان کی زندگی کے تمام صیغوں میں سرایت کر گئے، جن سے رفتہ رفتہ ان فنونِ نفیسہ کی بنیاد پڑی جو آج مہذب سے مہذب ملک کے لئے سرمایۂ فخر ہیں، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے اپنے فصیح ایڈریس میں جو علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس میں دیا گیا تھا، نہایت صحیح فرمایا تھا کہ مسلمانوں نے اہلِ یونان کے مذاقِ حسن پرستی اور جذباتِ نفیسہ سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، اور جو کچھ اخذ کر سکے وہ یونانیوں کے خوانِ نعمت کی گویا چھوڑی ہوئی ہڈیاں تھیں،

یورپ نے جو جذباتی حیثیت سے یونانیوں کا شاگردِ رشید ہے "حسن پرستی" کو اتنی ترقی دی کہ اب اس کے استاد اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے، مثلاً "زہرہ" کو لیجئے جو حسن کی دیوی ہے جس کی پرستش کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بڑے بڑے فلسفی اس کے حلقۂ اثر سے بے نیاز نہیں ہیں "زہرہ" نہایت خوبصورت ہے، لیکن سر سے پاؤں تک ننگی! اودی اودی رگوں کے پیچ و خم نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچے ہوئے، کھلے ہوئے لمبے بالوں سے خوش آب موتیوں کے سے قطراتِ آب ٹپکتے ہوئے، گویا نہا دھو کر سمندر کے کف سے پری نکلی ہے! پیکرِ خیالی جب اس انداز سے مجسم ہو کر لباسِ عریانی میں جلوہ گر ہو، تو تخیل کے لئے کیا باقی رہا؟ اسی طرح مختلف جذبات کی تصویریں ہیں لیکن سب کی سب عریاں! اٹلی میں مرمری مجسمے دیکھئے، پیرس میں سیلون کی سیر کیجئے، حسن و جذبات کی پریاں، آپ کو بالکل جداگانہ عالم میں نظر آئیں گی! بڑے بڑے فلاسفر، شاعر، حکما، ادیب، اپنا اپنا سرمایۂ خیال ان سے اخذ کرتے ہیں، جن سے لٹریچر میں

طرح طرح کی نزاکتیں پیدا ہوتی ہیں،

لیکن ہندوستان اپنی مفروضہ دماغی ترقیات کے ساتھ بھی ان باریکیوں کو سمجھ نہیں سکتا، یہاں چار دن ہوئے، قابلیت کا معیار یہ تھا کہ چند کتابیں پرانے سلسلۂ درس کی پڑھیں اور تیلی کے بیل کی طرح جہاں تھے وہیں رہے، بہت ہوا تو دو چار دیوان دیکھ ڈالے، پہلے کوئی مصرع بے غایت تعدد طریق پر موزوں کیا، پھر تک تک ملانے کیلئے ایک مصرع ابتدائی کی پیوندسوجھی، چلئے شعر ہو گیا، کچھ دنوں کے بعد اس ہیر پھیر میں اچھے خاصے شاعر ہو گئے، کچھ اور ترقی کی تو کسی اگلے پچھلے شاعر کے خواہ مخواہ جانشین بن بیٹھے، جس کا مبلغ یہ ہو وہ "فلسفہ حسن" پر جس حد تک "نقادی" کی صلاحیت رکھتا ہے اسے میں اہلِ نظر کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں،

حضرت مارہروی کو یہی خلش ہے کہ ڈھیٹھ، انگیا، محرم اور چوڑیاں، صاحب فلسفہ کے اختراعات ہیں، یونانیوں میں یہ چیزیں کہاں؟ ان کی سمجھ پر کسی کو رونا آئے تو میری خطا نہیں! لیکن میں اپنے اُمّی دوست کو بتانا چاہتا ہوں کہ مہوشانِ یونان ایک طرح کا "سینہ بند" استعمال کرتی تھیں جو "تنبیہی" ہوتا تھا، تاہم وہ دستانے کی طرح جسم میں سمیچ جاتا تھا، بناوٹ کے بھی مدارج تھے، کبھی چُست اور کبھی چُست تر، اسی طرح لمبے اسکارف سر پر ڈالے جاتے تھے، جنھیں آپ ڈوپٹہ کہتے ہیں کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوتے تھے، السبی بایڈیز کا قصہ پڑھئے جو یونان میں سب سے زیادہ سجیلا جوان تھا، نازنینانِ ایتھنس اس پر جان دیتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ "نذرِ شباب" ہو کر رہیں، کیونکہ ان کے خیال میں السبی بایڈیز کے حسن کا ادنیٰ ٹیکس تھا، وہ جس حلقہ

میں ہوتا تھا، اسکارف کو ہوا میں جنبش دی جاتی تھی، غایت یہ تھی کہ

"حبابے خاستہ از بحرِ کافور"

پر اُسے نظر جمانے کا موقع ملے، اسی طرح کھلے ہوئے بال اور

سیہ چوٹی بدستِ آں نگارے

بشاخِ صندلی پیچیدہ مارے

کا بھی رواج تھا، صاحبِ فلسفہ کی یہ جدّتِ اعتراضیہ تھی کہ وہ مضمون کو اپنی زبان کی خصوصیات کے ساتھ ادا کر سکے، مجھ کو اصرار ہے کہ عورت کے ذکر کے ساتھ اس کے لطیف متعلقات کی تصریح ناگزیر ہے، محرم[1] کی جگہ "قبا" کفر ہی نہیں زبان کا خون کرنا ہے، مجھ کو معلوم ہے ایشیائی شاعری اپنے جذبات میں "مخنث" ہوتی ہے لیکن جس زبان کی شاعری "بندِ قبا" کو جائز رکھتی ہو جس کے لائقِ فخر شعراء کسی "معشوقہ" پر نہیں "معشوق سبزہ آغاز" (یعنی داڑھی مونچھ والے) پر فرضی اور غیر طبعی اظہارِ عشق کے عادی ہوں، جہاں عورت کیلئے اس کی خصوصیات کے اظہار کے ساتھ بھی فعلِ مذکر کے استعمال کا رواج ہو، اس زبان کے پھوہڑ پن کا کیا ٹھکانا ہے؟ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ

---

[1] دنیا کی متمدن اقوام کی عورتوں میں ہمیشہ بالائی حصۂ جسم کے لئے پوشش خاص کا رواج رہا ہے، آج بھی مہوشانِ فرنگ میں طرح طرح کے لباس ہیں جو جسم سے متصل پہنے جاتے ہیں، یہ آرائشِ جوانی کے سوا صحتِ نسوانی کے لئے بھی ضروری ہیں، اختلافِ تحویشِ ذہنی کے ساتھ ان کے مختلف نام ہیں اور ان ناموں کی تصریح سوسائٹی کے طبقاتِ اعلیٰ میں بھی غیر سنجیدہ نہیں سمجھی جاتی۔

دراصل "محرم" بھی اتنا شایستہ اور مہذب لفظ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان اس سے زیادہ بہتر اور سنجیدہ تر لفظ پیش نہیں کر سکتی، ہاں ایک جاہل نے اس کا ترجمہ کر کے صرف اپنی نفرت انگیز "سوقیت" کا اظہار کیا تھا۔

اس "نچریت" کا نام "سنجیدگی" ہے!

لیکن اس معیارِ لطافت سے علیحدہ ہوکر اگر مغربی رنگ میں دادِ سخن دی جائے تو بے سمجھے بوجھے کوّے کی کائیں کائیں صرف ثقلِ مذاق کا ثبوت ہے، ہمارے دوست اگر مغربی لٹریچر اور فلسفہ سے بیگانہ ہیں، اگر وہ نہیں جانتے کہ فلسفۂ حسن کا ماخذِ اصلی کیا ہے؟ اگر اُن کے دماغ میں یہ مناسبت نہیں ہے کہ وہ ان نازک مسائل کو جذب کر سکے، اگر وہ لطائفِ ادبی اور غیر سنجیدہ خیالات کی حدود میں تمیز نہیں کر سکتے، مختصر یہ کہ اگر وہ نہیں جانتے کہ مغربی نزاکتِ خیال کیا چیز ہے؟ تو ہم ان کو ایک کافی حد تک معذور سمجھنے کیلئے تیار تھے، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنے چھچھورے اور قلیل اظہارِ خیال اور بے باکانہ اظہارِ رائے سے جس کو خیر سے آپ تنقید سمجھتے ہیں، صرف اپنا جہلِ مرکب ثابت کر سکے، عورت سے متعلق نازک خیالی اگر "فحش بیانی" ہے تو فلسفہ کی یہ ڈانٹ سُن رکھیئے کہ خود عورت فحش ہے، اور اس سے زیادہ وہ ترکیب فحش ہے جو انسان کے عالمِ وجود میں آنے کا سبب ہوئی، جسے اخلاقاً میں صرف "سنجیدگی" کہوں گا!

سچ یہ ہے کہ جن صاحبوں کی ابتدائی تربیت "چوک کے کوٹھوں" پہ ہوئی ہو، وہ ان نکتوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں جو فلسفۂ حسن کا مایۂ خمیر ہیں، جس کی غایت "بہارِ عشق" کی طرح نثریں (بہائم صفت لوگوں کو شاید خواہشات کی اطفائے حرارت کے لئے برانگیختہ کرنا نہیں ہے) بلکہ شریف تر انسانوں کے سامنے "جنسِ لطیف" کو مرقعِ جذبات بنا کر پیش کرنا ہے جس میں اس لائقِ رشک "مادیت" کے ساتھ ہر طرح کی اخلاقی اور جذباتی صفات آنکھوں کے سامنے آجائیں، آپ فرطِ سنجیدگی سے اُسے

"گھونگھٹ کی پردہ دری" کہتے ہیں لیکن غریب کو معلوم نہیں کہ "عالمِ فطرت کی سب سے خوبصورت حکمران" یعنی عورت کی شان اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے، عورت مادی کیفیات کے ساتھ بھی ایک ایسا مظہر پاکیزہ ہے جس پر خود فطرت سی لطیف چیز کو ہمیشہ ناز رہیگا! صرف فضلائے عالم میں نکل کر دیکھئے، حجروں کی تاریکی میں اگر آپ "شپرانہ" کچھ دیکھ بھی سکے تو آپ کی قاصر النظری، راز ہائے سربستہ فطرت کو پھر بھی آپ کے لئے سربمہر رکھے گی!

جناب ماہروی کی اس فریب کاری کو دیکھئے کہ جہاں عورت کی مادیت پر آپ جامہ سے باہر ہوگئے اس کی اخلاقی اور جذباتی کیفیات سے جو فلسفہ کی جان ہیں دانستہ آنکھیں پھوڑلی ہیں، آپ نے اپنی پاک طینتی کا ثبوت اقتباسات پیش کردہ میں بھی دیا ہے جو میرے خیال میں ایک طرح کی تحریف ہے، کیونکہ یہ اجزاء مختلف موقعوں سے لئے گئے ہیں، اور ایک سائنس میں نمایاں کر کے پیش کئے گئے ہیں، اور گو فلسفہ میں ایک حرف سنجیدہ نہیں، تاہم آپ کا فتویٰ یہ ہے کہ بعض حصے "تہذیب شکن" ہیں! میں صرف ایک آدھ مثال پر قناعت کروں گا، مثلاً سینہ کی تعریف میں،

"فطرت کی شوخی دیکھئے گا! فتنۂ قیامت زا کیلئے گنجایش نکالی بھی تو کہاں"؟ یہ نازک خیالی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ "شکسپیر" زندہ ہوتا تو بتا سکتا کہ اسکے خیال کا قالب کس خوبصورتی سے بدلا گیا ہے اسی طرح "مقیاس الشباب" کی ترکیب پر یاد رکھئے اردو لٹریچر کو ہمیشہ ناز رہیگا، صاحبِ فلسفہ نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"آہ عورت! تو فسانۂ زندگی ہے! جس طرح اپنی صاف شفاف ہستی سے ایک

جھونپڑے کو شیش محل بنا سکتی ہے، بڑے سے بڑے ایوانِ عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جبتک تجھ ہی موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں، اس کے لئے چھڑوں کی جھنکار ضروری نہیں، محض تیرا بس پر دہ ہونا کہیں ہو کسی کے لئے ہو، کافی ہے"
غور سے پڑھئے، یہ جذباتی اور اخلاقی لٹریچر کی بہتر سے بہتر مثال ہے جو اُردو لٹریچر کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے لیکن ہمارے دوست اسے "فحش" فرماتے ہیں، غالبًا "چھڑوں کی جھنکار" پر کان کھڑے کئے ہونگے "جہلِ مرکب" اتنا تو ہو!۔

جناب مارہروی نے "فلسفۂ حسن" کے لئے ایک نیا نام پیش کیا ہے، جو اُن کے ناقابلِ التفات خیالات و مقالات کی گندگی کا ایک جامع ثبوت ہے جس سے ان کے اصلی خصائل اور مذاقِ طبع کی پوری غمازی ہوتی ہے جس کے بعد اب مجھے دوسری کی ضرورت نہیں، لیکن وہ چوکے جس آلہ سے وہ فلسفہ پر وار کرنا چاہتے ہیں، ان کو یاد نہیں رہا، وہ ان کا "عنوانِ زندگی" ۔ اور اس حیثیت ان کیلئے لائقِ ادب ہے کہ وہ ان کا "مسندِ ہستی" ہے، شرم شرم! اسی سلسلہ میں مختصرًا ایڈیٹر صاحب "الناظر" کی روانیِ قلم کی بھی داد دینا چاہتا ہوں، آپ کا "تنقیدی نوٹ" تمامتر جناب مارہروی کے "جہلِ مرکب" کا کورانہ تتبع ہے، یا یوں سمجھئے کہ حضرت مارہروی کے دل کی سیاہی جو اُن کے قلم سے ٹپکی تھی، حضرت نے اسی کو لیکر پھیلایا ہے جس سے کئی صفحے رنگ گئے، آپ کا غیر ضروری اظہارِ خیال بے معنی فصاحت کا ایک دھوکا ہے، یعنی کثرتِ الفاظ کے مقابلہ میں مفہوم کچھ نہیں! جس کی غایت صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ "الناظر" کے ہوتے دُنیا میں کسی پرچے کی ضرورت نہیں!

بہت پھیر پھار اور حشو و زوائد کا ماحصل صرف اتنا ہی ہے جو میں نے عرض کیا، اسی میں "خادم الملک" (یہ اپنے منہ میاں مٹھو ظفر الملک کا قافیہ ہے) حضرت دلگیر کا "نقاد" بھی آ گیا جس کا وجود اس کے دشمنوں کی چھاتی کا پتھر ہو رہا ہے، اس کے بعد آپ "فلسفۂ حسن" کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور انشا پردازی کا دریا بہا یا گیا ہے لیکن مجتہدانہ ایک حرف نہیں، اندھے کی لاٹھی! جناب مارہروی کے ساتھ کبھی غار میں کبھی دلدل میں!

بڑی نرمی سے فرماتے ہیں "جنس لطیف کے عضو عضو کی تشریح اور اس پر سرجری کا عمل کیا گیا ہے" فقرہ تو اچھا ہے، لیکن دیکھئے پھر وہی بے معنی فصاحت کا دھوکا! "فلسفۂ حسن" میں اگر غلطی نہیں کرتا تو صرف "بہترین عطیۂ فطرت" یعنی عورت کے سینہ کے متعلق مغربی خیالات کا چربہ اتارا گیا تھا، اور ادائے خیال کے مختلف پہلو دکھائے گئے تھے جس کی نزاکت کو آپ سمجھ بھی نہیں سکے، تاہم لائق شرم غلط بیانی سے آپ نہیں چوکے اور جناب مارہروی کے ساتھ مجبوراً مجھے آپ کی بھی خبر لینی پڑی لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی "نقاد" کا معیار اخلاق "الناظر" سے گھٹا ہوا نہیں ہے، حضرت کو یاد ہوگا! "الناظر" میں کبھی ایک مضمون نکلا تھا جس میں عورت کی نسبت یہ دکھایا گیا تھا کہ وہ عصمت فروش اور بے وفا ہی نہیں بلکہ بدترین مخلوقات ارضی ہے، جس وسعت کے ساتھ اس شرمناک موضوع پر قلم فرسائی کی گئی تھی وہ آپ کی اور جناب مارہروی کی متفقہ ہزلیات سے بھی کچھ بڑھی ہوئی تھی، لکھنؤ میں بیٹھ کر ڈولی میں سارا شہر "صرف

الناظر کا حصہ تھا، بر خلاف اس کے نقاد آگرہ "جنسِ لطیف" کو اپنے مختص النوع خصائص کے ساتھ اس طرح پیش کر سکا کہ وہ اس عالم کی چیز نہیں معلوم ہوتی، اس نے جذبات کے جتنے پہلو دکھلائے ہیں وہ بجائے خود فلسفۂ ادب کی جان ہیں جس کا ایک حرف بھی میرے خیال میں چھوڑنے کے لائق نہیں تھا،

آخر میں مجھے حضرت دلگیر سے یہ کہنا ہے کہ جہاں ادبیات کا سرے سے مذاق نہ ہو وہاں اتنے نازک خیالات کا پیش کرنا صاحبِ فلسفہ سے زیادہ دلگیر کی غلطی تھی، غلطی پر غلطی یہ ہوئی کہ یہ مضمون آب و تاب کے ساتھ ایڈیٹر کی طرف سے پیش کیا گیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کم بین طبائع ضبط نہ کر سکے اور مجھ کو بھی ان کا نوٹس کرنے کے لئے لٹریچر کی طرف سے قلم ہاتھ میں لینا پڑا جس کا مجھے افسوس ہے . . . . .

میری رائے ہے کہ "دویم درجہ" کے اظہارِ خیال کی بہترین دوا یہ ہے کہ وہ ایک دم سے نظر انداز کیا جائے لیکن اس قسم کا استغناء شاید یورپ میں جائز ہو، جہاں وسیع النظر اور خوش ظرف اہلِ قلم تنقیداتِ عالیہ (یعنی ہائیر کریٹی سزم) کا صحیح مذاق رکھتے ہیں لیکن تنگ خیال اور بے درد مارہروی اور ان کے یارانِ طریقت کے نتائجِ فکر جو تنگِ انشا پردازی ہیں، بھٹیاریوں کی "تو تو مَیں مَیں" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، اور گو میں ان کی تمام مزخرفات کا استقصا نہ کر سکا: تاہم سلسلۂ تحریر میں جس قدر حصہ ان کے خیالات کا جلوہ گر کیا گیا ہے وہ بتائے گا کہ ان پر ایک کافی حد تک توجہ کی ضرورت تھی،

(نقاد ۱۹۱۳ء)

اُردو لٹریچر
کے
عناصر خمسہ

آیندہ زمانہ میں اُردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو انیسویں صدی کا پچھلا دور اس عہد کا "نشاۃ الثانیہ" (یعنی دورِ جدید) ہوگا، جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز ایک بے غایت شاعری کا مجموعۂ خود رو تھا، منازلِ ارتقائی طے کرتی ہوئی اس سطحِ امتیازیہ کے قریب قریب پہنچ گئی جہاں دُنیا کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سکہ جما رہی ہیں،

کل کی بات ہے جب تک سے تک ملا لینا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا، گرمیِ محفل کیلئے چند مصرعوں کی پیوند کاریاں لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبکدوش کر دیتی تھیں، لیکن اقتضائے وقت کے ساتھ تغیرِ مذاق دیکھیئے کہ آج ہم کو ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے،

یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں، کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو، ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیرِ حالت کے ساتھ وہ آثارِ خارجی بھی جن میں ہم گھرے ہوئے تھے، کچھ سے کچھ ہو گئے، غرض زمین بدلی، آسمان بدلا اور ہم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے، اور ابھی معلوم نہیں مؤثراتِ خارجی اور واقعات کی قدرتی رَو ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی!

اس کشمکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقات ارتقائی کی درمیانی کڑیاں آپ کو گنائی جائیں، صرف یہ سمجھ لیجئے کہ بوسیدہ اور فانی اجزاء کی جگہ قوی تر عناصر نے لی اور اقلیم سخن کی شریف تر ہستیاں عالم وجود میں آئیں جن سے اردو سا کم سواد لٹریچر ایک دم سے آشنائے فلسفۂ ادب ہو گیا،

میری غرض لائق عزت سر سیدؒ، پروفیسر آزادؔ، نذیر احمدؒ، حالیؔ و شبلیؒ سے ہے، جن کے قلم کے سایہ میں اردو یعنی کل کی چھوکری اتنی رودار ہو گئی کہ السنۂ یورپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے، ان میں سے ہر شخص مختص النوع خصائص ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کا آپ مالک ہے، اور جس طرح ادب القدماء (یعنی کلاسیکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے ایک وقت آئیگا جب ان کے ادبیات کا بیشتر حصہ لائق پرستش اور غیر فانی سمجھا جائے گا،

یہ موضوع نہایت اہم ہے اور چونکہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے، اس لئے سرسری طور پر ٹالنا منظور نہیں، بلکہ میری خواہش ہے کہ آجکل کے اچھے لکھنے والے اسپر قلم آزمائی کریں، میری غرض لائف نگاری سے نہیں ہے بلکہ صرف تنقید ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں، جس میں بلحاظ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ ایک حد تک تنقیدات عالیہ (یعنی ہائیر کریٹی سزم) کا حق ادا ہو جائے،

سر سیدؒ نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا در اصل انکی ادبیات میں داخل ہونے کے لائق ہے، یہ انہی کے قلم کی آواز بازگشت ہے جو

ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کیلئے دلیلِ راہ بنی، آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر کئے جاتے ہیں، دراصل اسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں، ورنہ پہلے یہ جنسِ گراں باوصفِ استطاعت اچھے اچھوں کے دسترس سے باہر تھی، سرسید کے کمالاتِ ادبی کا عدمِ اعتراف صرف ناشکری ہی نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے اور میں خوش ہوں کہ شریف النفس حالی نے آجکل کی بہتر سے بہتر "سوانحمری" لکھ کر منحرف طبائع کو بوساطت سخت سے سخت شکست دی جو خیال میں آسکتی ہے، لیکن نئی نسل پچھلا سبق کسی قدر بھول چکی ہے، حالانکہ سرسید کے حقوق زیادہ تر اسی کی گردن پر ہیں، بلکہ مجھے کہنا چاہئے کہ لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سرسید کے علمی کارنامے پر نگاہِ عکس ریز ڈالی جائے، اور اس کے لئے سید سجاد حیدر (یلدرم)، مجھے زیادہ تر موزون معلوم ہوتے ہیں،

علامہ نذیر احمد کو میں "شمس العلماء مارہروی" تو بہ اسید افتخار عالم کے سر لگانا چاہتا ہوں، جنھوں نے حال میں مولانا کی نہایت مفصل سوانعمری شائع کی ہے، باستحقاق ان سے بہتر کوئی شخص خیال میں نہیں آتا، یہ لکھیں گے اور ہمدردانہ اور سخن گسترانہ لکھیں گے، اسی کی ضرورت ہے، نذیر احمد گو ایک حد تک "عقلیات" سے رسّیاں تڑاتے رہے لیکن "ادب اور منقولات" سے متعلق جو ذخیرہ انھوں نے چھوڑا ہے، وہ اس قدر اہم ہے کہ کچھ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کروں، ان کی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرتِ بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور تصرفات جو جدتِ خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر

کی جان ہیں، اس پر اضافہ کیجئے اُردو سی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا
جس پہ کلاسیکس کا دھوکا ہو،

بعض صاحبوں کو غالب کی طرح انکی مشکل پسندی کا رونا ہے، اور وہ پیوند کاریاں جو
اُن کی شستہ رفتہ اور برجستہ اُردو میں ہوتی ہیں جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے،
عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب ان کی جدتِ اختراع
اور قوتِ آخذہ کا زور ہے، آمد کی رَو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی،
اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بلحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنۂ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں،
تاہم متانت اور حسنِ کلام سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے جو انکے لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے، نہ انکے
اچھوتے اور مستقل طرزِ ادا (اسٹائل) پر، جو شارعِ عام سے الگ ٹھاٹ اور آپ اپنی نظیر
ہے، کوئی اثر پڑتا ہے، جو باتیں اوروں کے ہاں بیگانی ہیں انکی بے ساختگی اور برجستگی
خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں کہ مغائرت یا اجنبیت کا
احساس تک نہیں ہوتا، پھر بھی جہانتک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجایش ہے
ادب چاہتا ہے، سبک نکتہ چینیوں سے انکا کمال ہمیشہ بے نیاز رہیگا،

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ باوصف کمالاتِ علمی جو ایک حد تک ان کے
ہمعصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے، ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاقِ سخن
کی آزمایش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہو سکتا تھا،

جس طرح ناولوں اور تراجم میں بہ رعایتِ فن یہ اپنی قادر الکلامی کا بڑے سے بڑا
ثبوت دے سکے، لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے، مثلاً فلسفہ

تاریخ وغیرہ جس میں وسعتِ نظر کے ساتھ تحقیق وتنقید، قوتِ استقراء، تفریع مسائل اور فلسفیانہ استخراجِ نتائج کے ساتھ غیر منقطع انضباطِ خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف نہیں آتے، یہی حدِ فاصل ہے جو شبلی کے قلمرو سے ان کے دائرۂ کمالات کو جدا کرتی ہے، اور یہی وہ آزادی ہے جس کے آثار انکے لکچروں میں آپ دیکھیں گے، اور جس کی بنا پر یہ اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوعِ سخن کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبۂ انشا پردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زورِ بیان کا قصور ہے، جو اظہارِ فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا،

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کر سکتا جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں، جہاں تک لائقِ ادب "مشرقیت" کا تعلق ہے، قوم کی یہ آخری بہار تھی، جس کے اجزاء کچھ اٹھ گئے، کچھ باقی ہیں، قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں ہیں، جس عربی، مرحوم عربی کو ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈتے ہیں، علامۂ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہوگئی، مگر ان کا حصۂ غیر فانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں، وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہیں، اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل (آئڈیل) ہے جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں،

نذیر احمد کے استادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب ہو نہیں سکتی، لیکن اخلاف کے لئے جس قدر سرمایۂ علمی انہوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہیگا، ہم ان کی قیمتی تصنیفات کو سینہ سے لگائیں گے، آنکھوں میں جگہ دینگے، دائمی جدائی

کے بعد، ادائے سپاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہا ہے،

سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بوڑھے حالی ہیں، یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں، اعلیٰ درجہ کے ناثر بھی ہیں، لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے جس نزاکت کے ساتھ ادائے خیال کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے یہ اپنا مطلب نکال لیتے ہیں، کثرتِ مواد کے ساتھ بھی دوسرے اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے، طبیعت میں ایک جچا تلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو و زوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کسی موضوعِ بحث میں ان نکاتِ متعلقہ کی طرف نہایت خوبصورتی سے فوری انتقالِ ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اس بحث کی جان ہوتے ہیں، لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں میں طے کر دیئے جائیں یہ سلاست و نفاست قدرتِ کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصہ میں آئی،

ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے خیالات و مقالات میں جھول جھال یعنی کسی طرح کا تذبذب فی الرائے نہیں ہے، خالص یک رنگی ہے، جسے اصطلاح میں فلسفیانہ کہئے، معیارِ خیال اس قدر بلند پایہ اور سلجھا ہوا ہے کہ کہیں سے یہ بیگانے نہیں ہوتے، مجھے ہنسی آتی ہے جب سنتا ہوں کہ حالی کی جدید شاعری بلحاظِ فن ساقط المعیار ہے اور اس لائق نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے، یہ فتویٰ "پرانی لکیر" کے شیدائیوں کا ہے جو خیر سے یہ بھی نہیں جانتے کہ شاعری دراصل کیا چیز ہے اور اس کا موضوعِ اصلی کیا ہے؟ بھیڑوں کا ایک غول ہے جو مدت ہوئی آنکھیں بند کئے ایک راستہ پر پڑ لیا، اور آگے پیچھے آج تک چلا آیا لیکن ہم کو اس سے

کچھ بحث نہیں، نہ ہم اس مجموعۂ ردّیات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں، جو پُرانے خیال والوں کا سرمایۂ ناز ہے، ہم ایک حد تک معصوم حماقتوں سے کسی کی ہوں، لُطف اُٹھانے کے لیئے تیار ہیں، کیونکہ یہ بھی ایک عیش ہے، صرف اتنا کیجئے کہ بُرے بھلے حالی کو جدید گروہ کی لائق فخر پیشوائی کے لئے چھوڑ دیجئے،

میرا خیال ہے حالی کے کلام پر مولوی عبدالحق کھل کر دادِ سخن دینگے، یہ آجتک باوصف قابلیت اور فلسفیانہ مذاق کے صرف "مقدمات" پر ٹالتے رہے، اُنکا مصرفِ صحیح کچھ اور تھا، ان میں مادۂ اختراعی (ایجینیلیٹی) حاصل ہے، مگر قوتِ فیصلہ کی کمی "صحافت" سے آگے بڑھنے نہیں دیتی، حالانکہ انکا سلیقۂ تحریر سفارشی ہے کہ مستقل تصنیف و تالیف کے سوا یہ کچھ اور نہ کرتے، بہرحال انکو کم سے کم میری خواہش تو پوری کرنی ہوگی،

یادش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے زیادہ ایک زندہ مصنف پر قلم آزمائی کی گنجایش نہیں، چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منہ میں پھیرنا خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں، جدّت طرازی جائز نہیں رکھتی، اور چونکہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا، اس لئے مختصرًا اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا، اور حکیمانہ انکشافات و نکتہ آرائیوں سے اسے ایک مستقل فن بنا دیا،

علیگڈھ کو انھوں نے چھوڑا، اور ندوۃ العلماء نے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے خود ان کو، لیکن میرا بس ہو تو شبلی کو ہندوستان سے باہر کالے کوسوں یورپ کے کسی "بیت الحکماء" (لٹریری اکیڈمی) میں بھیجدوں، جہاں انکو اپنی غیر معمولی قابلیت کی داد بڑے بڑے علمائے مستشرقین سے ملے گی جو بلحاظ ہم فنی ان کے یارانِ طریقت

ہیں، شبلی کا وسیع دائرۂ تحقیقات، اہلِ زبان کی سی فارسی، اس میں بھی شاعری کا ملکۂ راسخہ اور سب سے زیادہ اپنی زبان میں ان کی لائقِ رشک انشاپردازی وہ صفات ہیں جو علانیہ ان کو ہم نفسوں سے ممتاز کرتی ہیں، شعر العجم کے چوتھے حصہ میں فلسفۂ شاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس جس طرح تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے "ادب الاساتذہ" کا بہتر سے بہتر مرقع ہے جس پر دُنیا کی کوئی زبان فخر کر سکتی ہے،

اُردو میں ان کے مطائباتِ نظم کو جو جدید پیداوار ہیں ان کے سلسلۂ کمالات سے علیحدہ کر کے دیکھئے، جن میں لطائفِ ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے، شوخی کے ساتھ سنجیدگی یہ معلوم ہوتا ہے دُوسری زبان کی بلائیں لے رہی ہے،

لیکن اس جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی؟

کل کی بات ہے ایک اتفاقی واقعہ پر شبلی پر ملک کے چپہ چپہ سے لے دے شروع ہوگئی، اور اس قدر غل شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی، بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے، جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری افق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہوگئی، کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟ ہرگز نہیں! صرف حاسدین کی کم نظری تھی، دلوں کی جمی ہوئی سیاہی لغزشِ قلم سے ٹپکی اور بُری طرح ٹپکی،

لیکن شرافتِ علم دیکھئے! "شہر کو جو شبلی" پر کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے، اس ناگوار واقعہ کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولانا کی دست کشی پر ہوا، اپنی آواز بلند کرنی پڑی، وہ صاف صاف کہہ گذرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا شبلی کی وجہ سے تھا،

اب وہ ایک جسدِ بے رُوح ہے، اسی ضمن میں مولانا کے کمالات کا شناسانہ اعتراف اور قوم کی ناسپاسی کا رونا تھا،

"نقاد" میں "تاریخ کا معلّمِ اوّل" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا، ایک قاصر النظر نے اہتمام کے ساتھ "مشرق" میں اسکی تردید کی جسارت کی لیکن عامیانہ و حاسدانہ جس میں علامہ شبلی کو اُن اوصاف سے معرّا کرکے دکھایا تھا جو مضمون نگار نے حسنِ عقیدت سے نہیں بلکہ خود "فلسفہ" کے ایما سے غیر فانی شبلی کی طرف منسوب کئے تھے،

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اٹھانا چاہے تو جی لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں، میرے خیال میں سید عبد الماجد اگر فلسفہ تاریخ سے اتنی ہی دلچسپی کا اظہار کرتے جس اہتمام سے "الکلام" پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی، تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا،

سب سے آخر، مگر در اصل سر فہرست آزاد پر میں خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں، آزاد اس پایہ کے ادیب ہیں کہ اُنکے دائرہ کے اور خلاقینِ سخن کو اُنکے آگے سر جھکانا پڑیگا، آزاد کی جن حیثیتوں پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقاتِ السنہ کے مذاق کیساتھ پاکیزگیِ زبان اور آزاد کا خاص اندازِ بیان ہے جس سے اُنکی نثر عموماً زرنگار معلوم ہوتی ہے،

ایک مغربی شاعر کے خیال میں جس نے شوخی سے عالمِ فطرت (نیچر) پر کمال صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے، خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرشِ ریشمی پر بکھر جانا روانیِ آب سے زیادہ دلکش ہے، مگر اس سے زیادہ تر دلکش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مرصّع پیداوارِ دماغی جو حسنِ صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بیساختہ پن کی تصویر ہو، اس کے سلیس و نفیس لٹریچر کا یہ وصف اضافی کہ رو کھے پھیکے

مسائل کو بھی اس لطافت سے جذب کر سکے کہ کہیں سے بارِ طبیعت نہ ہو، اور فسانے (یعنی لائٹ ریڈنگ) کا لطف آئے، میرا خیال ہے، لائقِ ذکر خصائص میں سے ہے، جس کی بنا پر ایک مشہور موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ "آزاد، اُردوئے معلّٰی کا ہیرو ہے"

جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے؛ اُردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں، اور گو اس مسئلہ پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے، لیکن آزاد کی ادبی فتوحات، تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا، جن حضرات کی نگاہیں دِلّی، لکھنؤ کے اختلافات تک محدود ہیں یا جن کی قاصر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں بلا خوفِ تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفۂ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے، آسان نہیں ہے، اس لئے کسی اختلافی بحث کا چھیڑنا "گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوگا،

سرسید سے "معقولات" الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائینگے، حالی بھی جہانتک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن آقائے اُردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں، جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں، اسی لئے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے ہیں "قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں، جنہیں "افسانۂ یارانِ کہن" سمجھئے،

اس بحث کو اصل تنقیدی مضمون میں پھیلاؤنگا، یہاں افتتاحی حیثیت سے بھی قوت کا صرف کرنا منظور نہیں، اسی سلسلہ میں آپ دیکھینگے کہ جدید شاعری جس کے "آدم" حالی سمجھے جاتے ہیں، غالباً اس کی داغ بیل سب سے پہلے آزاد نے ڈالی تھی مجھ کو آزاد کے لٹریچر سے غیر معمولی دلچسپی ہے اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ انکی دلکش تصنیفات کے ان اجزا کو اُبھار کر دکھاؤنگا جن کا ایک ایک حرف لٹریچر کی جان ہے،

بہر حال ارکانِ خمسہ کی تجویز آپکے سامنے ہے، اکبری نورتن کے مقابلہ میں بعض صاحبوں کو یہ تجدید پسند نہ آئے گی لیکن مجھے افسوس ہے کہ "مصنفین کی صفِ اوّل" میں اس سے زیادہ گنجایش معلوم نہیں ہوتی، تاہم غیر ضروری نکتہ چینی سے علیحدہ ہوکر اگر کوئی صاحب (بشرطیکہ لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں) مجھے مفید مشورہ دے سکے، تو میرا خیال ہے میں اس پر غور کرنے کے لئے ایک حد تک تیار ہوں،

اس تجویز کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کم سے کم سَو سَو صفحے ہر مصنف کے نذر کئے جائیں، اس طرح پانسو صفحوں کی ایک کتاب تیار ہو جائیگی، جس کا ایک طبع خاصہ (یعنی ایڈیشن ڈی لکس) بہتر سے بہتر کاغذ اور چھپائی کے ساتھ شائع ہوگا، جس میں مصنفین کے ساتھ منقدین کی ہاف ٹون عکسی تصویریں شامل کی جائیں گی، اسکی تکمیل مالی امداد سے قطعاً بے نیاز ہے، ضرورت ہے تو ترتیب مضامین کی، جس کی طرف ایک مرتبہ اور میں ان اصحاب کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جن کو فرداً فرداً میں نے نامزد کرنے کی عزت حاصل کی ہے،

(نقاد ۱۹۱۳ء)

پروفیسر براؤن

اور

ایرانی لٹریچر کا دورِ جدید

جس طرح فرانس کے مشہور ادیب "پیرلوئی"، کو ٹرکش لائف، ٹرکش لٹریچر سے ایک خاص دلچسپی ہے، پروفیسر براؤن ایران پر اس قدر مٹے ہوئے ہیں کہ ان کا موضوعِ سخن زیادہ تر ایران اور اسکے متعلقات ہوتے ہیں، ایران کی ادبی تاریخ جس جامعیت کے ساتھ انہوں نے لکھی ہے دُنیائے ادب اسے حیرت سے دیکھتی ہے، دو ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں، تیسری زیرِ ترتیب ہے، جو اس سلسلہ کی آخری کتاب ہوگی، یہ دراصل مسلمانوں کی دماغی تاریخ ہے جو نہایت تحقیق او زتلاش کے ساتھ وسیع پیمانہ پر لکھی گئی ہے، فاضل مصنف نے جدت یہ کی ہے کہ عجمی عناصر کو الگ کر کے دکھاتا گیا ہے،

کچھ روز ہوئے "انقلاب ایران" پر ایک خوبصورت، ضخیم اور حوصلہ افزا کتاب لکھی گئی جو کثرت سے شائع ہوئی "واقعۂ تبریز" پر ان کی کھلی چٹھیاں اگر یورپ کے سیاسی

حلقے برف کی طرح جم کر بے حس نہ ہوگئے ہوتے دل ہلا دینے کیلئے کافی تھیں،

"براؤن" آجکل مستشرقینِ یورپ میں پیش پیش ہیں اور سچ یہ ہے کہ انہوں نے حکمائے فرانس اور جرمنی کے مقابلہ میں ادبی حیثیت سے انگلستان کی ناک رکھ لی، ایک خاص بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں "غیر منحرفانہ" یعنی ہمدردانہ لکھتے ہیں، عربی، فارسی کی متعدد نایاب کتابیں انہوں نے اپنی ایڈیٹری میں شائع کی ہیں، اور یہ سلسلہ مستقلاً جاری ہے، سلیقہ تحریر اتنا اچھا ہے کہ علمائے اسلام کو بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے،

حال میں ان کے قلم سے ایک کتاب نکلی ہے جس میں ایران کے دورِ جدید کی شاعری اور صحافت (جرنلزم) سے بحث کی ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ "انقلاب" کے بعد ارتقائے ایران میں ملکی مطابع اور ملکی شاعری نے کہانتک حصہ لیا، اس طرح دو مختلف النوع مگر متحد الغایت موضوع یعنی ایرانی صحافت اور ایران کی سیاسی اور وطنی شاعری، یعنی ادبی تحریک کے دو جُداگانہ رُخ دکھلائے گئے ہیں، یہ کتاب دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں ان اخبار و رسائل کی نفصیل ہے جو بالذات یا بالواسطہ ایران کی بیداری کا سبب ہوئے، یہ حصہ مرزا محمد علی خان "تربیت" کا مرتب کردہ ہے، جس کی براؤن نے ترجمے اور حواشی سے تکمیل و تزئین کی ہے، ان جرائد کی تعداد ۳۷۱ تک پہنچتی ہے،

دوسرا حصہ جدید شاعری کا مرقع ہے جو حریت اور وطنیت کی روح ہے جسے دیکھنے کے بعد یورپ کے متعلمینِ فارسی کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ ایرانی شاعری چار سو برس ہوئے دفعتہً دورِ آخر کے شعرائے طبقہ اولین، یعنی جامی اور اُن کے ہمعصر دولت شاہ

پر ختم ہوگئی، اور پھر اس نے کوئی کروٹ نہیں لی سچ یہ ہے کہ کسی نے تحقیق و مطالعہ کی تکلیف نہیں اٹھائی، ورنہ میکدوں کی اب بھی کمی نہیں، مے کہن ہے کہ نئے ساغروں میں پڑی چھلک رہی ہے،

براؤن کو افسوس ہے کہ سیاسی وجوہ سے یورپ اور ایشیا کے لٹریچر میں کبھی وہ اتحاد نہیں ہوگا جس کی ضرورت تھی، ورنہ "شرکت کی ہانڈی چوراہے میں" غریب ایران کی نسبت ہم یہ نہ سنتے کہ وہ فنا کے درجے طے کر رہا ہے، کیونکہ در اصل پچھلے ۸ برسوں میں اس نے کافی آثارِ زندگی کا ثبوت دیا ہے، اور اگر "دوستوں" کی نیک نیتی عملاً شریکِ حال نہ ہوتی اور وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو وثوق کے ساتھ یہ کہنا ممکن تھا کہ ملک کی اخلاقی اور مادی ترقی قطعی اور یقینی تھی، انکا خیال ہے کہ سچی انشا پردازی عصری جذبات و خیالات کا آئینہ ہوتی ہے، گذشتہ چند برسوں میں ایران کو بیم یاس و امید کے جن طبقاتِ مختلفہ سے ہو کر گذرنا پڑا ہے، اس کا عکس موجودہ لٹریچر میں دیکھ لیجئے، اور یہی وجہ ہے کہ خیالات کے دو زبردست آلہ ہائے محرک یعنی صحافت اور شاعری کے متعلق جہاں تک ممکن تھا، معلومات بہم پہنچائی گئیں،

پیام دوشم از پیرِ مے فروش آمد | بنوش بادہ کہ یک ملتی بہوش آمد
ہزار پردہ ز ایران دریدہ استبداد | ہزار شکر کہ "مشروطہ" پردہ پوش آمد

دورِ جدید کی شاعری پر شعرائے ایران اور ٹرکی کے خیالات کے اقتباسات نہایت دلچسپ ہیں، اس پر براؤن کی لطیف قلم کاریاں! بس یہ معلوم ہوتا ہو شراب

کچھ کھچا کر دو آتشہ ہوگئی ہے، یہ حصّہ بجائے خود مستقل عنوان چاہتا ہے، لیکن میں
یہاں جو کچھ لکھ رہا ہوں صرف اوروں کے ابھارنے کے لئے، مذاقِ صحیح ہو تو یہ کام
یورپ کے سہارے سے کرنے کے ہیں، مجھے اتنا موقع نہیں، دوسروں کو "کلامِ
غالب" پر دیباچہ لکھنے لکھانے سے فرصت نہیں، ایک صاحب "نقاد" سے
متقاضی ہیں کہ دیباچہ لکھواؤ! "یہ دیباچہ" کیا بلا ہے؟ آجتک میری سمجھ میں نہ آیا،
اگر "مقدمہ" سے غرض ہے تو سیدھے مولوی عبدالحق کے پاس حیدرآباد جائیے،
تنقید و تبصرہ منظور ہے تو مجھے مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ اس کا دَور ختم ہو چکا! غالب پر
رائے زنی کم سے کم ملتے جلتے اہلِ کمال کا حق ہے، جس میں مصنف سے زیادہ وسعت
نظر نہ ہو تو اتنا تو ہو کہ اس کی بات سمجھ لے، یعنی نکاتِ شاعری جو مقصودِ شاعر ہوں،
ان پر اس کی نظر حاوی ہو، یہ ایک جداگانہ بحث ہوگی کہ مقصودِ شاعر من حیث اللفظ
کہاں تک حاصل ہوا! یا اہلِ زبان اس کے لٹریچر کو کہاں تک تسلیم کر سکے؟ میرا خیال
ہے جو کچھ لکھنا تھا، یا لکھنے کے لائق تھا، پروفیسر آزاد لکھ چکے، کچھ کسر تھی وہ حالی کی
شاگردی نے لائقِ ادب اُستاد کی "یادگارِ غالب" میں پوری کر دی، اس لئے آجکل
کے جدت پسند شیدائیانِ کمال کو نیک نیتی سے صرف یہ صلاح دی جا سکتی ہے کہ
اُن ہی کتابوں کو استفادۃً پیشِ نظر رکھئے:۔

میں ایران کی سیاسی اور وطنی شاعری کا ذکر کر رہا تھا، درمیان میں یہ فقرہ معترضہ
آگیا، براؤن نے کثرت سے جدید شعراء کے کلام کے نمونے بہم پہنچائے ہیں، شاعروں
کی عکسی تصویریں بھی شامل کی ہیں، جا بجا ترجمہ اور حواشی سے رونق بڑھائی ہے،

اور کیمبرج کے خوبصورت، جدید الوضع نسخی ٹائپ کی جلوہ گری سے تو یہ حصہ بالکل مرصّع اور زرنگار ہو رہا ہے، نمونۃً ایک نظم کے چند اشعار لیجئے، مزید اقتباسات سے کتاب کا لطف کھونا نہیں چاہتا،

در پردۂ افتنار

نمی دانم چرا ویرانہ گشتی؟ وطن
مقامِ لشکرِ بیگانہ گشتی! وطن
تو شمعِ جمعِ ما بودی وطن جان چرا؟
بہ شمعِ دیگراں پروانہ گشتی! وطن
خوشا روزے کہ بودی شاد و خنداں وطن
شکستی خصم را چنگال و دنداں وطن
تو بودی سربلند افسوس افسوس وطن
در افتادی بہ حالِ مستمنداں وطن
وطن جان اے وطن جاں اے وطن جاں من
پرستارِ من و گہوارہ جنیاں من
ز جورِ دشمناں ویرانہ گشتی؟ وطن
بہ فرزنداں چرا بیگانہ گشتی؟ وطن

(پروانہ گشتی وطن۔ ویرانہ گشتی وطن)

مکرّر

یہ سادی نظم جس حد تک جذبات میں ڈوبی ہوئی ہے، میں اہلِ نظر کے مذاق پر چھوڑتا ہوں، کبھی کبھی افراطِ سادگی غایتِ نزاکت اور آرایش کا کام دیتی ہے، لیکن ہندوستان میں بیٹھ کر اس کا اندازہ ممکن نہیں، یہاں بیکار تغزّل کے سوا، (جس میں کوئی خاص جذبہ یا سلسلۂ خیال نہیں ہوتا) شائقینِ نظم (جنہیں میں شاعر کہنا نہیں چاہتا) کچھ اور جانتے ہی نہیں، اور یہ لٹریچر کی بڑی سے بڑی حق تلفی ہے، جو اس فرقہ کے ہاتھوں ہو رہی ہے، لیکن خوش ہوں کہ اس ادبی بے نظمی میں ایک فرمانروائے سخن یعنی "اکبر" اعظم موجود ہے، جو فطری شاعر ہے، اور جس کا کلام عصری جذبات و خیالات کا مرقع ہوتا ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ بے غایت نہیں ہوتا، آپ دفتر کے دفتر کہہ جائیے اور بدنصیبی سے میری سمجھ میں نہ آئے تو میرا قصور نہیں، کیونکہ میرا دعویٰ یہ ہے کہ سرے سے آپ کو کچھ کہنا ہی مقصود نہیں تھا،

کسی خاص ردیف و قافیہ کے ساتھ چند الفاظ جو اتفاق سے کھپ سکے، اس کی پیوندکاری سے دو مصرعوں کی تیاری اگر شاعری ہے تو میں بلاخوفِ تردید یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "این بجوئے مانمی ارزد" لیکن بجائے اسکے کہ آپ میرے سر ہوں میری خاطر سے مان لیجئے کہ وقت کا اقتضا کچھ اور ہے، محدود دائرہ سے باہر نکلئے، اور دیکھئے، اعلیٰ لٹریچر کے حقوق کیا چاہتے ہیں؟ ورنہ یاد رکھئے! نظم تو آپ کی جان کو

رو چکی، نثر کو ایک دن آپ روتے رہ جائیں گے، ہاں! مَیں یہ کہنا چاہتا تھا کہ "اکبر" کے خیالات دراصل شاعرانہ لٹریچر کے انتقادات عالیہ (یعنی ہائر کریٹی سزم) کا درجہ رکھتے ہیں، وہ جہاں شاعر ہیں ادیب بھی ہیں، اور ادیب بھی اس پایہ کے کہ معمولی صحبتوں میں جو فقرے ان کی زبان سے نکلتے ہیں، انشا پردازی کے جواہر ریزے ہوتے ہیں، اس قدرتی موزونیت کے ساتھ جب شوخی لٹریچر کی بلائیں لے رہی ہو، مَیں نہیں جانتا کہ اس شعر کے پتلے کی موزونیت کے لئے کیا باقی رہا؟ لیکن اکبر کا فضل وکمال ضمنی اظہار خیال نہیں چاہتا کبھی مستقلاً دیکھئے گا، بہرحال ملک کی عام وبائے بدمذاقی میں ایک شاعرانہ شخصیت ایسی ہے جس پر ہم ناز کر سکتے ہیں، اور جو اپنے مذاقِ خاص کے لحاظ سے نئے اور پرانے خیال والوں کی ملک مشترک ہے،

لیکن اس آفتابِ شاعری کے گرد ضرورت تھی کہ بہت سے ثوابت[1] اور سیارے حلقہ زن ہوتے، ثوابت کی تو ماشاءاللہ کمی نہیں، مدت سے ایک نقطہ پر ٹھہرے ہوئے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ سیارے کافی نہیں "اکبر" ہمیشہ ایک ہوگا، لیکن افسوس ہے اگر ہم متعدد "اقبال" پیدا نہ کر سکے،

مَیں سلسلے سے پھر الگ ہو گیا، لیکن منہ پر آئی ہوئی بات رُکتی نہیں، ایران کی شاعری کی داد لینا چاہتا تھا اپنی "شامتِ اعمال" یعنی یہاں کے بیکار مشغلہ نظم کا

---

[1] ثوابت حرکت نہیں کرتے، یہاں ان سے قدیم شاعری کے دلدادہ مراد ہیں، بہ خلاف اس کے سیارے چلتے پھرتے رہتے ہیں ان کو نئی شاعری کا نقیب سمجھئے،

رونا لے بیٹھا۔لیکن میرے لئے یہ کچھ ناگزیر سا ہے، آپ اسے خارج از موضوع نہ سمجھئے ورنہ دھوکے میں رہئے گا، براؤن کی تقریب کی علتِ غائی بھی اتنی ہی ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھئے دوسرے کیا کر رہے ہیں اور آپ کو کیا کرنا ہے؟ ورنہ ساری دردسری بے کار جائے گی!

ایران کے دورِ جدید کی شاعری کا ایک نمونہ آپ کے سامنے ہے، اب میں براؤن کے فارسی دیباچہ کے چند اجزا، کہیں کہیں سے دکھاؤنگا جس سے معلوم ہوگا کہ اُن کو زبان پر کس قدر قدرت ہے؟ ہندوستان میں بہت سے اہلِ کمال پیدا ہوئے جو فارسی نظم و نثر یعنی لٹریچر میں دادِ سخن دیتے رہے لیکن معلوم نہیں "بابو انگلش" کی طرح اُن کی فارسی اہلِ زبان کی نظروں میں کہانتک لائقِ تسلیم رہی؟ ہم اس زمانہ میں دیکھتے ہیں کہ بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ جس نے ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں لی ہوں وہ فقرے بھی انگریزوں کی طرح بول یا لکھ نہیں سکتا، یہ ایک تاریخی سوال ہے کہ ہندیوں کی گذشتہ فارسیت جس کا ایمان بالغیب کی طرح لوہا مانا جاتا ہے، اہلِ زبان یعنی ایرانیوں میں کہاں تک وقعت حاصل کر سکی، شبلی نے غالباً اس موضوع پر قلم آزمائی نہیں کی، ورنہ یہ بحث ہمیشہ کے لئے طے ہو جاتی، بہر حال ایران کی نئی زبان بالکل ایک جُداگانہ چیز ہے اور ہندوستان میں سنجیدہ خیال علماء کو رشک ہوگا کہ براؤن اتنی اچھی فارسی لکھ سکتے ہیں، فاضل پروفیسر کہتا ہے:-

مقصود اصلی از جمع و نشرِ ایں اشعار آنست کہ برائے بعضی از متتبعینِ ادبیات

ایران کہ اغلب منکرِ وجودِ روحِ ادبی در ایران کنونی بوده، وجودِ شعر و شاعری را
درین قرونِ اخیره در آں سرزمین معدوم می پندارند، ثابت نمائیم کہ آں طبعِ گہربار
ایرانی کہ اشعار آبدار قدیمہ بوجود آوردہ نمودہ است"

"ہنوز گویندگان ہستند اندر عراق کہ قوتِ ناطقہ مدد از ایشاں برد، کہ از
زیرآں ہمہ ابرہائے تاریک کہ صفحاتِ ایں مملکت را فرا گرفتہ باز آں روحِ فنا ناپذیر
مانند آفتابے کہ زیر ابر نہفتہ پس از چندے با یک پرتوِ عالم فروزِ دیگر جلوہ گر
گشتہ است"

"اغلب مستشرقین کہ زحمتِ تتبع در ادبیاتِ جدیدۂ ایران را بخود ندادہ اند چنیں
تصور می کنند کہ طوطی شکر گفتارِ شعراء و ادبائے اعصارِ گذشتہ ایران از نطق فرو ماندہ
و چندیں قرن است کہ دریں چمن خزاں دیدہ بلبلے بہ ترنم نیامدہ و شاید ہم بہیچ
نخواہد آمدہ، ولے ایں جانب کہ از سی و سہ سال بدیں طرف عمرِ خود را صرفِ تحصیل
ایں زبان کردہ بواسطہ کثرتِ معاشرت با آقایانِ ایرانی و اندازۂ با اشعار و ادبیاتِ
جدیدہ مربوط شدہ چاشنیِ آں را چشیدہ با ایں عقیدہ اشتراک ندارم و قبول دور از
انصاف و حقیقت می دانم و کسانے را کہ بحسب عدمِ اطلاع چنیں عقیدہ اظہار
می دارند معذور می دارم، و "عدمُ الوجدان لیس دلیلاً علیٰ عدمِ الوجود" را متذکرم

ذوقے است دریں بادہ کہ مستاں دانند

اینک نمونہ از ادبیاتِ وطنی و سیاسی را کہ آں ثمرۂ انقلابِ اخیرِ ایران باید شمرد
برائے اثباتِ عقیدۂ خود بنظرِ اربابِ تتبع می رسانم تا ہمچو مشکے کہ بخودی خود بوید آنچہ را

که من هنوز نگفته در دل دارم بزبانِ خود بگوید"

"این نمونهٔ ادبیاتِ جدید بخوبی ثابت می کند که روحِ شعر و طبعِ سخن پروری
در ایران معدوم نشده، سهل است که بواسطهٔ سوق این انقلاب اخیر رونقِ تازه
یافته و تاثیر بزرگی در آئینهٔ این ملت بظهور خواهد آورد، اگر درست دقت کنیم
خواهیم دید که این اشعار جدیده دارائے دو صفتِ ممتازه است که در ادبیاتِ
قدیمه موجود نبوده و بهمان نسبت شاید تاثیر آتش در طبقهٔ عامه بیشتر باشد"

اس دعویٰ کے بعد کہ ایرانیوں میں جذباتِ شاعری بدستور زندہ ہیں،
براؤن پرانی شاعری پر نئی شاعری کو جن وجوہ سے ترجیح دیتے ہیں، ان پر اچھی
طرح غور کیجئے،

"اولاً از حیث موضوع، موضوعِ اشعارِ قدما تقریباً عبارت بود از مدایحِ پادشاہاں
و بزرگاں و غزلیات و اخلاق و فلسفه و تصوف، و آنچه راجع باوضاع و احوال
معاشیه برشتهٔ نظم در آورده اند نسبتاً کم است، اگرچه همین ادبیات مدار افتخار ابدی ایران
بوده و زبان فارسی را تا امروز نگاه داشته است و لے از جهتِ تاثیر خارجی در
اوضاعِ اجتماعی مردم گویا چنداں ثمر نداده است زیرا که دائرهٔ انتشارِ آں محدود
و منحصر بطبقهٔ عالیه و عاملهٔ ملت بوده و فوائدش تعمیم نداشته است۔ تجارب تاریخی
و جریانِ اوضاعِ اجتماعی ملل درین قرونِ اخیره بخوبی نشان می دهد که مؤثر حقیقی
در گردانیدن چرخِ حیاتِ اجتماعی یک ملت، عامه یعنی طبقاتِ اواسط و ادانی آں
ملت است و چنانکه امواجے که روئے دریا را ابتلاطم آورده و بزرگترین کشتی ہا را

بازیچۂ طوفانِ خود می سازد، ہمانا امواجے است کہ از قعر دریا و طبقاتِ پائیں آں بالا می آید، ہمیں طور است در انقلابات سیاسی انقلابے کہ ثمرۂ خوب می دہد انقلابے است کہ در سایۂ جنبش طبقۂ عامۂ ملت بظہور رسیدہ والا انقلابے خواہد بود، فارس و تا ہنگام وسطحی کہ مانند امواجِ سطحی دریا ہرگز آں قوت را نخواہد داشت کہ بنائے استبداد و خرافات متراکمۂ چندیں قرن را از بیخ براندازد،

ازیں رو طبقۂ عامۂ ملت بیشتر از طبقاتِ دیگر باید منظور نظر ارباب سخن و واعظین و مخصوصاً شعراء و ادبا باشند و من چنیں تصور می کنم کہ در عالم ملتے نیست کہ بقدر ملتِ ایران مجذوبِ شعر باشد، و شعر در طبیعتِ ایرانی جاذبۂ مخصوص دارد کہ کمتر نظیر آں در سائر اقوام دیدہ شدہ است ازیں نقطۂ نظر شعرائے کہ اصلاح حال طبقۂ عامۂ ملت را در نظر دارند مرجح بر دیگراں می باشند و میانِ ایشاں و سائرین کہ جز مدح و اخذ صلۂ ہنری ندارند، ہماں فرق است کہ میانِ زاہد خود پرست و عالم دانش پرور، و ما می بینیم کہ ادبا و شعرائے عصر حاضرین بدیں نکتہ بردہ اند یعنی آبکار معانی را از اں دائرۂ محدود بیروں آوردہ و خوان الوان نظم را پیش خاص و عام گستردہ، طبقۂ عامہ را ازاں برخوردار کردہ اند، و اغلب موضوعات ایں ادبیات را از وقائع یومیہ و راجع بمسائل معاشی و اجتماعی گرفتہ اند کہ ہر یک از افرادِ ملت می تواند بدون صعوبت درک نماید، و اگر ہمیں اشعار را کہ از ابتدائے انقلاب ایران تا امروز انشاد شدہ جمع آوری کنند

تقریباً تاریخ منظوم انقلاب را تشکیل خواہد داد[1]"

"از فوائد کثیرۂ انقلاب سیاسی ہمیں بس کہ چنیں ادبیات فکری بوجود آوردہ است کہ در سایۂ آں یک خلق جدید و یک استقبال پر امید ظہور خواہد یافت"

دورِ جدید کی شاعری کی ترجیح میں براؤن یوں مزید گہر فشانی کرتے ہیں:-

"ثانیاً از حیث اسلوب نیز ایں ادبیاتِ جدید و یک تازگی و اہمیت خصوصی دارد و آں ایں است کہ در اغلب اشعارے کہ دریں دورِ جدید سرودہ اند، حقیقت را برائے اینکہ ہمہ کس نتواند فہم نماید در لباس ہزل و مزاح جلوہ دادہ اند و بایکے از پردہ ہائے حقیقی ہم آہنگ ساختہ اند تا بآسانی قبولِ عامہ بہم رساند"

"بدیہی است کہ شخص ہر قدر دارائے اخلاقِ حمیدہ و تہذیبِ نفس باشد باز وے را شنیدن عیوب خود بے پردہ چنداں خوش آیند نخواہد بود، و حقیقت گوئی در وے تاثیری چنداں نخواہد کرد، ولی در شکلِ ہزل و مزاح آں را بمیل و رغبت خواہد خواند والبتہ بے تاثیر ہم نخواہد ماند"

[1] ایں طرزِ ادا میں آپ "سہ نثر ظہوری" کے ٹھاٹھ نہ ڈھونڈھیے نہ انشائے مادھورام کا خاکہ تلاش کیجیے، آجکل کا معیارِ بلاغت یہ نہیں ہے کہ کثرتِ الفاظ میں سرے سے مفہوم غائب! بے معنی الفاظ کا انبار ہے کہ لگا ہوا ہے اور نفس مطلب کا پتہ نہیں، ایران کی خالص زبان کو فردوسی کی نظم اور سعدیؒ کی نثر میں دیکھیے، جس کا تتبع، سلیقہ غیر یعنی باہر والوں سے کبھی نہ ہو سکا،

آجکل کی فارسی مغربی زبانوں کی طرح شستہ، رُفتہ، تکلفات سے معرّا، اور ایک دم سے ادائے مطلب پر اس حد تک قادر ہے کہ ہم کو اس کے اندازہ کیلئے بھی ایک زمانہ چاہیے:

"شعرائے ایں دورہ کہ ایں اسلوبِ مرغوب را پیش گرفتہ اند، بمنزلۂ طبیب حاذق می باشند کہ مزاجِ مریض خود را بدست آوردہ و موافقِ آں ادویۂ تلخ را باشیرینی آمیختہ بہ مریض می خورانند و یا مانند واعظے کہ درجۂ ادراک مستمع را درک کردہ بقدرِ فہم او بہ سادگی تمام مقاصدِ خود را اداء می نماید و عامۂ ملت خواندہ و بحقیقت مسائلِ سیاسی و وطنی و معاشی واقف شوند، چنانکہ غزلیات و قصائدِ عارف و اشرف و ملک الشعراء بہار وغیرہ ہم در سایۂ ایں اسلوبِ مرغوب از فراری کہ می نویسند امروز در نزدِ خاص و عام مشہور است و در محافل میخوانند و بآلاتِ موسیقی می نوازند۔"

"ایں جانب بترتیبِ ایں نمونۂ مختصر از ادبیاتِ وطنی و سیاسی فارسی نظرِ دقت مستشرقین و متبعین ادبیاتِ فارسی را جلب نمودہ و ملتِ ایران را نیز از صمیمِ قلب تہنیت می گویم کہ چنیں نوعروسِ بکرِ معرفت بمنصۂ ظہور جلوہ آوردہ است، و از خداوند خواہانم کہ امثالِ ایشاں را بیفزاید۔"[۱]

مَیں اُمید کرتا ہوں، اقتباسِ بالا ناظرین کی گراں خاطری کا سبب نہ ہوگا، مسلمانوں

---

[۱] یاد رکھیے: فارسی میں یائے مجہول اور واوِ مجہول کی آواز نہیں ہے، برخی، چندی خیلی، تاثیری، ولی کو کسی موقع پہ ہو، برخے، خیلے، تاثیرے، ولے نہ پڑھیے،

اسی طرح نوش، پوش، افسوس کو بھی اس طرح ادا کیجیے، جیسے "جاسوس" کو۔

(جن حرفوں میں اضافت زیر ہو، ان کو یوں پڑھیے گویا آخر میں (ی) لگی ہوئی ہے، ورنہ ہمارا اِن کی رُوح کو صدمہ ہوگا، اور ناطقۂ ایران علیحدہ آپ کا شاکی ہوگا۔

کے جب دن اچھے تھے تو فارسی اُنکے گھر کی کنیز تھی، مُدت ہوئی پچھلی صحبتیں درہم برہم ہوگئیں، نہ وہ خیالات رہے، نہ اظہارِ خیال کے گذشتہ وسائل رہے، اب تو یہ حالت ہے کہ "روزمرہ" زبانِ غیر ہو رہا ہے،

"قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا"

لیکن جس فارسی کے براؤن دلدادہ ہیں، وہ اب بھی زندہ ہے اور وہ کمالِ شیفتگی سے اُسے زندہ ہی دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی شرافتِ نفس ہے جس کی وجہ سے میں اس زبردست مستشرق کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، ملک کے جرائدِ عصریہ میں بہت کم ایسے ہیں جو اس فاضل پروفیسر کو جانتے ہیں یا جاننا چاہتے ہیں، یہ غنیمت ہے کہ "نقاد" کے ذریعہ سے تقریب ہوگئی، کارنامے پھر دیکھئے گا، چند فقرے اور لیجئے! اور ان ہی پر خاتمہ ہے،

براؤن کا خیال ہے جس طرح یونانیوں نے یورپ میں نسلِ انسانی کے رُوحانی، دماغی اور صنعتی تمول میں اضافہ کیا ہے، اور وہ ہماری ہمدردی کا خاص حق رکھتے ہیں، یہی حال ایران کا ہے، تمام اقوامِ قدیم میں جن کے نام سے ہم آشنا ہیں ایران ہی ایک ملک ہے جو اَب بھی اپنی حدود میں ایک خود سر سیاسی وجود رکھتا ہے، گو اس کا رقبۂ حکومت دارائے اعظم کے باجگذار صوبوں کی لمبی چوڑی فہرست کے مقابلہ میں جو باختستان یا بلیستون پر کندہ ہے بہت کچھ گھٹ گیا ہے، تاہم اس میں ایک ایسی قوم آباد ہے جو ہر طرح کی آفات اُٹھانے کے بعد بھی اپنے اسلاف سے حیرت انگیز اشتراکِ خصائل و اوصاف رکھتی ہے،

ایران پر بار بار چڑھائی ہوئی، یونانی، مغل، ترک، تاتار، باری باری اٹھے، اور اُسے پامال کرتے رہے، جس سے عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوتی رہی، لیکن یہ ہمیشہ ان آزمائشوں سے بچ بچا کر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے جو خاص طرح کے خصائص کا مجموعہ ہو، اپنا وجود انفرادی قائم رکھ سکی، براؤن کہتے ہیں کہ انکو ایران کی سیاسی ہستی سے اتنی غرض نہیں جس قدر اس کے دماغی اثر پر اصرار ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ ایران نے جس قدر دنیا کے دماغی اور اخلاقی اُفق کی توسیع کی ہے اس کے اندازے کے لئے ہم کو تاریخ کے ہزار ہا صفحے الٹنے پڑیں گے، وہ مذہب زرتشت کے ذکر کے بعد جس سے مذاہبِ عالم میں ایک دلچسپ اضافہ ہوا، خود اسلام کی "خیال آفرینیوں" کی شاخہائے متعددہ کا نام گنواتے ہیں، صوفیہ، اسماعیلیہ، بابیہ، حروفیہ، یہ سب کی سب ایرانی جدت پسند دماغ کی مابعد الطبعی موشگافیاں ہیں، اسلام کے وسیع دور میں عربوں کی سیدھی سادی زندگی صرف عجمیوں کی بدولت آشنائے تمدن ہوئی، ایک لٹریچر ہی کو دیکھئے! اگر عجمیوں سے قطع نظر کرلی جائے تو عربوں کے پاس فخریہ قصائد کے بعد ایک ظریف کی رائے کے مطابق صرف اُونٹ کی مینگنیاں، اور ان کی تشبیہاتِ متنوعہ رہ جائیں گی!

عجمیوں کے طفیل میں ہم کو فردوسی، سعدی، اور حافظ اور پچھلے دنوں اینگلو سیکسن اقوام کو عمر خیام سے شاعر ملے جو دنیا کے شعرائے طبقۂ اعلیٰ میں شمار ہونے کے لائق ہیں، موجودہ سائنس ایران کا منت کش نہیں ہے لیکن "ابن سینا" کا نام

ہی اس بات کے یاد دلانے کے لئے کافی ہے کہ ازمنۂ متوسطہ کے یورپ اور ایشیاء کو فلسفہ اور طب کے لئے جو اس وقت تک دُنیا کو معلوم تھا، کہاںتک ایک فرزندِ ایران کا ممنونِ احسان ہونا پڑا،

آہ شبلی! ایرانی لٹریچر کے دورِ جدید کا ذکر ابھی ہو ہی رہا تھا کہ غیر متوقع صدمہ یہ پہنچا کہ علامہ شبلی نعمانی نے ترکِ رفاقت کی، آہ! یوں سمجھئے کہ اُردو لٹریچر کی ناک نہ رہی، رُوحِ تاریخ نکل گئی، اور علم مرگیا، مجھ پر معلّم شبلی کی رحلت کا اس قدر سخت اثر ہے کہ پڑھنے لکھنے کا مشغلہ باقی رہتا معلوم نہیں ہوتا، جسے میں لٹریچر سمجھتا تھا، یقین کیجئے مرحوم کے ساتھ دفن ہوگیا، اور میری ادبی لذتوں کا ہمیشہ کے لئے ایک دم سے خاتمہ، جی چاہتا ہے، مرثیۂ نثر لکھوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے قلم اپنی رفتار بھول گیا، گھنٹوں غائب رہتا ہوں، خیال عبارت آرائی تو غیر معمولی ترتیبِ الفاظ سے بھی عاری ہورہا ہے، ملک میں اب کوئی نہیں رہا جس کے نتائجِ فکر پر میں لٹریچر کا اطلاق کرسکوں جس کے بل بوتے پر جیتا تھا اور ایک دُنیا کو حرفِ غلط سمجھتا تھا وہ میرے ذوقِ ادب کو اپنے ساتھ پیوندِ خاک کرچکا! شبلی! ہائے شبلی کو کہاں سے اٹھالاؤں؟

یُوں تو تمام عمر شبلی کی یاد میں آنکھیں خشک نہیں ہونگی لیکن ہائے سب سے زیادہ غم یہ ہے کہ سیرۃ نبوی کی تکمیل اب قیامت تک ہوچکی! خدا جانے کس عالم میں مولانائے مرحوم نے یہ پیشین گوئی کی تھی جو آج حرف بحرف پوری ہوتی معلوم ہوتی ہے،

فرشتوں میں یہ چرچا تھا کہ حالِ سرورِ عالم — دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے

صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدوس سے آئی، — کہ یہ ہے اور ہی کچھ چیز، لکھتے تو ہمیں لکھتے

زندگی میں اس مردِ مسلمان کی یہ قدر کی گئی کہ اسے "کافر" بتایا گیا، جس پر شرافتِ علم دیکھئے! مولانا شررؔ کو کہنا پڑا "یہی کافر ہے مسلمان سچا"، آج کون ہے جو مرحوم کے خاتمہ بخیر ہونے سے انکار کی جرأت کر سکتا ہے، آخری شعر جو مرنے والے کی زبان سے نکلا تھا، جسے ضامنِ مغفرت سمجھئے!

اس ناظمِ منتظر کا یہ مسلک الختام تھا — صلّوا علی النبیؐ و صحابہ الکرام

فہرستِ تصنیفات و تالیفات

"ایڈورڈ براؤن پروفیسر عربی و فارسی یونیورسٹی کیمبرج"

۱	ایک سیاح کی سرگذشت، متعلق "فرقۂ بابیہ"	اصل فارسی میں ہے، معہ ترجمۂ انگریزی مقدمہ و حواشی ۲ جلد۔ ۵ شلنگ
۲	ایک سال ایرانیوں میں،	ایرانیوں کی زندگی، ان کے خیالات و عادات و خصائل کا مرقع، ایران میں ایک سال رہ کر یہ کتاب لکھی۔ ۲۱ شلنگ،
۳	تاریخِ جدید یعنی تاریخِ مرزا محمد علی باب،	معہ ترجمہ و حواشی وغیرہ۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس

نمبر	نام کتاب	کیفیت
۴	فہرست مسوداتِ عربی، (کتبخانہ یونیورسٹی کیمبرج)	۱۵ - شلنگ،
۵	فہرست مسوداتِ فارسی، (کتبخانہ یونیورسٹی کیمبرج)	۱۵ - شلنگ،
۶	ایران کی ادبی تاریخ،	نہایت معرکۃ الآرا تصنیف ہے، اسلامی لٹریچر کے متعلق اتنا بڑا سرمایہ کسی زبان میں یکجا نہیں ملیگا، نہ کسی نے مسلمانوں کی دماغی تاریخ اس طرح لکھی، سچ یہ ہے براؤن نے کچھ نہیں چھوڑا، کتاب کے نام میں ایران کی تخصیص غالباً عجمی عناصر کو اُبھار کر دکھانے کے لئے ہے، براؤن کو عربی الفاظ اور ناموں کی صحت کا اس قدر خیال ہے کہ ان کا طے کردہ نصاب یورپ میں رائج ہو گیا ہے، یہ ایک سخت مشکل تھی جو انگریزی کے حرکات یا حروف سے طے کر دی، اس کتاب میں ہر طرف اس کے قیمتی آثار ملیں گے، ہزاروں نام تھے جن کے

نمبر	کتاب	کیفیت
		صحیح اعراب کا پتہ کسی عربی لغات سے بھی نہیں چلتا تھا، غیر عربی دانی کے ساتھ بھی یہ حق حاصل تھا کہ مفہوم کے جاننے سے پہلے الفاظ کا صحیح تلفظ ممکن ہو، اب ہمارے لئے صرف اس کتاب کا انڈکس کافی ہے، ۲ جلدیں - ۲۵ شلنگ ،
۷	مختصر تاریخ طبرستان، (مصنفہ محمد بن حسن بن اسفندیار)	
۸	انقلاب ایران، ۱۹۱۰-۹ء	دونوں کتابیں "عروسِ جمیل و لباسِ حریر" مصنف کے عالمانہ خیالات کے ساتھ صنعت کا بہترین نمونہ ہیں، نہایت کثرت سے عکسی تصویریں ہیں، بعض کارٹون ہیں جن سے ایرانی زندگی کا کوئی دلچسپ رُخ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، میں صرف ایک کا ذکر کروں گا "قبل عہد الزفاف" (ہنی مون) آغا یعنی شوہر، نوعروس کی پیشوائی کیلئے
۹	ایرانی صحافت اور شاعری کا دورِ جدید ۱۹۱۴ء	

گھر سے باہر نکل آیا ہے اور سامنا ہوتے ہی کشیدہ قامتی، جھک کر رسم خیر مقدم ادا کرتی ہے "بعد عہد الزفاف" آغا صاحب کے ایک ہاتھ میں ڈنڈا ہے اور دوسرے ہاتھ میں "گلدستۂ احترام" کی کاکل عنبرین! جس دروازے سے آئی تھی اُسی طرف سے نکال رہے ہیں،

بعض قدیم کتبوں کے عکس ہیں جن کی اہمیت کے اندازے کے لئے براؤن کے سے تبحر علمی کی ضرورت ہے، جلد شوخ سرخ، حاشیۂ بالائی اور نام کے حروف مطلا، معہ طغرائے زرکار،

قیمت ۱۵ و ۱۲ شلنگ،

۲- ایران کا سلسلۂ تاریخی

جو براؤن نے اپنی اڈیٹری میں شائع کیا

۱	تاریخ الشعراء (دولت شاہ سمرقندی)	۷ شلنگ ۶ پنس

۲	لباب الالباب (مصنفہ محمد عوفی)	قدیم ترین تذکرہ شعرائے فارسی جو ۱۲۲۱ سال بعد مسیح مرتب ہوا تھا، ۲ جلد ۱۵ شلنگ
۳	تاریخ الاولیاء (شیخ فریدالدین عطار)	۲ جلد ۱۵ شلنگ ،

۳- فارسی کتابیں

جو گب میموریل کیلئے تنہا یا باعانت مرزا محمد قزوینی براؤن نے شائع کیں

۱	مرزبان نامہ (مصنفہ سعد الدین وراوینی)	کتاب القصص - ۸ شلنگ
۲	المعجم فی معاییر اشعار العجم	فارسی میں عروض کا ایک نایاب اور قدیم نسخہ جو شمس الدین محمد بن قیس الرازی نے لکھا تھا، ۸ شلنگ ،
۳	چہار مقالہ (مصنفہ نظامی العروضی سمرقندی)	معہ ترجمہ مقدمہ و حواشی، ۸ شلنگ ،
۴	تاریخ گزیدہ (مصنفہ حمداللہ مستوفی قزوینی)	۱۳۳۰ برس بعد مسیح کی تصنیف، مسودات اصلی کا عکس معہ ترجمہ و حواشی ۲۸ جلد ۲۸ شلنگ ،

۵	کتاب نقطۃ الکاف (مصنفہ حاجی مرزا جانی کاشانی)	فرقہ بابیہ کی قدیم تاریخ جو ۱۸۵۰ برس بعد لکھی گئی، ۵ شلنگ،
۶	تاریخ جہان کشا (مصنفہ علاء الدین عطا ملک جوینی)	۱۲۶۰ سال بعد مسیح کی تصنیف ہے، جلد اول شائع ہو چکی، دوسری پریس میں ہے، تیسری زیر ترتیب ہے، فی جلد ۵ شلنگ،

۴۔ مضامین

جو براؤن نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں وقتاً فوقتاً لکھے،

۱	ایران کا فرقہ بابیہ،
۲	بابی لٹریچر پر انتقاد،
۳	فہرست معہ تصریحات متعلق ۲۷ مسودات فرقہ بابیہ،
۴	ایک قدیم فارسی تفسیر القرآن کا تفصیلی بیان،
۵	ایران کی شکمی زبانوں پر انتقاد،
۶	یادداشت ذاتی متعلق واقعہ فرقہ بابیہ ۱۸۵۰ء بمقام زنجان،
۷	ایران کی گبری زبان کا نمونہ،
۸	فرقہ حروفیہ کے لٹریچر اور ان کے مسلمات پر اظہار خیال،
۹	ماخذ دولت شاہ،

کچھ اور روشنی عمر خیام پر،

چہار مقالہ،

نہایۃ الارب فی اخبار الفرس والعرب،

تذکرۂ شعرائے فارسی،

تاریخ اصفہان کے ایک نایاب نسخہ کا بیان،

تاریخ سلجوق کے ایک نایاب نسخہ کا بیان،

مضامین تاریخ جہان کشا پر انتقاد،

ناصر خسرو بحیثیت شاعر اور سیاح،

مسعود سعد سلمان مصنفہ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی،

مزید انتقاد لٹریچر فرقہ حروفیہ اور ان کا تعلق بکتاشی فرقہ درویشان سے،

جامع التواریخ مؤلفہ رشید الدین فضل اللہ کے نسخۂ کامل کی تحریک اشاعت،

۵۔ سیاسی رسائل

(متعلقہ ایران)

سرگذشت مختصر واقعات عصریۂ ایران،

ایرانی مصائب دسمبر ۱۹۱۱ء

سانحۂ تبریز معہ فوٹوگراف متعلق واقعات دسمبر ۱۹۱۱ء اور جنوری ۱۹۱۲ء،

۶۔ مضامین

جو یورپ کی پرشین سوسائٹی کیلئے لکھے اور شائع کئے گئے،

۱	ایران کا لٹریچر،	
۲	ایرانی مطبع اور ایرانی صحافت،	

۷۔ ترکی شاعری کی تاریخ

معرکہ کی تصنیف ہے، جو یورپ کے مصنفین کے لئے دلیل راہ بنی، مسٹر گب نے ۶ جلدوں میں لکھی تھی، ساتویں جلد جس میں دور جدید کے شعراء کا تذکرہ ہے، ڈاکٹر رضا توفیق نے بڑھائی، پروفیسر براؤن نے اس کی بعض جلدیں نظر ثانی کے بعد بڑی آب و تاب سے شائع کی ہیں، کچھ زیر ترتیب ہیں، متن معہ ترجمہ و حواشی، قیمت بہ لحاظ اختلاف، ضخامت ۲۱، اور ۱۲ شلنگ ۶ پنس،

نوٹ۔ براؤن کے نتائج فکر کی یہ غیر معمولی تفصیل "بھرتی" کی حیثیت سے نہیں ہے، بلکہ میری غایت یہ ہے کہ ملک کے اچھے لکھنے والوں کی جنبش قلم کے لئے کوئی ایسی داغ بیل ہاتھ آئے جو بلحاظ سنجیدگی فاضل پروفیسر کے دماغی آثار سے ملتی جلتی ہو،

میرا خیال ہے یہ تصریحات ایک کافی حد تک رہبری کریں گی،

ہمارے ہاں دو چار معزز مستثنیات کے سوا عموماً اہلِ قلم صحیح قوت فیصلہ نہیں رکھتے، یعنی اپنی استعداد کا مصرف صحیح نہیں جانتے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی پیداوار دماغی بلحاظ اوصاف و مقدار عموماً دوم درجہ کی ہوتی ہے، معلومات کی اتنی کمی نہیں جس قدر انضباطِ خیال اور قوتِ اجتہادی کی ضرورت ہے، اور یہ اسی کی پھٹکار ہے کہ ایک مصنّف اپنے مادۂ فطری سے وہ کام نہیں لے سکتا جو اس کی قابلیت کا اقتضائے طبعی ہے،

یہ تو مستقل مصنفین کی حالت ہے، صحافت یعنی مضمون نگاری اس سے بھی گئی گذری ہے، غیر ذمہ دار لٹریچر کی ایک مقدار کثیر ہے جو جرائدِ عصریہ کے ہاتھوں ملک میں تقسیم ہوتی رہتی ہے، اور چونکہ لکھنے والے کسی موضوع پر تیار نہیں ہوتے یعنی قلم اٹھانے سے پہلے پڑھتے نہیں ہیں، اس لئے انکے خیالات و مقالات کا زیادہ تر حصہ سطحی ہوتا ہے، نتیجہ معلوم ہے، اور اس کے سوا ہونا بھی کیا ہے؟ کہ جس پرچہ کو دیکھئے نذرِ بے قدری ہو رہا ہے! عوام کو دلچسپی نہیں، خواص اس لئے نہیں دیکھتے کہ اس میں کچھ ہوتا نہیں، بہر حال ضرورت ہے کہ ملک میں اعلیٰ تر لٹریچر کی طرف توجہ کی جائے، اور اس کی صورتیں یہی ہیں جو کبھی کبھی مختلف عنوانوں سے آپ کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں،

(نقاد ۔ ۱۹۱۴ء)

شررؔ، نازک خیال شررؔ نے بھولا ہوا افسانہ یاد دلایا اور دل سے ایک آہ نکل گئی،
قوم جبتک صحیح المذاق تھی، ہمارے جذبات و خیالات یعنی متعلقاتِ زندگی کے
جتنے لطیف صیغے ہوسکتے ہیں اُن کا مرکز یہی "بنتِ عم"[1] ہوتی تھی، عنفوانِ شباب کی

---

[1] ایک سال سے زیادہ ہوا حضرت شررؔ نے "نقاد" میں ایک لاجواب مضمون لکھا تھا جس میں عربی معشوقہ کی حیثیت سے "بنت عم" یاد کی گئی تھی، انگریزی میں "بنتِ عم" اور "ابن عم" دونوں کو "کزن" کہتے ہیں، اور یہ رشتہ اس قدر پیارا ہے کہ اکثر ایک کی ذات دوسری یا دوسرے کے لئے تمام دلچسپیوں کا جو خیال میں آسکتی ہیں مرکز خاص ہوتی ہے،

"بنتِ عم" کی تقریب سے خیال تھا کہ عیانِ ادب اور ہمارے شعرا اس عنوان کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے، لیکن آجتک کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی، اور تو خیر نیاز و دلگیرؔ نے دو مصرعے بھی موزوں نہ کئے،

ایک فرنچ مصنف نے حال میں ایک کتاب لکھی ہے جس کے موضوع کا ماحصل یہ ہے کہ اخلاق کی تکمیل کی پہلی شرط یہ ہے کہ سوسائٹی کا ہر فرد کثرت فوحش سے محفوظ رکھا جائے اور چونکہ ضایعات کی تلافی نہیں ہوسکتی، اس لئے مالیحیات کا تحفظ فرائضِ انسانی میں سرِ فہرست ہونا چاہیئے، اس کا خیال ہے کہ یہ مقصد صرف پاک جذبات سے حاصل ہوسکتا ہے، یعنی ہم شروع سے کسی ایک کو اس طرح چاہیں کہ وہی ہماری زندگی کا نصب العین ہو اور دُنیا کی تمام دلچسپیاں صرف اسی کے دم سے ہوں،

مصنف نے پہلے اخلاق کے شہوانی حصّہ کو لیا ہے، اور دکھایا ہے کہ ایک تندرست اور خوبصورت لڑکی اگر پاکباز ہو، ہمارے شہوت انگیز جذبات کی پوری روک تھام کرسکتی ہے، بشرطیکہ ہم اسے دل سے چاہیں،

خوش فعلیوں کے لئے خوبصورت کنیزوں کے آئینِ مقررہ (سسٹم) نے راستہ صاف کر رکھا تھا، آج بھی ٹرکی میں کوہ قاف کی پریاں، یعنی سرکیشیا کی خوروش دوشیزہ لڑکیاں "حرم" کے ناگزیر لوازم سے ہیں، جن کی تربیت مغربی اصول پر ہوتی ہے، اور فنونِ لطیفہ کی وہ شاخیں جو نسائیت کی جان ہیں، ایک ایک کر کے ان کو سکھائی جاتی ہیں،

شام کے لباسِ چست میں نیم برہنہ سینہ اور شانۂ عریاں کے ساتھ جب ایک زہرہ شب، عالمِ رقص میں برقی روشنی کی ضیا کو اپنے حسنِ شفاف کی تڑپ سے شکست دیتی ہو تو نوجوان آقا کے دل سے پوچھئے کہ "خیام" کی طرح "وعدۂ فردا" (یعنی بہشت) سے کہاں تک ایک دم سے قطعِ نظر کر لینے کو جی چاہتا ہے!

آج "یہ کنیز" جو اسلامی اخلاق کا ایک حکیمانہ عنصر تھی، ہمارے لغات العیش کا ایک متروک الاستعمال لفظ ہے لیکن "بنتِ عم" جو ہماری زندگی کی رفاقت اور تکمیل کے لئے کبھی ضروری تھی آج بھی ہے، زمانہ کی بدمذاقی دیکھئے، ہماری شاعری نے ایک اور "جنسِ مشترک" ایجاد کر رکھی ہے، یعنی سبزہ رخانِ ہند کو محرم کرتی کہکھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۰) اور وہ ہمارے عشق ازدواجی کا ایک ایسا تو قی تخیل ہو جس کے سوا ہم کو کسی اور کا خیال تک نہ آسکے، عشق اکتسابی سے عشق ازدواجی کہنا زیادہ صحیح ہوگا، فی نفسہ کتنا ہی مفید ہو لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کو یورپ کی طرح موقع کہاں حاصل ہے لیکن میں تو "خیالی بنتِ عم" سے کام چلاؤں گا، گو ڈرتا ہوں کہ "مارہرہ" اور "لکھنؤ" کی پن چکی سے کوئی آواز مخالف نہ آسکے،

چوٹی سے آراستہ کر کے ہونٹوں میں مسّی مل دی یا سانولے رنگ کی کھپت کے لئے
نمک کی گنجائش نکالی! عملاً کسی نے کچھ اور ترقی کی تو کرایہ کے ظرف یعنی ٹوٹے
پھوٹے ٹھیکروں پر آرہے، اور ساری زندگی اس جنسِ رائج الوقت یعنی شاہدانِ
بازاری میں سے کسی کے نذر کر دی، اس میں اچھے، بُرے، بڑے چھوٹے کی تخصیص
نہیں، مذاق عام ہے، اور چونکہ نیچر بے قاعدگی سے انحراف کرتی ہے، اس لئے
جدھر دیکھئے، قوائے فطری قبل از وقت جواب دے رہے ہیں، طبیبوں کی
گولیوں پر ہوس کا رہ گیا ہے، لیکن میں آپ کو حسنِ صبح کا ایک پاکیزہ اور بالکل
جداگانہ مرقع دکھانا چاہتا ہوں، سنیے! عذرا یعنی "بنتِ عم" کا عاشق کیا کہہ رہا ہے؟

(عالمِ خیال میں)

میرے جذبات ہمسایہ اور پڑوس کی لڑکیوں کی اٹھان کے ساتھ ساتھ بڑھے
ہیں، ایک ایک کو جانتا تھا اور سب کی خبر رکھتا تھا، ہر جوانی پر آئی ہوئی لڑکی یہ
معلوم ہوتا تھا میری نشاطِ ہستی میں کچھ نہ کچھ حصّہ رکھتی ہے لیکن دنیا دیکھنے کے
لئے ہے برتنے کے لئے نہیں، میری زندگی کا اصلی تخیل صرف میری "بنتِ عم" تھی،
ان دونوں لفظوں میں خدا جانے کیا جادو تھا کہ میں ان پر جان دیتا تھا، چھریرے
جسم کی گوری چٹّی، کشیدہ قامت لیکن وہ دُبلی لڑکی میری آنکھوں میں پھرا کرتی تھی،
میں سمجھتا تھا، بڑھتی ہوئی عمر کا دُبلا پا کیا؟ جوانی میں بھر کر اس کا حسن چودھویں کے چاند
کو نہ دبائے تو بات ہے؟ آخر وہ وقت آہی گیا، عذرا، ۱۹ سالہ عذرا شہر سے نہایت

تندرست ہے، اور جوانی تو پھٹی پڑتی ہے، اس کا مقیاس الشباب میرے جذبات عشق کا گویا "مجسمہ" ہے جس سے جوانانہ خوش فعلیاں میری بے لوث زندگی کا پاکیزہ مقصد ہونگی، مدتیں اسی انتظار میں کاٹی ہیں، اب تو ضبط نہیں ہوسکتا!

ایک فلسفی کا خیال ہے کہ حکومت کی تمام اقسام میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ اقتدار ہے جو ایک صحیح القویٰ نوجوان کو اپنی نازنین محبوبہ پر حاصل ہوتا ہے، عذرا پر شاہانہ فتوحات میرا اور صرف میرا حصہ ہوں گی، اسی کا تخیل تھا جس نے ۲۵ برس تک مجھے دنیا کی آلائشوں سے الگ تھلگ رکھا، ہاں پیاری "بنت عم"! میں تجھ سے شرمندہ نہیں ہوں، جس طرح تو "اچھوتی صحنک" اور میری اور صرف میری ہے، کیا ایک "جلیس غیر" کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے کہ وہ بھی تیرا اور صرف تیرا ہونے کی پوری قابلیت رکھتا ہے، یعنی اس کا جسم مس کردہ غیر نہیں ہے، یہ صرف تیرے پاک تخیل کا نتیجہ اضطراری تھا، مجھ پر ایسا وقت گذرا ہے کہ خواہشات نفس نے مسلسل مجھے بے چین رکھا ہے، لیکن موجبات ترغیب سے ہمیشہ بچتا رہا، سیر و شکار، ورزش جسمانی اور کتب بینی، بہتیرے مشغلے تھے جن سے الجھتا رہتا تھا، لیکن سخت سے سخت "تجرد گفتی" میں بھی مجھ کو صرف تیری ضرورت محسوس ہوتی تھی، دہکتے ہوئے شعلوں کو دبی چنگاریاں بنا کر رکھنا صرف اس لئے تھا کہ ایک دن جس طرح چاہتا ہوں تجھ پر قابو حاصل کرسکوں،

مجھے معلوم بھی ہے، صرف ایک قوت کے مغلوب کرنے کیلئے مجھے کتنی مخالفت،

قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا؟ آہ! اس کشمکش میں مر مر گیا ہوں، اس سے پاکبازی جتانی منظور نہیں، بلکہ یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دریا کو کوزہ میں بند رکھنا اور نفسِ سرکش پر قابو حاصل کرنا فوق الفطرت قوتِ انضباط چاہتا ہے، شکر ہے کہ تیری امانت بالکل محفوظ ہے، اور کبھی تصرف کی نوبت نہیں آئی، ہائے میرے عالمِ خیال کی فضائے بسیط جس کی ہوا بھی دنیا کو نہیں لگی، کس قدر پاکیزہ اور اچھوتی ہے، عذرا! کیا کوئی امر تیرے بیوی بننے میں مانع ہے؟ کیا تیرا ہاتھ کسی اور کو ......"

عالمِ خیال کا دوسرا مرقّع

سنجیدہ اور پاکباز عذرا، اپنے عاشق کے پاس کھڑی ہو گئی ہے لیکن نہیں جانتی کیوں آئی، چہرے کی افسردگی، پاک جذبات اور دھڑکتے ہوئے دل کی غمازی کر رہی ہے، ڈوپٹہ کا آنچل سر اور شانہ سے ہوتا ہوا، پوری آستین کے شلوکہ پر اس طرح پڑا ہے کہ "رازِ سربستہ" کی کہیں سے پردہ دری نہ ہو، محوِ شوق نگاہ کے لئے آرایش کا کچھ اہتمام نہیں، یہاں تک کہ بالوں پر بھی کافی توجہ نہیں کی گئی، تاہم ہر لئے چھپائے جسم کی خوش ترکیبی کچھ کہہ رہی ہے، ہائے وہ قیمتی ساعتِ زندگی! اتنا وقت کہاں تھا کہ ترسی ہوئی آنکھیں تصویرِ خموشی کا جائزہ لے سکتیں، وہ دونوں بُت بنے ہوئے تھے دفعتہً ایک نے بلائیں لیں، اور دوسری عشقِ ناکام کا ایک نیا سبق اور ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی جدا ہو گئی!

عالمِ خیال کا تیسرا مُرقّع

عذرا تصویر شباب بنی ہوئی ہے، لانبے بال جن میں اچھی طرح کنگھی کیگئی ہے عاشق کی پھانس کیلئے چھوڑ دیئے گئے ہیں اچھے ہوئے لباس نے دیا نے پر بھی جوبن کی سرکشی پردہ پردہ میں دکھائی ہے، آنچل سامنے کچھ اس طرح ڈالا گیا ہے کہ انداز کہہ رہا ہے پردہ داری مقصود نہیں، بلکہ گول اور بھرے بھرے برہنہ شانے اور جوانی کے "فتنۂ طناز" یعنی حسن بے پردہ" کا بانکپن دکھانا منظور ہے، سینہ کا حصۂ افقی بالکل کھلا ہوا ہے، اور اودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی کھینچ تان بتا رہی ہے "سرکشی" لباس کی ممنون نہیں، بلکہ لباس خود سانچہ میں ڈھل گیا ہے، نہایت باریک ریشم کی ساری آجکل کے مروجہ فیشن زیب سایہ زیب پا کر رہی ہے، نرم اور لچکدار جسم کے ساتھ قلمکار ساق بلوریں سات پردوں میں بھی پاکباز شوہر کے تارِ نظر کا مرکز بنی ہوئی ہے،

پھر اپا سے جوش افزا کہہ رہا ہے . . . کہ "بنت عم اپنے پیارے شوہر سے ہم آغوش ہو چکی ہے، آنکھوں میں شبِ آرزو کا خمارِ مستی ہے، اور چہرے کی شگفتگی بتا رہی ہے جو دونوں کا مقصد تھا، وہ پورا ہو کر رہا، ہاے وہ پاک اور اچھوتا تعلق جس میں ہر قسم کی آزادیاں حسن عمل قرار پائیں،

شوہر کے بے باکانہ اور جوشیلے جذبات نے عذرا کی فضائے لذت میں ایک آگ سی لگا دی، اور وہ سمجھی نئی زندگی کی خوشیوں میں سب سے زیادہ کس صیغہ پر زور رہیگا، اور دل ہی دل میں اس خیال سے خوش تھی!

(نقاد ستمبر ۱۹۱۳ء)

نظام الملک طوسی

ملک میں غیر ذمہ دار لٹریچر کی اس قدر افراط ہے کہ ہجوم عام میں خاص لٹریچر بھی غائب ہو جاتا ہے، اس لاجواب کتاب کی اشاعت میں جس قدر دیر ہوئی اس سے زیادہ ادبی گروہ کی طرف سے اس کی تقریب میں تاخیر ہو رہی ہے، کسی نے ایک آدھ کے سوا تنقید تو خیر چند سطریں بھی نہ لکھیں، ظلم ہوگا اگر "نقاد" باوصف ادعائے ادبیت خاموش رہے،

علامہ شبلی نے (ابھی "مرحوم" لکھنے کو جی نہیں چاہتا) "ائل ہیروز آف اسلام" سے اس سلسلہ کی بنیاد ڈالی، اور "خلافت" باستحقاق اپنے ادبی کارناموں کیلئے محفوظ رکھی لیکن مولوی عبد الرزاق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاک میں تھے، یہ دفعۃً منظرِ عام پر آئے ابھی نگاہیں اٹھنے بھی نہ پائی تھیں کہ یہ "وزارت" پر قابض ہو چکے تھے، اور انصاف یہ ہے کہ یہ اپنا درجہ قائم رکھ سکے "البرامکہ" کے بعد جو اُن کا نقشِ اول ہے ان کی نظرِ انتخاب نظام الملک پر پڑی جو عہدِ سلجوقیہ کا نائب السلطنت اور مدبرِ اعظم ہے، یہ انتخاب بجائے خود اس امر کی ضمانت ہے، کہ مؤلف صحیح مذاقِ تصنیف رکھتا ہے اور استحقاق سے پہلے اس نے اپنا کام شروع نہیں کیا،

آجکل جمہوریت کا عنصر اس قدر غالب ہے کہ کسی زبردست شخصیت کی داستان کی طرف

اس وقت تک توجہ کرنا نہیں چاہتے جب تک مستقلاً اس تمدن کا خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہ آجائے اور اسباب و نتائج کی تفریعاتِ فلسفیانہ سے یہ نہ دکھایا جائے کہ کسی گذشتہ قوم کے حالاتِ عصریہ موجودہ دور کی خلاقی میں کس حد تک بالذات یا موثر بوسائط ہیں، مثلاً عہدِ عباسیہ یا سلجوقیہ کو لیجئے، دیکھنا یہ ہے کہ ہم کو ان سے کیا ملا؟ یہ اتفاقی زنجیر کی وہ کڑیاں ہیں جن کا تسلسل ہم کو ان اکتشافات سے قریب تر کر دیگا جن پر ہماری آیندہ تقدیرات کا انحصار ہے اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ اب صرف "افسانۂ یارانِ کہن" نہیں رہی بلکہ اس نے ایک مستقل فن یعنی فلسفہ کی صورت اختیار کر لی ہے اور کیا تعجب ہے ایک وقت آئے کہ جس طرح "حال" ماضی کا نتیجۂ اضطراری ہوتا ہے، "مستقبل" کو ہم خود پیدا کرنے لگیں، یہ ایک نازک اور دقیق بحث ہے جسے میں یہاں پھیلانا نہیں چاہتا، مقصود صرف یہ تھا کہ اصنافِ لٹریچر میں فلسفۂ تاریخ جس قدر اہم ہے اس سے زیادہ اسکی تالیف کی ذمہ داریاں سخت ہیں، خاصکر جب اسکی تدوین آجکل کے ترقی یافتہ اور مغربی ضوابطِ تنقید کے ساتھ ہو۔

موجودہ زمانہ میں تاریخ پر قلم آزمائی کا معیارِ قابلیت یہ ہے کہ موادِ گذشتہ کو تصرفات کے بعد ایک خاص حسنِ ترتیب سے اس طرح جلوہ گر کیجئے کہ عہدِ متعلقہ کا ایک صحیح مرقع پیشِ نظر ہو جائے یعنی قانونِ شہادت کی اصطلاح میں جہاں "واقعاتِ موثرہ" کی تفصیل چھوٹنے نہ پائے، حشو و زوائد یعنی "امورِ غیر موثرہ" سے بالکل غرض نہ ہو، غور کیجئے کہ یہ نزاکت تالیف کیا چاہتی ہے؟ صرف ایک خاص طرح کا مادۂ اختراعی نہیں، بلکہ صدیوں کے الجھے ہوئے روابط علت و معلول کی عقدہ کشائی، اور یہ کس قدر مشکل ہے، ایک تراشیدہ ہیرا جب کسی صنف نازک کی زینت بڑھا رہا ہو کس قدر خوش ضیا اور نفیس چیز ہے؟ لیکن پتھروں کے خودرو

انبار سے ریزہ چینی آسان نہیں! اسی طرح تاریخ کے ہزارہا اوراق کی الٹ پھیر کے بعد جستہ جستہ مقامات سے واقعات کا پتہ لگانا جس سے قدیم لٹریچر کا ہیولیٰ ایک مستقل تذکرہ کی صورت پیدا کرلے مؤلف کی قوتِ آخذہ کے ساتھ اس کی جامعیت اور کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے،

اس تمہید کے بعد نظام الملک طوسی کو پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن مضامین کی غیر ضروری تفصیل سے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ فہرستِ ترتیبی (انڈکس) دیکھئے جو دیباچہ اوصاف ہے، جس طرح ایک نازنین کا چہرہ مہرہ اور باریک آنچل کی شکنوں کا ناقابلِ بیان رکھ رکھاؤ دیکھتے ہی اس کے اعضائے متناسبہ کی خوش ترکیبی سمجھ میں آجاتی ہے، یہی حال انڈکس کا ہے کہ گوشوارہ پر یک نظر سب کچھ دیکھ لیجئے، اوراقِ مابعد کی اچھائی برائی راز نہیں رہتی، لیکن ناظرین کو ایک چسپ تو دکھلانی ہوگی، اس لئے تصریحات کی جگہ صرف اشاروں سے کام لوں گا،

مؤلف نے کتاب کے ۲ حصے کئے ہیں، حصۂ اوّل میں طوس کی مختصر تاریخ، خواجہ کی ولادت اور ابتدائی حالات، تعلیم و تربیت، طالب علمانہ سفر، وزارت کا آغاز، خانگی زندگی، عام اخلاق و عادات، فضل و کمال، تصنیفات، علمار اور مشاہیرِ وقت کی قدردانیاں، صوفیانہ اور ادبی صحبتیں، تدریجی عروج اور اس کی تکمیل کے ساتھ دفعۃً سامانِ قتل! جس سے دنیا کی بے وفائی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، غرض لگے لپٹے واقعات جس قدر تھے، ایک ایک کرکے دکھلائے گئے ہیں جن سے خواجہ کی زندگی کے تمام مظاہر نگاہ کے سامنے آجاتے ہیں، اور جن کی بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظام الملک وزارتِ اسلام

میں کسی سے "دوم درجہ" پر نہیں ہے،

دوسرا حصہ نہایت مہتم بالشان اور مرعوب کن ہے، اور یہیں سے ہمارے لائق مؤلف "مولوی" نہیں رہتے، عہدِ سلجوق کی سیاسیات پر جس قدر مواد یکجا کیا گیا ہے میرا خیال ہے کسی زبان میں اتنا سرمایہ یکجا نہیں ملیگا، یہ بات کسی یورپ کی زبان میں ہوتی تو بڑے بڑے پروفیسر حوصلہ افزا تنقیدیں لکھتے لیکن ہندوستان میں یہ دستور نہیں، اور شاید کبھی ہوگا بھی نہیں، اسی سلسلہ میں مؤلف نے دکھایا ہے کہ دولتِ سلجوقیہ کے قیام و عروج کا باعث خواجہ تھا، اس کے وسیع کارنامے بتاتے ہیں کہ جس قدر ترقیاں اس عہد میں ہوئیں ان کے لحاظ سے یہ سلطنت کا دستِ راست اور قوتِ عامل تھا، سب سے زیادہ قابلِ قدر خواجہ کا "سیاست نامہ" اور "کتاب الوصایا" یعنی دستور الوزراء کا مجموعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا نظام عصریہ خلافت اور وزارت کے لئے کس قسم کے "فردِ عمل" (پالیسی) کو جائز رکھتا تھا،

یورپ میں اس قسم کی چیزیں تلاش کر کے پیدا کی جاتی ہیں اور نوٹ و حواشی کے ساتھ بڑی آب و تاب سے ان کی اشاعت ہوتی ہے، مؤلف نے اگر اسے کتاب میں شامل نہ کیا ہوتا تو ایک قابلِ افسوس کمی رہ جاتی، آپ دیکھیں گے نظام الملک کس قدر صحیح سیاسی دماغ رکھتا تھا، اور ان الجھاؤ کے سلجھانے پر کس حد تک قادر تھا جن پر کسی سلطنت کی بقا یا فنا منحصر ہوتی ہے،

سیاسیات کے بعد خواجہ کے علمی ذوق کے تحت میں ہم علوم و فنون کی اشاعت صیغۂ تعلیم کی اولیات اور اس وقت کے مذاق ادب کے ساتھ علماء اور شیوخ کا مفصل تذکرہ

پاتے ہیں، مؤلف نے کچھ نہیں چھوڑا، ادب عصریہ میں امیر معزی اور لامعی کا کلام فارسی لٹریچر کے شایقین کی ضیافت طبع کیلئے دیکھنے کے لائق ہے، اسی طرح "نظامیہ بغداد" پر عربی زبان میں بھی کوئی مستقل مضمون نہیں لیکن مؤلف نے جس شرح و بسط سے تصریحات کی ہیں، واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے، ایک خاص جدت یہ ہے کہ نہایت کثرت سے اضافی تصریحات (یعنی فٹ نوٹ) سے متن کی تزیین کی گئی ہے جس سے لائق قدر تالیف کے موضوع اصلی میں بہت کچھ وسعت پیدا ہوگئی ہے اور وہ صرف ایک "تذکرہ" (یعنی لائف) نہیں بلکہ عہد سلجوق کا ایک ایسا جامع لٹریچر ہے جس پر میرا خیال ہے کوئی معتدبہ اضافہ نہ ہو سکے گا،

خواجہ صوفیانہ اور شاعرانہ رنگ میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں، ان کی مجالس میں شیخ ابو اسحٰق فیروزی، امام الحرمین جوینی، ابو القاسم قشیری، ابو علی فارمدی ایسے بلند پایہ اصحاب جہاں رونق بزم ہیں، ایک حلقہ مشاہیر شعرا کا بھی ہے جس میں امیر معزی معین الدین طنطرانی، سید شریف نظام الدین اور قاضی شمس الدین بالتخصیص لائق ذکر ہیں، خواجہ کی جامعیت دیکھیے، ایک طرف صوفیانہ دائرہ ہے جس میں بڑے بڑے جبہ و دستار کا وزن گران "سنجیدگی" کی وقعت افزائی کر رہا ہے، دوسری طرف رند مشرب شعرائے عصر ہیں اور "شراب ادب" یعنی شاعری کا دور چل رہا ہے،

مؤلف نے خواجہ کے گاڑھے دوستوں، یعنی حسن صباح بانی فرقہ اسماعیلیہ اور عمر خیام کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے، حسن صباح کو پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" میں وضاحت کے ساتھ جگہ دی ہے، اور ضرورت تھی کہ

فاضل مستشرق سے موازنہ خیالات کیا جاتا لیکن آجکل کی آب و ہوا ایک ایسے فلسفہ سیاسی پر جو خطرناک حد تک عملی ہورائے زنی کے لئے چنداں موزوں نہیں شعلوں کی بھڑک سے دبی چنگاریاں باکیف ہوتی ہیں،

خیام پر مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے اردو لٹریچر پر پہلا احسان ہے جو اس حیثیت سے کیا گیا، اتنا مفصل ریویو جس میں خیام کی شاعری کے ساتھ اس کے تمام حکیمانہ کمالات آگئے ہیں، غالباً ایشیائی لٹریچر اس سے خالی ہے، یورپ نے خیام کی شاعری پر جس حد تک توجہ کی ہے، مؤلف نے اس پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے، اور صرف یہ حصہ اس قدر دلچسپ ہے کہ کتاب میں اگر کچھ اور نہ ہوتا تو یہی کافی تھا،

ضمیمہ میں ملک شاہ کا تذکرہ ہے جس سے عہد سلجوق پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کا پھر موقع مل جاتا ہے، مؤلف نے جہانتک ممکن تھا اس کتاب کی تکمیل کیلئے نہایت مستند ماخذوں سے فائدہ اُٹھایا ہے اور یہ انکی غیر معمولی خوش نصیبی ہو کہ ملکی لٹریچر میں اپنی دوسری تالیف سے ایک لائق رشک اور قیمتی اضافہ کرسکے، یہ چند سطریں کتاب کی تجدید تقریب یعنی محض یاد دہانی کی حیثیت سے ہیں، تنقید بھی ایک عالمانہ تالیف کی فرصت ولیاقت چاہتی ہے، جو قابل تراصحاب کے لئے زیادہ تر موزوں ہو،

کتاب سات سو صفحوں پر قابض ہے اور آیوری کاغذ پر نہایت خوشخط چھپی ہے، جیسے حضرت رعد کے دست ضعیف کا آخری کارنامہ سمجھئے، تصویریں، نقشے دیکھنے کی چیزیں ہیں، اور لوح کی صنعت کاری تو بالکل ناقابل بیان ہے، جلد ولایتی، پشت پر سنہرے حروف میں نام، غرض مؤلف نے جو ابھی میری طرح جوان رہنا

چاہتے ہیں حسنِ سیرت کے ساتھ اچھی صورت کے اہتمام میں پوری قوت صرف کر دی ہے، یہ لائبریری ایڈیشن اس لائق ہے کہ جو حضرات پڑھنے کے شائق نہیں ہیں وہ بھی آرایشاً اپنے پاس رکھیں،

یہاں تک تو اوصاف کا ذکر تھا، نظرِ بد سے بچانے کیلئے کوئی ایسی بات پیدا کرنا چاہتا ہوں جس سے تصویر کا دوسرا رُخ بھی سامنے آجائے لیکن غور کرنے پر بھی کوئی بات نہیں ملتی، سوا اس کے کہ سیاست نامہ اور کتاب الوصایا ضمیمہ میں منتقل کیجائیں، مقصود یوں بھی حاصل رہیگا، اور نکتہ چین یہ نہیں کہہ سکیگا کہ حجم بڑھایا گیا ہے، اسی طرح دونوں حصّوں کے مضامینِ مشترک کی تقسیم پر نظرِ ثانی حسنِ ترتیب کو بڑھائے گی، یہ سب طبعِ ثانی میں (اگر نوبت آئے) ممکن ہے، لیکن میری ایک شکایت کا میرے لائق دوست کے پاس غالباً کوئی علاج نہیں، یعنی بوڑھے "وزیر" کی سرگذشت میں کسی "عباسہ" کا پتہ نہیں چلتا جس سے فی الجملہ مجھے مایوسی ہوئی،

(نقاد ۱۹۱۴ء)

اُردو لٹریچر کا نفسِ واپسیں

اگر اُردو لٹریچر کی ارتقائی تاریخ جہانتک نثر سے تعلق ہے کبھی لکھی گئی تو جو مرقع دفعۃً آنکھوں کے سامنے آئیگا وہ طبقۂ اوّل کے لکھنے والے ہونگے جن کو میں نے "عناصر خمسہ" کی حیثیت سے کہیں دکھایا ہے، اور جو سر سید کے زمانہ سے پیدا ہوئے، آزاد کی زبردست شخصیّت گو ایک حد تک سر سیّد کی تبلیغ سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ کیا کم ہے کہ ہمعصری کی عزّت ان کو بھی حاصل تھی، اور مذاقِ سخن کے لحاظ سے وہ ادھر جھک پڑے جو سر سید کے لٹریچر کا خاصۂ امتیازی تھا، نذیر احمد جس حد تک مستغنی رہ سکے ان کے خیالات و مقالات کا بہت بڑا حصّہ خود اس فیصلہ کیلئے کافی ہے، رہے حالی و شبلی، کچھ شک نہیں کہ یہ تمامتر سر سید کے پیدا کردہ ہیں،

میں اس وقت طبقۂ ثانی کے اہلِ قلم سے قطعِ نظر کئے لیتا ہوں جو میرے دائرۂ تحریر کے موضوع سے الگ ہیں ورنہ اُردو لٹریچر جبتک باقی ہے، ریاض، احمد علی، شوق، شرر اور سرشار ہمیشہ محبّت آمیز عزّت کے ساتھ یاد کئے جائیں گے، موجودہ لٹریچر کی خلاقی میں یہ داہنے ہاتھ نہ سہی بائیں ہاتھ کی حیثیت قطعاً رکھتے ہیں آج ریاض اور شوق کی لطافتِ نثر گذشتہ تاریخ کا ایک بھولا ہوا سبق ہے لیکن کل کی بات ہے جب یہ دونوں اپنے وقت کے بہترین پرچوں میں دادِ سخن دے رہے تھے، آیندہ دنیا انکو

زیادہ سے زیادہ مٹی ہوئی شاعری کی حیثیت سے جانے گی لیکن سچ یہ ہے کہ نظم کے ساتھ
یہ نثر کے بھی "آقا" تھے، دونوں جوان تھے، جوبنوں پر آئی ہوئی زبان گویا پری بنی ہوئی
تھی "صحافت" رہ رہ کر جنبشِ قلم کی بلائیں لیتی تھی، عورت کیسی ہی نازک ہو لیکن جھڑوں
کی دھیمی آوازیں جو کیفیت ہے اونچی ایڑی کے بوٹ کی کھٹ کھٹ میں نہیں،
آجکل کی کھڑی اُردو کے مقابلہ میں ان کی زبان میں ایک خاص لچک اور نزاکت تھی،
شستہ، رفتہ محاورات کی برجستگی اور موقع موقع سے روزمرہ کی پیوندکاریاں کس طرح
دکھاؤں، دل کی بیچینی سطحِ کاغذ پر پھیلتی جاتی ہے لیکن حق ادا نہیں ہوتا، مختصر یہ کہ
جس طرح دل نہیں رہے، دلوں کے اکسانے کا سامان نہیں رہا، زمانہ کی ترقی کے
یہ معنی ہیں کہ بعض اجزا ساتھ ہی ساتھ اس طرح مٹتے گئے کہ بجھے ہوئے چراغوں کی طرح
کہیں پڑے ہیں لیکن جو آنکھیں برقی خیرہ گری کی عادی ہو رہی ہیں انہیں فرصتِ ذوق
کہاں کہ ایک نگاہ ادھر بھی ڈالیں، شررؔ و سرشارؔ کی نسبت کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ یہ اپنی
بقا کے آپ ضامن ہیں، یعنی ایسی لائقِ رشک ہستیاں رکھتے ہیں جو مرنے کے بعد
بھی فنا ہونے والی نہیں،

میں پھر سلسلہ سے علیحدہ جا پڑا، ہاں تو یہ کہنا تھا کہ طبقۂ اوّل کی پاک روحوں نے
جو سرمایہ ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ کتنا ہی لائقِ ادب ہو لیکن سوال یہ ہے ان کے مرتبہ
کے لحاظ سے اس کی کیا حالت ہے، یعنی ہر مصنف نے اپنی تصنیفات میں کہاں تک
اپنا درجہ قائم رکھا؟

یادش بخیر شبلی کے سوا مجھے خوف ہے، سب کم و بیش وہ نہیں کر سکے جو اُن کی

قابلیت کا بہترین مصرف تھا، پروفیسر آزاد کی فارسیت، اہلِ زبان سے دبتی ہوئی نہیں تھی لیکن وہ اپنی نہایت قیمتی تالیف یعنی "جامع اللغات" کی تکمیل نہ کر سکے جو اُن کی ساری عمر کی کمائی تھی، اسی طرح "تذکرۂ شعرائے فارسی" بھی جو خاص ان کے مذاق کی چیز تھی، مسودہ سے آگے نہ بڑھ سکا،

مولانا نذیر احمد کو اپنی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ "قاموس الاسلام" (انسائیکلوپیڈیا) کے لکھنے کا خیال نہ آیا، وہ اس پیمانہ کو گھٹا کر کم سے کم "لغاتِ اسلام" لکھ سکتے تھے، اور یہ پھر بھی ایسی چیز ہوتی کہ یورپ اپنی فلسفیانہ تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان کے آگے نہیں جا سکتا تھا، آیندہ نسلوں کے لئے یہ قیمتی وراثت موصوف کی باقی رہنے والی یادگاروں میں سب سے زیادہ پیش پیش ہوتی،

حالی، خوش صفات حالی سے ہم کو چنداں شکایت نہیں، "مسدس" کے بعد مقدمہ دیوان" اور "حیاتِ جاوید" کے سوا اگر یہ کچھ نہ لکھتے تو ان کی بقا کے لئے اس سے زیادہ ضرورت نہ تھی، گو اس کا افسوس ہے کہ ان کی صحت اور عمر نے اتنا موقع نہ دیا کہ ان کی وسیع المشربی اور فلسفیانہ نکتہ سنجیاں ان کے نتائجِ افکار کی تعداد میں کچھ اور اضافہ کریں جس کی اس لئے زیادہ ضرورت تھی کہ ان کے بعد ان کے رنگ میں کوئی قلم اٹھانے والا معلوم نہیں ہوتا،

خاتم المصنفین شبلی نے ہمارے لئے کم و بیش ۵ ہزار صفحوں کا ذخیرۂ ادب چھوڑا ہے، یہ لٹریچر کی وہ قیمتی صنف ہے جسے آجکل اصطلاح میں "تنقیداتِ عالیہ" (ہائیر کریٹی سزم) کہتے ہیں، آپ لوہے کے چنے کھئے اور پھر خیال سے اسلام کے متعلقات میں اتنا

بڑا سرمایہ اور وہ بھی اس قدر گرانمایہ کسی زبان میں موجود نہیں ہے، شبلی میں ایک خاص طرح کا مادۂ اختراعی تھا،

وہ ایک ہی وقت میں اعلیٰ درجہ کے مؤرخ، اعلیٰ درجہ کے ناثر، اعلیٰ درجہ کے شاعر غرض مشرقی زبانوں میں مختلف اصنافِ سخن کے پورے مالک تھے، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپ کے مستشرقین کی طرح ان کا معیارِ تصنیف اتنا بلند تھا کہ میرا خیال ہے، سیکڑوں برس بعد بھی ان کی تصنیفات ٹکسال باہر نہیں ہوں گی، ایسا جامع حیثیات مصنف غالباً اب پیدا نہیں ہوگا، ان کے تفصیلی کارنامے انشاءاللہ "دارالمصنفین" دکھائے گا لیکن مرحوم نے سب کچھ کیا، آنحضرت صلعم کی تالیف کی تکمیل نہ کر سکے جس کا داغ ہمارے ساتھ وہ بھی لیتے گئے، اسی طرح مسلمانوں کی عام تاریخ نہ لکھی جس کی سخت ضرورت تھی، نہ "شعر العجم" کی طرح عربی لٹریچر کی تاریخ لکھنے کی نوبت آئی، اور سلسلے بھی ناتمام رہے، جن کی تکمیل اب قیامت تک ہو چکی،

بات یہ ہے کہ جب ہمارے ہاں محرکات میں اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ "ہر فعل خود اپنی مکافات ہے" تو ان اساتذہ سے جو کچھ ہمیں ہاتھ آیا وہ بھی ہمارے استحقاق سے کہیں زیادہ تھا،

علی گڑھ ایک تاریخی قوم کی مرکزیت کا مدعی ہے لیکن لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی قوم نے کوئی دائرۃ التالیف قائم نہیں کیا، نہ ان عناصر کو جن کے نام بار بار گنتا رہتا ہوں وہ کبھی تصنیف و تالیف کیلئے یکجا کر سکا، اردو لٹریچر کا اطلاق صحیح معنوں میں صرف ان ہی حکمائے ادب کی دماغی پیداوار ہو سکتا ہے، اگر آپکو اس سے

اتفاق نہ ہو تو اسے اپنی قاصر النظری اور قوم کی "شامتِ اعمال" پر محمول کیجئے، جس کو
اتنا بھی احساس نہیں کہ تصنیفی دَور آخری تاجدارِ سخن یعنی شبلی کے ساتھ ہمیشہ کیلئے
پیوندِ خاک ہوگیا،

سب تو سب حیدرآباد سی شایستہ ریاست کو یہ خیال نہ آیا کہ سید علی، آزاد، نذیر احمد
اور حالی و شبلی کو جن میں آزاد کے سوا سب اس کے خوانِ نعمت کے خوشہ چین تھے،
صرف تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دیا جائے، یہ لوگ معقول وظیفوں پر
ایک جگہ رکھے جاتے اور یہ طے کیا جاتا کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے
کون کون کام ترتیباً زیادہ اہم ہیں اور اُن پر عالمانہ کتابیں لکھوائی جاتیں، سید علی سا
ہمہ دان جہاں موجود ہو، وہاں "اکبری نورتن" کی طرح "پنجتنِ آصفی" کا عالم وجود میں نہ آنا،
ایک ایسی بدنصیبی ہے جس کی تلافی اب کبھی نہیں ہوسکتی "سلسلۂ آصفیہ" اگر برائے نام نہ ہوتا
اور فرمانروائے وقت کو کچھ بھی دلچسپی ہوتی تو دنیا دیکھ لیتی کہ "عہدِ عباسیہ" جہانتک ادبی
فتوحات کا تعلق ہے نئے سر سے واپس آگیا ہے لیکن گذری ہوئی بات کا رونا کیا،
میں پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ملک کا تصنیفی دَور ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، بیشک کتابیں
آئندہ بھی لکھی جائیں گی لیکن میری غرض ردّیات سے نہیں، اعلیٰ لٹریچر سے ہے جس کی
فصل ایک دم سے ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی،

ثبوت لیجئے! علی گڑھ کالج ۴۰ سالہ جدوجہد کے بعد ایک مصنف بھی اس وقت
تک پیدا نہ کرسکا، آپ جانتے ہیں یہ کس بات کی پھٹکار ہے؟ نری انگریزی دانی سے
خواہ وہ کسی پایہ کی ہو مشرقی طبائع میں مادہ نہیں ہوتا، لڑکوں کو یہ موقع نہیں ملتا، کہ

وہ انگریزی سے پہلے یا ساتھ ساتھ عربی فارسی کی تحصیل کرسکیں جس پر انکی مادری زبان
کی ترقی کا انحصار ہے، زبانِ عربی میں کتنی ہی دستگاہ ہو لیکن اس طرح لکھنا پڑھنا مشکل
ہے کہ اہلِ زبان کو اس میں لطف آئے، نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی ٹکسالی ہونے سے رہی،
اُردو میں یہ اظہارِ خیال کرنا نہیں چاہتے، یا صاف کیوں نہ کہوں انکو آتی ہی نہیں اور
چونکہ اُردو لٹریچر سے بیگانگی کو یہ اپنا شرفِ امتیازی سمجھتے ہیں اس لیئے ان کے ہاتھوں
ابھی مدتوں ہم کو اُردو ادب میں کسی اضافہ کی امید نہیں کرنی چاہیئے، اگر یہ صحیح ہے کہ کوئی
قوم دنیا میں اپنے مجموعۂ خصائص سے علیحدہ ہو کر ترقی نہیں کرسکتی تو صرف یہی نہیں کہ
آجکل کے نوجوانوں کیلئے مادری زبان کا رونا ہے بلکہ ایک وسیع حد تک ان کے
مستقبل کی طرف سے بھی مایوسی ہے،

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ جو بساط ابھی دیکھتے دیکھتے اٹھ گئی یعنی لٹریچر کے جو حقیقی
مالک تھے وہ قریب قریب سب ایسے تھے جنہیں مشرقی تعلیم نے پیدا کیا تھا، اور جن کو
"مغربیت" کچھ یونہی سی چھو گئی تھی لیکن انکی قوتِ اجتہادی کا مظہر وہ معرکۃ الآرا سرمایۂ
ادب ہے جو ورثہ میں وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں، بہرحال نوجوان طبقہ کی بیگانہ وشی
بہت ہی لائقِ افسوس ہے لیکن دنیا میں کوئی کلیہ نہیں جس میں استثنار نہ ہو، میں
دیکھتا ہوں اس طبقہ میں ایک شخص ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اوروں کی ناک رکھ لیگا، میری
غرض لائق عبد الماجد سے ہے جو انگریزی کی تکمیل کے ساتھ اُردو لٹریچر کا نہایت صحیح
مذاق رکھتے ہیں، اور آج ان کے قلم کے سایہ میں دو فلسفیانہ کتابیں ایسی موجود ہیں،
جن پر ادبِ اُردو ناز کرسکتا ہے، چونکہ شروع ہی سے پیمانہ تصنیف اونچا اختیار کیا

گیا ہے اس لئے آیندہ ہم کو ان سے بہت سے توقعات ہیں، میں ابھی زیادہ کھلنا نہیں چاہتا کیونکہ ان کو نظر بد کے اثر سے بچانا ہے،

شبلی کا مطمح نظر ایسی ہی تعلیم تھی جس میں انگریزی کے ساتھ مشرقی زبانوں کی بھی تکمیل ہو اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ "دار المصنفین" جو چند نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے، مرحوم کے خیالات کی تصویر مرئی ہے جس قابلیت کے ساتھ مولوی سلیمان ندوی ایک مختصر علمی جماعت سے کام لے رہے ہیں اور جس پیمانہ پر وہ تالیف و تصنیف کے صیغہ کو وسعت دینا چاہتے ہیں، میرے دعویٰ کے ثبوت میں ہے کہ نری انگریزی دانی کسی درجہ کی ہو قوم و ملک کے لیے جہاں تک دماغی مشاغل کا تعلق ہے ایک بیکار سی چیز ہے "معارف" کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ رفقائے "دار المصنفین" کیا کرنا چاہتے ہیں اور خیر الاخلاف ہونے کی ان میں کہاں تک اہلیت ہے، میرا خیال ہے تصنیفی افق جو ایک دم سے تاریک ہو گیا تھا، دفعۃً امید افزا ہو چلا ہے، اور اگر موجودہ رفتار بھی قائم رہ سکی تو اس علمی جماعت کی متفقہ کوشش سے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا جسکی نہایت سخت ضرورت ہے،

انجمن ترقی اردو سے چنداں امید نہیں، لائق سکریٹری ہر سال چند بے غایت رسائل کی اشاعت کو فرض کفایہ سمجھتے ہیں، لیکن اس قسم کی بے اصول اور خود رو اشاعت سے زبان کی ترقی نہیں ہوتی، میں نہیں جانتا اس وقت تک کوئی لائق ذکر کام کیا گیا ہے جس سے کسی حد تک زبان کا دائرہ وسیع ہوا ہو، میں "فلسفہ تعلیم" کے بعد "فلسفہ حیات" اور "فلسفہ اجتماع" کی اہمیت سے ناواقف نہیں ہوں لیکن ان کو چھوڑیے محض طالبعلمانہ

رسائل جن کا آئے دن اعلان ہوتا رہتا ہے، اور جن میں اظہارِ خیال کی حیثیت سے مجتہدانہ روح نہ ہو کس کام کے ہیں، انجمن کو سرے سے یہی نہیں معلوم یا وہ جاننا ہی نہیں چاہتی، کسی زبان کی ترقی کے عناصر ترکیبی کیا ہوتے ہیں، یہ بات حیدرآباد یا لکھنؤ میں چند افراد کی خود رائی سے طے نہیں ہوسکتی، یورپ کے کسی مستشرق سے پوچھیے جو دنیا کے مختلف لٹریچر کے نظاماتِ طبعی پر غائر نظر رکھتا ہو تو وہ بتائیگا، دراصل آپ کے کرنے کے کام یہ ہیں:-

(۱) جامع اللغاتِ اُردو،

(۲) محاورات،

(۳) لغات الاصطلاحات،

(۴) لغاتِ فارسی، جہانتک اُردو کی تکمیل کا تعلق ہے،

(۵) لغاتِ عربی، بہ ترتیبِ جدید،

(۶) ادب العالیہ، (اُردو) ۱۲ ضخیم جلدوں میں،

(۷) جامع القواعد (اُردو)

(۸) عقلیات (یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب)

(۹) اُردو انسائیکلو پیڈیا،

ارتقائے زبان کی قدرتی ترتیب یہ ہے کہ اس میں صالح لٹریچر کا کافی سرمایہ موجود ہو، حسنِ اتفاق سے ہمارے پاس ایسا ذخیرہ موجود ہے کہ ہم دنیا کی اور کلاسیکس (ادب القدما) کے مقابلہ میں اسے بے تکلف پیش کرسکتے ہیں۔ اس کے بعد اُردو لغات کی تدوین و ترتیب ہے، جس کی اہمیت اس قدر طے شدہ ہے کہ جبتک آپ اُسے ختم

نہ کرلیں کسی دوسرے موضوع پر ادھوری طبع آزمائی نیک نیتی کے ساتھ بھی دھوکا دینے سے پہلے دھوکا کھانا ہے، اُردو لغات کے سلسلہ میں "فرہنگ آصفیہ" کو یاد نہ کیجئے، جو حشو و زوائد سے بھری ہوئی ہے جیسے کاغذی کاسہ گدائی سمجھئے جس کی تدوین آج تک ختم نہ ہوئی، اور جس کے اجزاء ہزاروں روپیہ ضائع کرنے کے بعد بھی یک طرحی اور ہم رنگی نہ پیدا کر سکے، بہرحال سب سے پہلے آپکو لغت تیار کرنا ہے، اور ایک ہی سانس میں روزمرہ اور محاورات کو یکجا کرنا ہے، جن سے زبان کی آرایش ہی نہیں ہوتی بلکہ اسکی نزاکتیں زبان کے حسن اور اسکی کیفیت کو بڑھاتی چڑھاتی رہتی ہیں، آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اُردو اپنے ذخیرۂ محاورات کے لحاظ سے نسبتاً دوسری زبانوں سے دوم درجہ پر نہیں ہے، اس نے دنیا کی اور کلاسیکس یعنی زندہ اور مستند زبانوں سے جو کچھ لیا، اس کے سوا ذاتی سرمایہ بھی اتنا رکھتی ہے کہ مانگے تانگے کی ضرورت نہیں، لیکن سرمایہ کا بہت بڑا حصہ جو امانت دار تھے ان کے ساتھ ضائع ہو چکا ہے، بچے کھچے، بکھرے ہوئے موتی دلی، لکھنؤ میں کچھ اب بھی مل جائینگے، ان کو سمیٹئے اور گلے کا ہار بنائیے،

جذباتِ عشق نے دنیا میں ہمیشہ مشقِ سخن کی ہے، اور نازک سے نازک پیرایۂ اظہارِ خیال پیدا کئے ہیں، آج کسی کو فرصت و لیاقت ہو تو مشرق کو مغرب سے ٹکرا کر ایسی آگ پیدا کی جا سکتی ہے جو دلوں کو جلائے گی نہیں صرف گرمائے گی، لیکن جن کو گھر کی خبر نہیں وہ غیروں کی نکتہ آرائیوں سے کہاں تک لطف اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، سرسری طور پر دو مصرعے لیجئے جو جذبات میں ڈوبی ہوئی اس سے کہہ رہی ہے جس کے دل کی مالک ہے،

کر چکے تم تو دشت پیمائی　　　مجھ سے گھر بیٹھے خاک چھنوائی

اور دنیا کی کسی زبان میں یہ بات دکھا دیجئے جو ان نہایت سلیس لیکن فصیح مصرعوں میں ادا کی گئی ہے، یہی وہ خصوصیت ہے جس سے آپ کی اردو بڑی بڑی آبرو دار زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے، ہزاروں محاورات ہیں جو دلی اور لکھنؤ والوں کے روز مرہ میں داخل ہیں اور جن پر جان دینے کو جی چاہتا ہے، محاورات تو پھر بھی ایک چیز ہیں لیکن اس کے توابعِ مہمل بھی اتنے دلکش ہیں کہ یہ کہیں اور نہ دیکھئے گا، بیشک اردو فنا ہونے والی نہیں، اور وہ اس وقت تک زندہ رہے گی کہ بیویاں تو خیر گھر کی ایک ماما بھی چمک کر "نوج" کہنے والی موجود ہے، لیکن میری غرض یہ ہے کہ ایسی خوبصورت، ایسی خوش سیرت، ایسی لطیف و نکتہ خیز زبان اگر آپ کے ہاتھوں اپنی عزتِ نفس کو قائم نہ رکھ سکی تو اس کا ہونا گویا نہ ہونا ہے،

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ "لغاتِ اردو" کے بعد اصطلاحات کا درجہ ہے، یہ پہلی شق سے کم نہیں ہے، مغربی لٹریچر کو اگر آپ اردو قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو اس کیلئے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مصر سے ذخیرۂ الفاظ منگوائیے، میری غرض علوم و فنون سے زیادہ کمالِ انشا پردازی سے ہے، ہم اچھے سے اچھے خیال کو اردو میں اسلئے نہیں لے سکتے کہ الفاظ نہیں ملتے اسلئے دل کا ارمان پورا نہیں ہوتا، یعنی ہم ایک خاص طرح کے گونگے ہیں کہ سننے اور سمجھنے کے بعد بھی کسی خیال کو اپنی زبان میں ادا نہیں کر سکتے سکریٹری صاحب انجمن اردو نے اپنی ایک رپورٹ میں علم ہیئت کے مصطلحات کے جمع کرنے کی بشارت دی تھی لیکن ممدوح کو یاد نہیں رہا کہ "کارِ زنان" کی تکمیل سے

پہلے "با آسمان پرداختن" ایک غیر طبعی بلند پروازی ہے، جس سے بجائے اس کے کہ لٹریچر کے مختلف زاویوں کی توسیع ہو اسکی حق تلفی ہوتی ہے، اور یہی غیر منطقی ترتیب ہے جس سے آجتک صرف اتلافِ قوت ہوتا رہا، اور کوئی کام کی بات نہ ہوئی،

قوم میں لکھے پڑھے (صحیح معنوں میں) تھوڑے ہیں، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو صحیح قوتِ فیصلہ رکھتے ہیں، یا جن کے دماغ میں لٹریچر کے نازک مسائل کے جذب کرنے کی صلاحیت ہے، لیکن تعجب یہ ہے کہ نہایت موٹی باتیں بھی ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں جو ایک مخلوقِ بے غایت یعنی ۶ کروڑ "حشرات الارض" کی ادبیات کے نقیب بننا چاہتے ہیں، یقین کیجئے ان دماغوں کی ساخت دنیا کی طبعی معلومات میں اضافہ کریگی جن کو ترکِ "فرائض" کا احساس نہیں لیکن "نوافل" پر اصرار ہے آپ کہتے ہیں "البیرونی" اور "مقدمات الطبیعات" پڑھو، جن میں ایک حرف مجتہدانہ نہیں، مجھے نہایت ادب سے یہ عرض کرنا ہے کہ ان کے پڑھنے کے بعد بھی میں اتنا ہی کورا رہا جتنا استفادہ سے پہلے تھا، در دسری بیکار گئی، جس کا افسوس ہے،

میں یہ لکھ رہا ہوں اور عنقریب علی گڈھ میں دوم درجہ کی نالیفات کی دوسری کھیپ یا اس کا اعلانِ با سبق حسن کارگذاری کا دفتر بڑھا رہا ہوگا، لیکن سوال یہ ہے کہ لٹریچر صرف سادے کاغذ پر سیاہی پھیلانے سے کہانتک حقیقی فوائد حاصل کر سکتا ہے؟

وقت کا فیصلہ تو کچھ اور ہے، وہ صاف کہہ رہا ہے،

"این بجوئے نمی آرزد"

بہر حال مصطلحاتِ اردو اس قدر ضروری ہیں کہ ان کے ہوتے کسی اور کام کو شروع

کرنے کی ضرورت نہیں، لغاتِ جدیدہ جس میں ایک فاضل مؤلف نے ۴۴ ہزار الفاظ جمع کر دیئے ہیں آنکھ رکھکر نہ دیکھنے والوں کی چشم نمائی کیلئے کافی ہیں، کم سے کم اس کے پانچسو صفحے تو ہوں، خیالات کا سلسلہ ہے کہ ختم نہیں ہوتا، اور مجھے ابھی کچھ اور کہنا ہے کسی زبان کے ابتدائی نشو و ارتقائے تدریجی کیلئے جس قسم کے وسائل ترتیبی کی ضرورت ہے ایک یوروپین مستشرق کے خیال کے مطابق جستہ جستہ عرض کر چکا ہوں، اور یہ وہ منطقی ترتیب ہے کہ اگر واقعی اردو لٹریچر کو زندہ رکھنا ہے تو ایک منٹ کے لئے بھی اس سے قطع نظر نہیں ہوسکتی، مگر مشکل یہ ہے کہ کرنے والے کہاں سے آئیں گے، جو لوگ کر سکتے تھے وہ آج منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں، علی گڈھ کی مقتدر جماعت نصف صدی کی مشق و مہارت کے بعد بھی اس لائق نہیں کہ زبان کے مسئلہ پر اس حیثیت سے غور کرے کہ بقائے قوم کیلئے (اگر اسکی ضرورت ہے) سب سے زیادہ قومی عنصر یہی ہے، کانفرنس اس قسم کی تضییع اوقات پسند نہیں کرتی، وہ ایک عملی چیز ہے، سرسید کے وقت میں ایک آدھ لکچر ایسے ہوجاتے تھے جن پر انشا پردازی کچھ دنوں اتراتی رہتی تھی، اب فرطِ سنجیدگی نے یہ سلسلہ بھی باقی نہیں رکھا،

قوم میں بحیثیت مجموعی جہانتک نفسِ لٹریچر کا تعلق ہے کوئی روحِ اجتماعی نہیں، امرا کو صرف اسی کا شوق نہیں، ملک میں کبھی کبھی خارجی اسباب سے عارضی تحریک پیدا ہوجاتی ہے لیکن وہ باسی کڑھی کا ایک اُبال ہوتا ہے کہ آیا اور گیا، لٹریچر کا مذاقِ صحیح نہ پہلے تھا نہ اب ہے، یہ وہ راز ہے جس کی بے نقابی لٹریچر کے ساتھ مٹنے والی قوم کے مستقبل کو صدیوں پہلے دفعۃً ہمارے پیش نظر کر دیتی ہے، جس طبقہ سے بڑی امیدیں

تھیں وہ "بالغ العلوم" ہونے کے بعد بھی اپنی زبان سے ناآشنا سا رہتا ہے جسکی خوش بیانی اور لطافت کا اُسے بالکل احساس نہیں،

عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن چاہنے والا اسکی خوش ادائی کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے، تو آرزوؤں سے بھرے دل پر کیا گذرے گی، ایسا سہاگ کس کام کا جو جیتے جی ہوگی سے بھی گیا گذرا ہو، غرض اُردو کی طرف سے یہ بے التفاتی ایک قومی مسئلہ ہے جس پر ملک کے شائقینِ ترقی کو اپنی سب سے پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیئے،

میں پھر اعادہ کرتا ہوں کہ تصنیفات کا دور ختم ہو چکا لیکن جو کتابیں پڑھنے کے لائق ہیں ان کو بھی لوگ نہیں پڑھتے، اس سے زیادہ خراب حالت صحافت کی ہے، جو رائج الوقت لٹریچر کو وقتِ عام کرنا چاہتی ہے، اخبار اور رسالے عالم وجود میں آنے کے بعد ایک مدت خاص تک آپ ہی آپ چلتے ہیں یعنی شائع کرنے والوں کی وضعداری انکو جاری رکھتی ہے، لیکن آخر کب تک، بہار سے پہلے اُنکے حصہ میں خزاں آتی ہے اور یہ اُنکی عنایت ہوتی ہے جنکی دماغی تفریح کے یہ جرائد ذمہ دار ہوتے ہیں، خریداروں میں مشکل سے دو چار کو آپ زر بکف پائینگے، ورنہ حصہ غالب ادائے قیمت کو ایک طرح کی شکست سمجھتا ہے،

تجارتی لٹریچر سے قطع نظر کیجئے، اچھے اچھے اخبار اور رسالے صرف چار دن کی چاندنی ہیں کہ آئی اور گئی، بہتیرے بند ہوگئے، کچھ سسک سسک کر چل رہے ہیں، ایک آخری ہچکی کے ساتھ یہ بھی رخصت، یہ مادیت کا دور ہے، ہر چیز اپنی قیمت چاہتی ہے، نرے توکل سے کام نہیں چلتا جسے آجکل فاقہ کا مترادف سمجھئے، ہمارے ہاں جس طرح پڑھنے کا دستور نہیں ادائے قیمت بھی شائستہ زندگی کا کوئی اصول نہیں، اس لئے ماننا پڑتا ہے امید نہیں کہ

صحافت ہماری زندگی کی رونق بڑھائے، اور جب سے سو دو وقت کی روٹیوں ہی کے لالے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا ایک فاقہ مست طبقہ خون جگر سے کہاں تک ہمارے ادبی مذاق کی شادابی کو قائم رکھ سکتا ہے،

بہرحال اُردو کانفرنس ہو یا انجمن ترقی، اسٹیج کی خوش بیانی سے زیادہ ضرورت اسکی ہے کہ ہم اس امر پر غور کریں کہ موجودہ نسل کو کس طرح اُردو دان بنایا جائے جس کی حالت اس بگڑی ہوئی عورت کی سی ہے جو شوہر کے ہوتے "بوئے غیر" کی شائق ہو، اور وہ کونسے وسائل ہیں جن سے طبائع عام کی بے التفاتی میں ترغیب و تشویق کی رُوح پیدا ہو سکتی ہے،

یہ مسئلہ فی نفسہٖ اس قدر مہتم بالشان ہے کہ اسے صرف اُردو لٹریچر نہیں بلکہ قوم کا عنوانِ زندگی سمجھئے، اگر اسے آپ سلجھا سکے یعنی قوم کے وجدان و مذاق میں جہانتک زبان کا تعلق ہے کوئی مستقل تغیر پیدا ہو سکا تو میرا خیال ہے فضائے تاریک بتدریج صاف ہوتی جائیگی، اور جن تالیفات کی ضرورت دکھائی گئی ہے، ان کی ترتیب ہم کو اپنے مقاصد کی تکمیل سے قریب تر کردے گی، دنیا میں کوئی قوم دکھا دیجئے جس نے اپنی مادری زبان سے علیحدہ ہو کر ترقی کی ہو، آج یہ طے شدہ ہے کہ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی، جبتک اتحاد مذہب کے ساتھ اس میں اتحادِ خیال اور اتحادِ زبان نہ ہو، مذہبی اتحاد کو تیرہ سو برس کافی نہ ہوئے، اسی طرح امید نہیں کوئی قومی تخیل قوم کی مشترک خواہشات کا مرکز عام ہو، لیکن زبان کی یہ حالت نہیں، مدت کی منہ لگی اور اختیاری ہے، فلسفہ کا یہ مسئلہ کہ مستقبل ہمیشہ ماضی اور حال کا نتیجہ اضطراری ہوتا ہے، قریب قریب سائنس یعنی یقینیات کی حد تک پہنچ گیا ہے، جو دور ابھی ختم ہوا ہے وہ لٹریچر کا "عہدِ زریں" تھا، آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ

کسی طرح عہدِ موجودہ کو سنبھال لیجئے تو حصولِ کامیابی چنداں دُور نہیں،

لیکن جس پیمانہ پر آپ آجتک چلتے رہے اس کی خود روی منزلِ بے غایت کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کے چکر، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے آپ کو مقصود سے ہمیشہ دور رکھیں گے، اب بھی وقت ہے کہ پچھلی حماقتوں کی تلافی کیجئے اور سوچ سمجھ کر طے کر لیجئے کہ جہانتک اُردو لٹریچر کی ترقی و تجیز، بقا کا تعلق ہے در اصل ہم کو کیا کیا کرنا ہے، میں پھر آپکے ہاتھ میں سَو سَوا سَو صفحوں کا ایک نامکمل رسالہ دیکھ رہا ہوں جسکو آپ دل ہی دل میں اُردو کی لائقِ رشک فتوحات میں سمجھ رہے ہیں، مگر یہ میری چڑھ ہے، آپ کی خود رائی سمجھو خود تعلیم یافتہ دماغ کی ایک اُپج سہی، لیکن مجھ کو اگر آپ کی مجتہدانہ قابلیت میں شک ہو تو آپ معاف ہوں، میں نہیں مانتا کہ آپ کی نظر ان نکات پر حاوی ہے جو کسی زبان کی قدرتی ترقی کے عناصر موثرہ یعنی ایسے اجزائے ترکیبی ہیں جن پر قواماً اور براہِ راست زبان کا بننا بگڑنا منحصر ہے اس لئے بلا خوف تردید پھر کہنا چاہتا ہوں، کہ جبتک اُردو کے پاس ایک ضخیم جامع اللغات اور محاورات و اصطلاحات کا پورا دفتر نہ ہو، آپکی ناقص اور ابتدائی کوششیں "نادان دوست" کے اخلاص سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، آپ شاہراہ سے کترا کر تنگ گلیوں اور ناہموار راستوں سے قطعِ منازل چاہتے ہیں اور یہ جہاں تک کمالاتِ علمی کا تعلق ہے ایک غیر حکیمانہ روش ہے، لٹریچر کا آخری نوٹس یہ ہے جسے یاد رکھئے کہ

"عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی"

(نقاد ۱۹۱۳ء)

ارتقائے ادبِ اردو

بخدمت جناب اڈیٹر صاحب "معارف"

جناب من! میں نے اردو لٹریچر کے "نفسِ واپسین" کے عنوان سے حال میں ایک مضمون لکھا تھا جس سے بعض حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ "پرستارانِ شبلی" کے مقابلہ میں دراصل اس سے انجمن اردو کی تنقیص مدِّ نظر تھی لیکن واقعی بات یہ نہیں ہے، میں نے انجمن کو اس کی اہم ذمہ داریوں کے لحاظ سے ٹوکا تھا، یعنی توقعات زیادہ ہوتی ہیں تو فروگذاشت کسی حیثیت سے ہو، مایوس کن ہوتی ہے،

"انجمن" جو کچھ کر رہی ہے میں اسے قوم کی عام بے التفاتی کے لحاظ سے بہت قابلِ قدر سمجھتا ہوں، اسی طرح مجھ کو "دار الاشاعت" لکھنؤ سے پوری ہمدردی ہے جو انجمن کے کارناموں کی مقدار کے ساتھ اسکی صفات کو بھی گراں وزن کر رہا ہے، اور گویا ایک غیر ذمہ دار جنسِ لطیف نے "ظفر الملک" سے ایک موقع پر کیفیت نہیں بلکہ جواب طلب کیا تھا، لیکن یہ بڑی ناشکری ہوگی اگر "ترقی اردو" کے آلۂ محرک (لیور) سے ایک منٹ کے لیے قطعِ نظر کی جائے، تاہم میں نہیں مانتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ قدرتی طور پر ہماری ضروریات کے مطابق ہے،

ملک کی کسی تعلیم یافتہ جماعت نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ہر چیز ایک نظام طبعی کی ترقی

ہے، اور اُردو زبان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، کانفرنس ہو یا انجمن ترقی اردو،
زبان کا مسئلہ کبھی اس حیثیت سے پیشِ نظر نہیں رہا، یہاں تک کہ ان لائق ادب
افراد نے (جن کے دل و دماغ کے نتائج آج اُردو کا بہترین سرمایۂ ادب ہیں) منفرداً
یا متفقاً کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے
کون کون سے کام ہیں جن پر ترتیباً سب سے پہلے توجہ ہونی چاہئے، اور در اصل ترقی اُردو
کے نظامِ ترکیبی کا اقتضائے طبعی کیا ہے،

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ملک میں جہانتک مختلف اصنافِ سخن کا تعلق ہے
لٹریچر کا ذخیرہ بڑھ رہا ہے، لیکن کیا یہ انتشارِ عمل کسی قاعدہ کلیہ کے تحت میں ہے؟ یا ہم
اس سے کسی حقیقی فوائد کے متوقع ہو سکتے ہیں؟

میں نے اسی خیال سے پروفیسر براؤن آف کیمبرج کو جو آجکل کے مستشرقینِ
یورپ میں ایک زبردست شخصیت رکھتے ہیں، اور جن کو مشرقی لٹریچر سے خاص
دلچسپی ہے، لکھ کر دریافت کیا، ممدوح کی رائے کے مطابق ہم کو ترقیِ زبان کے لئے
سب سے پہلے تالیفاتِ ذیل مرتب کرنی ہوں گی،

(۱) جامع اللغاتِ اُردو،

(۲) محاورات،

(۳) لغات الاصطلاحات،

(۴) لغاتِ فارسی، جہانتک اُردو کی تکمیل کا تعلق ہے،

(۵) لغاتِ عربی، بہ ترتیبِ جدید،

(۶) ادب الاساتذہ ، ۱۲ ضخیم جلدوں میں،

(۷) جامع القواعد اُردو،

(۸) عقلیات ، یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب،

(۹) اُردو انسائیکلوپیڈیا، جو ضابط علوم عصریہ ہوگی،

کسی زبان کو سرمایہ دار اور با اصول کرنے کی یہ قدرتی ترتیب ہے جس سے "براؤن" کی رائے کے مطابق قطع نظر نہیں ہوسکتی، ہم کو محض بے غایت رسائل کی اشاعت سے خواہ وہ فی نفسہ مفید بھی ہوں صرف مطبوعات کی تعداد بڑھانی نہیں ہے، بلکہ ان وسائل کی تکمیل کے ساتھ جو زبان کی ترقی کیلئے لازم ہیں، یہ بھی دیکھنا ہے کہ ناآشنایانِ سخن کو کس طرح زبان کا دلدادہ بنایا جائے،

اس کے لیے فاضل پروفیسر کی رائے ہے کہ کثرت سے "صالح لٹریچر" کی اشاعت کی جائے، اسی طرح ضخیم لغات کی ترتیب کے بعد اُردو، فارسی اور عربی کی لاکھوں جلدیں "لغات المبتدی" کی حیثیت سے مرتب کی جائیں اور اس کثرت سے شائع کی جائیں کہ بچہ بچہ کے ہاتھوں میں ہوں،

میرا خیال ہے، پروفیسر براؤن کی یہ اسکیم نسبتہً اس قدر ضروری ہے کہ اس کا ذکر اگر آپ کے دیبچہ میں نہ آتے تو لٹریچر کی حق تلفی ہوگی،

(معارف ۱۹۱۷ء)

شبلی سوسائٹی

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

حیدرآباد کی "بزمِ ادب" چاہتی ہے کہ ایک شبلی سوسائٹی قائم کی جائے جس کے مقاصد ملتے ہوں یعنی شبلی اکیڈمی کی طرح سخت اور ٹھوس نہ ہوں لیکن قبل اس کے کہ میں اس قسم کی سوسائٹی کی ضرورت پر نظر ڈالوں، مجھے دیکھنا ہے کہ جس کی یادگار قائم کرنی ہے وہ کس پایہ کا شخص تھا،

کم و بیش ۲۰ برس ہوئے مولانا نے مشرقیات پر طبع آزمائی کیلئے جہاں تک اسلامی علوم کا تعلق ہے ایک اسکیم تیار کی تھی جو خواص تک محدود رہی اور جس کی عام طور پر اشاعت نہیں کی گئی، اس کی تفصیل ممدوح کی زبان سے سنیئے، مولانا فرماتے ہیں:-

"تھوڑی دیر کے واسطے یہ فرض کرنا چاہیئے کہ زمانہ اپنی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ قائم ہے لیکن بجائے موجودہ نسل کے ہمارے اسلاف کا علمی گروہ دوبارہ دنیا میں آگیا ہے، اس حالت میں غور کرو، اس گروہ کے علمی مہمات کیا ہونگے؟ اس سوال کا جواب قیاسی اور فرضی نہیں بلکہ اصول تجربہ کے موافق دیا جا سکتا ہے، علمائے سلف نا

اوران کے علمی کارنامے دونوں ہماری آنکھ کے سامنے ہیں، نیز ہر شخص جانتا ہے کہ دولت عباسیہ کے زمانہ تک تمام اسلامی علوم بالکل سادگی اور یک رُخی کی حالت میں تھے، دولت عباسیہ کے وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعۃً ایک انقلاب ہوگیا، سب سے پہلے علماء کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے یونانی، فارسی، سریانی، کالدی، ہندی، اور قبطی زبانوں کے علوم و فنون ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں منتقل کر دیئے، ایک دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھکر اسلامی علوم کے سادہ ایوان پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں کیں، عقائد نے علم الکلام کی صورت اختیار کی، عربیت نے بیٹرک (معانی و بلاغت) کا قالب بدلا، اصولِ فقہ میں منطقی استدلالات پیدا ہوگئے، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہوگئی، فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل ہوگئے، ان باتوں کے ساتھ علوم قدیمہ کی غلامی نہیں کی، بلکہ جو کچھ کیا آزاد و خود مختار بنکر کیا، جہاں غلطیاں دیکھیں اصلاح کی، جو فضول حصہ تھا اس کو الگ کر دیا، پریشان اور غیر مرتب مسائل نئے سرے سے درست کئے جس قدر حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہوسکتا تھا تحلیل کیا، جو بالکل جُدا تھا اس کو مستقل حیثیت سے قائم رکھا،

مولانا مزید گہر افشانی یوں فرماتے ہیں:-

آج بعینہٖ اسی قسم کی حالت اور اسی قسم کا موقع ہے، یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدل دیا ہے، فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوتے ہیں، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے، تاریخ ایک قسم کا

فلسفہ بن گئی ہے، مذہبی مباحث کے نئے نئے پیرائے نکل آتے ہیں،

اسی گذشتہ مثال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج اگر اسلاف موجود ہوتے تو علوم وفنونِ جدیدہ کو پیشِ نظر رکھ کر وہی کرتے جو انہوں نے علوم قدیمہ کے ساتھ کیا تھا، علم کلام کو فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں مرتب کرتے، تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے، مسائلِ جدیدہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام علوم وفنون کے متعلق قدیم وحال کی تحقیقات کا موازنہ کرتے، اور دونوں کے عیب وہنر دکھاکر فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں کس حد تک قبول کے قابل ہیں، اور نئی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیونکر پیوند دیا جاسکتا ہے، یا ان کے نمونہ پر علومِ قدیمہ کی روش کیونکر بدل سکتی ہے، یہ سچ ہے کہ آج قوم میں "غزالی" و "رازی" موجود نہیں، لیکن ان کی تصنیفات آج بھی موجود ہیں، اور وہ ہمارے لئے چراغِ راہ بن سکتی ہیں، ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے راستہ میں کیونکر قدم اٹھانا چاہیئے، اور قدیم وجدید راہیں کہاں جاکر مل جائیں گی،

ان موضوعاتِ ابتدائی کے بعد مولانا کے خیال میں ان کاموں کی تفصیل جو اس زمانہ میں اسلاف کے نمونے پر کئے جاسکتے ہیں حسب ذیل ہوگی،

(۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتدبہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے،

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفۂ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں، پھر ان مسائل کو باطل کیا جائے، یا مذہب سے تطبیق دی جائے،

(۳) جس قسم کے مضامین پر آجکل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن پر اسلامی تمدن نے

بھی موجود ہیں، ان میں موازنہ کرکے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرزِ تصنیف کیا تھا، اور یورپ کا طرزِ تصنیف کیا ہے، مثلاً تاریخ، اسماء الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں، ان ہی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، موازنہ کرکے بتانا چاہیئے کہ دونوں کے مختلف خصوصیات کیا ہیں، اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح ہے،

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے، یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس زمانہ میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوتی گئیں، اور کن اسباب سے ہوئیں، ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے، کس قدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے،

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے،

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جاتے ہیں، اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعہ سے لائے جائیں،

(۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر مؤرخانہ مضامین لکھے جائیں، مثلاً انتظامِ عدالت، انتظامِ محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی نظم و نسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مؤرخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی، اور کس کس عہد میں کیا اضافہ ہوا؛

ظاہر ہے کہ مقاصد جو دکھائے گئے ہیں، ان کی تکمیل ایک دو شخص کا کام نہیں بلکہ ایک مجمع العلماء کا کام تھا، لیکن مولانا اپنی زندگی میں جو کچھ کرسکے اس کو پھیلانا اور تفصیل

سے دکھانا "دار المصنفین" کا کام ہے، ہمارے سبک مقاصد کیلئے صرف اتنی ضرورت تھی کہ اس جامع الحیثیات مصنف کی دماغی وسعت کا ایک سرسری خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو، اور بھولا ہوا سبق یاد آجائے،

ہم کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ پرستارانِ شبلی مولانا کو غزالی اور شاہ ولی اللہ سے کم نہیں سمجھتے، لیکن معترضین کو معلوم نہیں کہ آجکل کے دورِ مادیت میں کسی کی عظمت کے لئے محض خوش عقیدگی کافی نہیں، فوقیت کا راز ان دماغی تصرفات میں ہے جو صرف حکمائے ادب کا حصہ ہوتے ہیں، ہم ان صاحبوں کو ایک حد تک "غیر مکلف" سمجھنے کیلئے تیار ہیں جن کے نظام عصبی کا مستقر سرے سے ان مسائل کے ادراک کی قابلیت نہیں رکھتا، یا جنکی نفسیت غیر شاعرہ ہمارے زاویہ نگاہ کا ساتھ نہیں دے سکتی، لیکن اس کے ساتھ یہ بتادینا ضروری ہے کہ وہ قوم جس کا بلند سے بلند مصنفین کی (جو صرف انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں) نتائج افکار پر فخر نہیں کرسکتی، ہم شبلی کو صرف اس لئے چاہتے ہیں کہ وہ حالی ادیب تھے اور اپنے اونچے معیارِ تصنیف کے لحاظ سے متاخرینِ ادب میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں تھے یعنی ان کی عظمت جو کچھ ہے ان کی ادبی اور تاریخی تصنیفات کی بنا پر ہے،

بہرحال ہم کو اس شریفانہ جذبہ کیلئے جہانتک لٹریچر کی تحسین شناسانہ کا تعلق ہے معذرت کی ضرورت نہیں ہے، اور ہم بلا خوف تردید مولانا کے وسیع ذخیرۂ ادب سے صرف "شعر العجم" کو لیتے ہیں جو تنقید عالیہ (ہایر کریٹی سزم) کا بہترین نمونہ ہے، جس پر دنیا کی کوئی زبان ناز کرسکتی ہے، یہی کتاب ہے جو "جام کلب" کی طرح ہماری

سوسائٹی کو ایک متحد الغایۃ نظام کے تحت میں لا سکتی ہے جس طرح "فٹز جیرلڈ" کی ملہمانہ شاعری نے خیام کو یورپ میں زندہ کر رکھا ہے، اور آج خیام کے پرستاروں کا بہت بڑا حلقہ پیدا ہو گیا ہے، شعر العجم میں بھی بالخاصہ یہ کہربائیت موجود ہے کہ وہ کم سے کم تعلیم یافتہ طبقہ کے منتخب افراد کو کسی ایک مرکز پر لا سکتی ہے، مجھ کو اصرار ہے کہ صرف اُردو لٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پایہ کی تصنیف موجود نہیں ہے،

فارسی زبان کی لائق ذکر خصوصیات ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کا وسیع ذخیرہ الفاظ، سستہ، رفتہ طرز بیان اور ادائے خیال کی بہتری جدت آمیز نکتیں ہیں، جن کی بنا پر آج بھی وہ زندہ زبانوں میں کسی سے پیچھے نہیں، ایسی لچکدار زبان کی شاعری جو جذبات انسانی کی برانگیختہ کرنے والی ہو، اور جس میں خود نفس انسانی مخاطب صحیح ہو، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا پایہ رکھتی ہے، نثر کو اگر "ضروریات" زندگی میں رکھئے تو شاعری اپنی ادائے خاص کے مابہ الامتیاز کے رُو سے اُن "تکلفات" کا نام ہے جن سے کوئی شایستہ اور متمدن قوم قطع نظر نہیں کر سکتی، بہرحال "شعر العجم" دنیا کی سب سے شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر ایک مرقّع ہے جس میں مصوّر فطرت شبلی نے اس طبقہ کو زندہ کیا ہے جو مرنے کے بعد بھی غیر فانی ہونے کا مستحق تھا، اور ہم اپنے شخص کی یادگار میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں جس کی تفصیل آگے آتی ہے،

شعر العجم کا چوتھا حصہ جس میں مولانا نے شاعری پر عام تنقید کی ہے پوری کتاب کا رُوح رواں ہے، مولانا کے کمالِ انشا پردازی اور سخن آفرینی کا یہ حصہ اصلی جولانگاہ ہے جس میں انہوں نے اپنا زورِ قلم دکھایا ہے،

فردوسی[1] پر جس طرح نظر ڈالی ہے اس کے کمال کی باریکیاں جس جس طرح ابھار کر دکھائی ہیں، سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے ادھر ذہن بھی منتقل نہیں ہو سکتا تھا، اور یہی نکتہ سنجی کی آخری حد ہے جس میں وہ اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں لیکن یہ حصہ صرف مثنوی پر ختم ہو گیا ہے، بقیہ اصناف شاعری یعنی تشبیب و غزل، قصائد و رباعیات وغیرہ کے سلسلہ میں مولانا نے عشقیہ، صوفیانہ اور فلسفیانہ شاعری کے مستقل عنوانوں سے داد سخن دی ہے، جو حضرات لٹریچر کا مذاق صحیح رکھتے ہیں وہ اس حصہ کی "عطریات" کا اندازہ کر سکیں گے، میں ان اجزاء کو اس قدر اہم سمجھتا ہوں کہ کتابی سلسلہ سے علیحدہ جہاں تک شاعری کی ماہیت نفسی (سائیکالوجی) کا تعلق ہے دونوں حصے بجائے خود ایک مستقل چیز ہیں لیکن افسوس ہے کہ پانچواں حصہ جس کا مسودہ موجود ہے، اس وقت تک پریس میں نہ جا سکا،

بہت کم لوگ ہیں، جنھوں نے شعر العجم پڑھنے کی تکلیف گوارا کی ہوگی، ان میں بھی تھوڑے سے ہی ایسے ہیں جنکو شاید یہ علم ہو کہ شبلی کی آخری تصنیف کا سب سے آخری حصہ[2] اس وقت تک شائع نہ ہو سکا، اور ایسا تو ایک بھی نہیں ہے جسے اسکی اشاعت کی

---

[1] فردوسی کو اپنے کلام کی داد زندگی میں نہ مل سکی لیکن مولانا نے جس طرح اس کی تلافی کی ہے اچھے اچھے اہل قلم کو اس پر رشک آئیگا، پروفیسر براؤن بھی جو طبقہ اعلیٰ کے لکھنے والوں میں ہیں تحقیق کے ساتھ مذاق سخن کہاں سے لاتے، ان کی تاریخ الادب اس حیثیت سے بہت پھیکی رہی،

[2] تین سال سے یہ کتاب پڑی ہوئی ہے، اسکے طبع کرنے میں زیادہ سے زیادہ ۳۰۰ روپیے صرف ہونگے کیا "شبلی سوسائٹی" میں ۳۰ ارکان بھی ایسے نہیں مل سکتے جو دس دس روپیہ اس کیلئے جیب سے نکال سکیں،

ضرورت کا احساس ہو "معارف" کا خیال ہے کہ طبقۂ متوسط میں فرض شناسی کا احساس پیدا ہوگیا ہے لیکن امرا میں نہیں، اگر تھوڑی دیر کے لئے اس سے اتفاق رائے ممکن ہو تو علمی دنیا کے لئے یہ بالکل نیا انکشاف ہوگا، جہاں تک اردو انشا پردازی کے مذاق کا تعلق ہے کوئی روح عام موجود نہیں ہے، دو چار کام جو ہو رہے ہیں وہ محض اس لئے کہ ان میں امرا کا "طلائی ہاتھ" ایک حد تک شریک ہے لیکن یہ فیاضی بھی اضطراری ہے، احساسی نہیں،

مختصر یہ کہ پانچواں حصہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس میں صوفیانہ شاعری کی ارتقائی حالت کے سوا عشقیہ شاعری کے تفصیلی ریویو میں عرب اور عجم کے جذبات کے دقیق امتیازات دکھائے گئے ہیں جس کا ایک حصہ "معارف" میں نکل چکا ہے، ناظرین آنکھ اٹھا کر ایک نظر دیکھ لیں، یہ نفاستِ خیال، یہ جوشِ بیانی اب کہاں؟

"اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"

اسکی اشاعت "شبلی سوسائٹی" کے فرائض میں سر فہرست ہونی چاہیئے، ورنہ فارسی شاعری کی سائیکلوپیڈیا ناتمام رہ جائے گی،

مولانا کے مضامین یعنی "مقالاتِ شبلی" پر بھی ایک نگاہ ڈالنی ہوگی، جس کی ترتیب میرا خیال ہے، نظرِ ثانی چاہتی ہے، جہاں تک میں استقصاء کر سکا، کم و بیش ۳۶ مضامین اور ہیں، جن سے مقالات کی دوسری جلد تیار ہو سکتی ہے، ان چھوٹے چھوٹے خطباے سخن میں مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً

"فلسفۂ یونان و اسلام"، جس کے متعدد نمبر ہیں،[1]

تاریخ کا یہ ایک اہم سوال ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں فلسفہ و سائنس پر کچھ اضافہ و ترمیم کی یا نہیں، یا جیسا بارہا کہا گیا ہے "وہ ارسطو کی گاڑی کے صرف قلی تھے" یورپ کے جن مستشرقین کا فیصلہ ہمارے حق میں ہے وہ بھی اس لحاظ سے چنداں وقیع نہیں کہ یہ فیصلہ اجتہادی نہیں، بلکہ عربی فلسفہ کی سرسری واقفیت پر مبنی ہے، بلکہ مولینا نے دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے فلسفۂ یونان کو کس حالت میں پایا، ان میں کیا کیا تصرفات کئے، اسی طرح "فلسفۂ اسلام" میں علوم جدیدہ سے بحث کی گئی ہے، یعنی یونانیوں کا فلسفہ کیا تھا، فلسفہ حال کیا ہے؟ مسلمانوں کے فلسفہ کو دونوں فلسفوں سے کیا نسبت ہے؟ یہ معرکۃ الآرا سلسلہ بھی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ناتمام رہا، ابن رشد کا مضمون بھی نہایت ضروری ہے، جس کے فلسفہ پر یورپ مدتوں جیتا رہا، گو مولانا اکی تصنیفات اور اجتہادات پر ریویو نہ کرسکے "شعر العرب" کے چار نمبر، شعر العجم کے مقابلہ میں ہماری قابل افسوس ناداری کے لحاظ سے پھر بھی غنیمت ہیں،

ایک کام جو دراصل شبلی سوسائٹی کے کرنے کا تھا، اس کی اولیت دار المصنفین کے

---

[1] فلسفۂ یونان و اسلام نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

(۲) فلسفۂ اسلام نمبر ۱، ۲

(۳) الاسلام نمبر ۱، ۲، ۳

(۴) ابن رشد نمبر ۱، ۲، ۳

(۵) شعر العرب نمبر ۱، ۲، ۳، ۴

الغایتہ ۴- ایک ہی خاندان کی شاخیں ہیں، جن سے ایک مستقل رسالہ تیار ہو سکتا ہے، اگر رسائل شبلی اور مقالات کے مضامین یکجا کر دیئے جائیں اور عالمگیر کا مضمون بھی شامل کر لیا جائے تو دو نہایت ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں،

حصہ میں رہی، میری غرض مکاتیبِ شبلی کی دو ۲ جلدوں سے ہے، جو مولانا سید سلیمان کی
تہذیب (ایڈیٹری) میں نہایت نفاست سے شائع ہوئیں، عہدِ جدید میں کوئی مثال
ایسی نہیں ہے جس میں کسی مصنف کے رنج کے خطوط جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور
جس کے اجزا چھ سو صفحوں پر پھیلے ہوں، جس طرح آجکل خوش لباسی کی شرط یہ ہے کہ
اس میں کم سے کم بیدا کردہ بیساختہ پن ہو، یعنی کہیں سے اہتمام نہ پایا جائے، لٹریچر کا
وہ حصہ بہت دلچسپ ہوتا ہے جس میں آمدِ سخن یعنی برجستہ ادائے خیال کی حیثیت سے
تکلف مقصود و اہتمام کو کچھ دخل نہیں ہوتا، یہ بات صرف پرائیویٹ تحریرات میں ہو سکتی
ہے جس کا وقتی اظہار مافی الضمیر کے سوا یہ نہیں ہوتا کہ وہ گھونگھٹ سے باہر آئیں،
لکھنے والے کو بالکل خبر نہیں ہوتی لیکن اسکی سرسری جنبشِ قلم غیر ارادی طور پر اس کا
روزنامچہ زندگی مرتب کرتی جاتی ہے، جس میں اس کے اصلی جذبات و احساسات کے
خط و خال دیکھ لیجئے، یہ بھی ایک طرح کی مرقع نگاری ہے، جس میں نزاکت یہ ہے کہ انشا پرداز
اپنی تصویر خود اپنے قلم سے کھینچتا ہے،

ایک دوست کی جو مغربیات کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں، خواہش تھی کہ اس
مجموعہ کی ترتیب تاریخی حیثیت سے ہوتی تھی، لیکن یہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ مواد
ترکیبی ایک وقت میں پیشِ نظر نہیں تھا، مدتوں ان بکھرے ہوئے موتیوں کے لئے
لائق اڈیٹر کو جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑی، اس کے سوا مختلف اشخاص سے
مولانا کے روابط کی نوعیت بھی جداگانہ تھی، کسی ایک سلسلہ یا موضوعِ خاص کی تحریریں

STUDIEDNEG LIGENCE

تاریخی ترتیب سے "خوابِ پریشان" کی طرح منتشر ہو جائیں جس سے وہ موزونیت جواب سے باقی نہیں رہ سکتی تھی، بہرحال اُردو لٹریچر میں میرا خیال ہے یہ ایک قیمتی اضافہ ہے، اور چونکہ مولانا کی تصنیفات کی طرح ان میں بھی "انشاپردازانہ فصاحت و بلاغت" موجود ہے اس لیے دارالمصنفین کے "خوانِ ادب" کا یہ وہ لطیف حصہ ہے جسے آپ لائٹ لٹریچر کہہ سکتے ہیں، اس میں ابھی بہت کچھ اضافہ کی گنجایش ہے، اور ہم امید کرتے ہیں، ہماری سوسائٹی تیسری جلد کے سامان کی فراہمی میں کافی دلچسپی کا اظہار کرے گی،

اسی سلسلہ میں ایک اضافی کام اور ہمارے کرنے کے لائق ہے یعنی ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے شبلی کی یادگار میں ہم کو خیام کی رباعیات کا ایک نفیس اڈیشن شائع کرنا ہے، ہم کو خواجہ حافظ کے ساتھ بڑھی ہوئی حسنِ عقیدت کے مقابلہ میں غریب خیام کے وجوہِ حق تلفی پر غور کرنا ہوگا، مشرقی اقوام نے مذہب سے علیحدہ ہو کر کبھی زندگی پر نظر نہیں ڈالی، خیام کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے صرف اس حصہ سے غرض رکھتا ہے جو "از گہوارہ تا گور" سے آگے نہیں بڑھتی، کیا یہ الحاد ہے؟ قطعاً نہیں! مذہبی مذاق بالخاصہ موجودہ زندگی کو اگرچہ صریحاً غلط نہیں سمجھتا تھا، تاہم اس کا میلانِ طبعی یہ ہے کہ اصلی زندگی کا آغاز قبر کے اس سانچے میں ڈھلنے کے بعد ہوتا ہے، لیکن خیام جو کچھ سامنے ہے یعنی مادی زندگی سے قطع نظر نہیں کرنا چاہتا، اس کا دائرۂ موضوع ہستیِ موجودہ یعنی "نقد" ہے "ادھار" نہیں، یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ اپیکورین فلسفہ کی کورانہ تلقین یعنی صرف ایک طرح کی خوش عیشی سکھاتا ہے، اخلاقی تعلیم کی بڑی سے بڑی غایت یہ ہے کہ وقتِ موجودہ سے جہاں تک ممکن ہے جائز استفادہ کا کوئی پہلو رہ نہ جائے،

خیام بھی یہی کہتا ہے کہ "کل" جو گذر گئی، بیکار سی چیز ہے، جو آئے گی وہ غیر اختیاری ہے، زندگی "آج" اور صرف آج کا نام ہے،

ایشیا نے خیام کے ساتھ افراطِ سنجیدگی سے ہمیشہ بے اعتنائی کی، بیچارہ یورپ کے ہاتھوں جی رہا ہے، ہم کو اس کی سرد مہری کی تلافی کرنی ہے، سب سے پہلے "فزجیرلڈ" کی نظم کو اُردو میں لینا ہوگا، ہمارے پاس کافی مواد موجود ہے، جس سے ہم یہ بتلانے کے لائق ہوں گے کہ اس کے خیالات کا ماخذ کیا ہے، یعنی خیام کے سوا اس نے اپنے سلسلۂ خیال میں اور کس کس سے فائدہ اُٹھایا ہے، اصلی کام یہ ہوگا کہ خیام کا آکسفورڈ اڈیشن جو غالباً سب سے قدیم نسخہ ہے، اور جس میں رباعیات کا فوٹو لیا گیا ہے، اُردو ترجمے اور حواشی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کیا جائے، اس اشاعت کی امتیازی خصوصیت یہ ہوگی کہ خیام کے فلسفۂ زندگی پر، سوسائٹی کے "عالمِ نفسیات" کا تفصیلی ریویو ہوگا، اور کیا تعجب ہے اس سلسلہ میں ہم اس پر بھی غور کر سکیں کہ خیام کی شرابِ انگوری کھنچ کھنچ کر شرابِ معرفت کیوں بنی؟ اس پہلو سے ہم تصوف کے ان مسائل پر ایک نظر ڈال سکیں گے جو براہِ راست علم النفس کی زد پر ہیں، اور کچھ نہ کچھ اس راز کی عقدہ کشائی ہو سکے گی جس کی تشریح الکیفی کی لائق رشک خصوصیت یہ ہے :-

"منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن"!

سب سے آخر مگر در اصل کسی سے پیچھے نہیں، مولانا کی فارسی اور اُردو نظم کو یکجا کرنا ہے جو باوقاتِ مختلف ٹکڑے، پارچے ہو کر چھپتی رہیں، بہت سی پھول پتیاں ہیں جن کے اجزا بے پریشان بکھرے ہوئے ہیں اور جن میں کوئی ہیئتِ مجموعی نہیں،

کسی نازنین کی زلفِ عنبریں جو شانوں پر بکھرتی ہوئی حسنِ انتشار کے ساتھ کمر سے نیچے جا پڑی ہو، کیفیت سے خالی نہیں ہوتی لیکن "گرہ شب"[1] یعنی جوڑے کی بندش اس سے زیادہ دلکش اور خوش ترکیب ہوتی ہے، ضرورت ہے کہ اوراقِ منتشر کا ایک گلدستہ بنایا جائے،

بیلیتی کی نازک خیالیاں گویا میری جوانی کے قصے ہیں جو مولانا کی زبان سے ادا ہوئے، آپ داد دیں یا نہ دیں، شاعر کو بالکل اس کا احساس نہیں، اس کا عالمِ خیال خود ایک دنیا ہے، ذرا جذبات کا تموج دیکھئے گا، سمندر کے کف سے ایک پری[2] نکلی لیکن بالکل عریاں جس کے بالوں سے قطراتِ آب موتی کی طرح ٹپک رہے ہیں، اس کے نازک سے ہاتھ میں ایک ساغرِ شراب ہے، وہ شاعر کی طرف بڑھتی ہے عنبر بکھیرتی ہوئی، یاقوتی ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم ہے، نازک خیالی جس کی بلائیں لے رہی ہے، ذرا شاعر کی کافرادائی دیکھئے، شراب کبھی منہ سے نہیں لگی، صرف زبان پر چڑھی تھی، لیکن اس نے چھلکتا ہوا جام دفعتہً خالی کر دیا!

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی ؛ تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

کہیں یہ "آب حیات" تو نہیں تھا؟

بہرحال جس نازک خیال اور نفیس المذاق نے تجمل کی شاعری کو اپنے زورِ قلم سے زندہ کیا ہو، اس کے کلام کی ترتیب کم ضروری نہیں، یعنی کلیاتِ شبلی کے ایک خوبصورت

---

[1] بہم کردہ موئے بصد پیچ و تاب ؛ گرہ داد شب را بسر آفتاب

[2] "مصنوعی داد" یہ خیال ایک نہایت حسین مرقع کے ذریعہ سے ادا کیا گیا ہے جس میں مغربی آرٹسٹ نے اپنا کمالِ فن دکھایا ہے،

ایڈیشن کی اشاعت ناگزیر ہی ہے، اس میں وہ اخلاقی اور سیاسی نظمیں بھی ہونگی، جو "کنایات" کے پردہ میں "الہلال" میں وقتاً فوقتاً نکلتی رہیں، یہ ترتیب تاریخی حیثیت کی ہوگی، جس سے مولانا کی شاعری کی تدریجی رفتار اور اس کے ارتقائے نفسی کا اندازہ ہو سکے گا،

یہ خیالات جن کے اظہار میں جلدی کر رہا ہوں "شبلی سوسائٹی" کے دائرۂ مقاصد سے باہر نہیں ہیں، ابھی اصل مسئلہ کی طرف توجہ کرنی ہے، میری غرض ان تحریکات سے ہے جن سے کسی طرح تعلیم یافتہ طبقہ اردو کا شیدائی بنایا جا سکے، تصنیف و تالیف کی چنداں فکر نہیں کہ نہیں نہیں پر بھی کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے "انجمن اردو" نے بعض لاجواب اور قیمتی کتابیں شائع کیں، اور اس کا آیندہ نظام عمل (پروگرام) بھی وسیع لائنوں پر ہے، "دار المصنفین" بھی اپنا درجہ قائم رکھنا جانتا ہے اور خواص کی پیاس کیلئے "لقمۂ ماہی" تیار رکھتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ ان اوسون پیاس کا بجھنا آسان نہیں یعنی ہماری علمی تشنگی کے لحاظ سے برف میں لگی ہوئی چند بوتلیں کافی نہیں تھیں، مگر اب کہ "ہز رائل ہائینس[1] فرمانروائے دکن" کے سایۂ عاطفت میں "عثمانیہ یونیورسٹی" قائم ہو رہی ہے، اردو کا دائرۂ اثر بہت بڑھ جائیگا، یہ فیاضانہ اسکیم اگر "سرخ فیتہ" یعنی جن کے ہاتھوں میں انتظام ہے آشنائے فن ہو کر خوش سلیقگی سے چلا سکے تو باوصف اس کے کہ ابتداءً ایک مقامی

---

[1] یہ آدابِ سخن کا ایک اضطراری تصرف ہے، لیکن اگر رائلٹی یورپ کی اودی اودی رگوں کی روانی خون کے ساتھ مخصوص نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ "مشرق کے سب سے بڑے شہزادے" کے لئے جو اپنے وسیع ذرائع مالی و اقتصادی کے ساتھ اپنے لائق رشک سن و سال کے لحاظ سے دنیا کے بہتیرے تاجداروں سے کم نہیں ہے، ہم "شاہی" انتساب کو کیوں نہ جائز رکھیں،

تحریک ہوگی، اُردو کی وسیع قلمرو میں اس کا اثر برقی رَو کی طرح دوڑ جائے گا، اور یہ ایک ایسا چشمۂ جاریہ ہوگا جس کی شاخیں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہونگی، بشرطیکہ ہم وقت سے فائدہ اٹھا سکے، اور اس وسیع الاثر تجویز کے نتائج کو متفقہ کوشش سے وقفِ عام کرسکے،

آج ہم میں سب سے بڑا تعلیم یافتہ صرف خوش وضعی (فیشن) پر جان دیتا ہے، اس کا لباس متمدنہ (کوٹ پتلون) اس کی امتیازی زندگی کا ایک ایسا مظہر ہے جس سے وہ باوصفِ کم استطاعتی قطعِ نظر نہیں کرسکتا، اس کی لطافتِ خیال نئی وضع کے دوہر کالر میں ریشمی ٹائی کی جچتی ہوئی نشست سے آگے نہیں بڑھتی، گلے کی "بندش" کا تارازبہ اگر کہیں ہمرنگ موزے اور رومال سے ہوگیا، پھر تو اس کے تخیل کی تکمیل کے لئے موجودہ دُنیا میں کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہتی، آپ یہ نہ سمجھیں، میں اس خوش لباس حیوانِ ناطق کو اوّل درجہ کے معیار سے گرا کر آدم کی ابتدائی پوشش پہنانا چاہتا ہوں، میری غرض صرف یہ ہے کہ یہ طبقہ جس طرح ظاہری ٹھاٹھ کا گرویدہ ہے دماغی آرایش بھی اس کا مطمحِ نظر ہوتی، اور یہ اُردو لٹریچر سے اتنا مانوس ہوسکتا کہ ادبی رنگ رچ کر نکھر جاتا جس سے قوم دنیا میں آبرودار ہو کر رہتی،

آج ہماری سیاسیات کی جو کچھ حالت ہے ظاہر ہے، ہماری "اقلیت" انتشارِ ذرات کی حیثیت سے قوی تر عناصر میں بتدریج جذب ہوتی جاتی ہے، اور ہم ظاہراً بہت کچھ ابھرتے نظر نہیں آتے، بیشک جو مطالبے گورنمنٹ سے کئے جاتے ہیں وہ ملک کے قدرتی حقوق ہیں، لیکن جب تک فاتح و مفتوح کی زبان و مذہب اور قومیت

ایک نہ ہو، گورنمنٹ کے طرزِ عمل (پالیسی) میں ہمارے جذبات کی کماحقہ رعایت ہو سکتی ہے لیکن خیر اس کی مشکلات سے قطع نظر کیجیے، کیا اس بدنصیب برِّ اعظم میں سیاسی مصالح کی بنا پر بھی کوئی متحدہ قومیت کی رُوح موجود ہے، یا کبھی ہو سکتی ہے؟

مسلمانوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ آئے تھے حکومت کرنے لیکن اس طرح جم کر رہ پڑے، جیسے کوئی خانہ برباد، پردیس میں، اگر بات بن گئی تو دیس بن جاتا ہے، اس غلطی کی تلافی تو اب ہو چکی لیکن سوال یہ ہے کہ سات کروڑ اشرف الموجودات جن میں کوئی ہیئتِ مجموعی نہیں، ہمارے کس کام کے ہیں؟ ہندوستان کی اصلی قوم ہم کو اضافی اور خارجی عنصر سمجھتی ہے، خیر چلیے ہمارے کھیل بگڑنے سے بھی نہیں ہوا کہ ہم نے اپنی اصلیت اور یکرنگی کھوئی، بلکہ اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے جن کا یہ اصلی وطن ہے اور جو ان کی مختلف النوع اغراض کے لحاظ سے در اصل ان کے لیے خالصہ دنیا تھا،

آج آپ ایک جداگانہ قوم (؟) کی حیثیت سے اپنی گذشتہ روایات (؟) کی بنا پر خاص خاص مراعات چاہتے ہیں لیکن اگر اصلی قوم میں گھل مل بھی جائیے یعنی "خویش ذات الله بربادی" سے دل کش ہو کر بھی رہ جائیں، پر آپ ہی نتیجہ اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ شکست کی ہانڈی چور اہے میں! بہر حال فضائے امید کسی رُخ سے دیکھیے، تیرہ و مضمحل نظر آتی ہے،

لیکن اس دورِ حریت میں اگر آپ اپنا ادب (لٹریچر) بھی کھو بیٹھے تو تاریخ آگے چل کر آنکھیں دکھائیگی کہ ترقی تو خیر جس نقطہ پر ہم کو اپنی روایاتِ سابقہ کی بنا پر قائم رہنا

تھا، وہاں بھی نہ ٹھہر سکے، آجکل کی جنگی اصطلاح ہیں، ادبی حیثیت سے ہماری یہ "شاندار پسپائی" آیندہ دُنیا کے لئے واقعۂ عبرت ہوگی،

کس قدر غیر منطقی خیال ہے کہ ہم برادرانِ وطن سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اُردو کو ہماری طرح اوڑھنا بچھونا بنائیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ کوئی قوم اُس وقت تک اپنے لیے "مستقبل" نہیں پیدا کر سکتی، جبتک اس کی ابتدائی رفتار کی بنائے اساسی منازلِ ارتقائی کے سلسلہ میں اس کی گذشتہ عظمت پر نہ رکھی گئی ہو، یہی گذشتہ عظمت ہے جو کسی قوم میں ہیئتِ مجموعی پیدا کرتی ہے، ہندی کے قومی زبان بنانے کا راز یہی ہے جو بھولے مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آتا، خوب یاد رکھئے! ہندی مسئلہ کی تجدید تاریک خیال دیہاتیوں کے مخروطی دماغ کی جدت آمیز اختراع نہیں ہے، بڑے سے بڑا روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہندو بھی اس زبان سے دست بردار نہیں ہوگا جس کو وہ اپنی قوم کی "اسپر ٹیٹو" دیکھنا چاہتا ہے، یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد اس کی متحدہ قومیت کے تمام مفردات ایک ایک کر کے حلقہ زن ہوں گے،

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ فریمسنوں کا ایک راز ہے جو سینہ بسینہ منتقل ہو رہا ہے، اور پاس کے پاس ہم کو کچھ خبر نہیں ہوتی، ہندی کی دبے پاؤں مگر نہایت مستقل ترقی دراصل اُردو کے گلے کی چھری ہے جو ایک دن اس کا خون کر کے رہیگی، حکومت بھی رنگِ غالب کا ساتھ دیگی، اسلئے میں عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر مسلمانوں

سطرے میں یہ لکھ رہا ہوں دفعۃً "ہندی لٹریری کانفرنس" کی خبر آئی، جس کی پہلی نشست میں صرف ایک رئیس نے دس ہزار روپے دیئے، مقاصد کے لحاظ سے اسے ناگری پرچارنی سبھا کا تختِ رواں سمجھئے،

کی یہی غفلت رہی تو زیادہ نہیں پچاس برس کے بعد آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟ اُردو کا وہی رنگ ہوگا جس کا ایک دُھندلا سا خاکہ حال میں "ہمدم" کے لائق اڈیٹر نے پیش کیا تھا، کفر، وہ بھی کعبہ میں! لکھنؤ اُردو کا گہوارۂ طفلی نہیں بلکہ اس کا عشرت کدۂ شباب رہا ہے لیکن وقت کی بات ہے جس چیز پر ہم کو ناز تھا، جو ہمارے لئے گرمیٔ محفل کے سامانوں میں نہیں بلکہ شرطِ زندگی تھی، آج سرے سے اس کا وجود ہی معرضِ خطر میں ہے، اگر ہندی نے رفتہ رفتہ ہاتھ پاؤں نکالے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے وضعدار بیویوں میں بڑے پائنچوں کی جگہ جو خوش ادائی سے کھونسے جاتے ہیں گاڑھے گزی کی سایوں کو رواج دیا جائے جسے دیہات کی کثیف عورتیں نصف ساق تک لپیٹ لیتی ہیں،

منہ پر آئی ہوئی بات رُکتی نہیں، اور اِس سلسلہ گفتگو میں آپ سے جانے کیا کیا کہنا چاہتا ہوں، خاصکر اِس خیال سے کہ جہاں آواز کی رسائی نہیں، تحریر مقاصد دلی کی وکیل بن سکتی ہے مختصر یہ کہ یارانِ وطن نے اُردو کو لنگوٹی بند صوادی ہوتی، لیکن کثرتِ یاس کبھی اُمید کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، دفعتہً واقعات نے کروٹ لی، اور اُردو جو کل تک کس مپرسی کی حالت میں تھی، آج شاہی دائرہ نظر میں ہے، جھونپڑیوں کی رہنے والی اور محلوں کا خواب! بات بنتے کچھ دیر نہیں لگتی، اس غیر متوقع اعزاز کے ساتھ اس کی آبرو کا نباہ جیسا بار بار کہہ چکا ہوں ہمارے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے، اس کی چلتی ہوئی تدبیر یہ ہے کہ جدید تالیفات کے سوا جو پڑھنے کے لائق ہوں، حکمائے ادب کی تصنیفات ایک ایک کر کے پیش نظر رکھئے، جس طرح صوفیہ کو تزکیۂ نفس کے لئے ریاضاتِ شاقہ کے سلسلہ میں بہتیرے "مقامات" طے کرنے پڑتے ہیں،

آپ کے وظائفِ عمل کے لئے "عناصرِ خمسہ"[۱] کے انجھروں پر نظر کا ایک دفعہ جما لینا کافی ہوگا، اسی لئے سب سے پہلے آپ کو "فلسفۂ عشق" یعنی "شعر العجم" کی چاٹ پہ لگانا چاہتا ہوں، یہ تو فرائض ہوئے، نوافل ہیں "معارف"، کا وردِ ناہموار ناگزیر سا ہے، اور یہ "شبلی سوسائٹی" کی سب سے پہلی اور ضروری خصوصیت ہوگی،

آجکل کے دورِ سرفروشی ہیں کیا سات کروڑ میں سات لاکھ نہیں، سات ہزار نہیں، سات سو "رہنماکار" فدایانِ سخن بھی نہیں مل سکتے جن کی زندگی کا بہترین تخیل "معشوقۂ ادب" کی پرستش کے سوا کچھ نہیں جس کا حسن افسردہ سفارشی ہے، کہ بے اتفاقی کی جگہ گرمجوشی سے پیش آئے، یہ جہاں چاہنے والے کے گلے کا ہار بننے کو تیار ہے ہر شخص کے قابو میں آنے والی چیز نہیں، اس پاکیزہ روشنی کے ساتھ جدت یہ ہے کہ بوڑھی ہونے والی نہیں، یعنی شراب کی طرح کہ جتنی پرانی ہو پاکیزہ ہوتی ہے، اسے بہارِ بے خزاں سمجھئے، اس سے زیادہ آپ کے جذبات کی رعایت کیا ہوگی،

کل کی بات ہے مسلمان اپنے ادب (لٹریچر) کے سب سے زیادہ دلدادہ تھے، یہ جذبۂ متوارث آپنے کہاں کھو دیا کیا یہ آپ کی عزتِ نفس پر حرف لانے والی بات نہیں کہ "انجمن ترقی اردو" اور "دارالمصنفین" کی ٹکسالی (اسٹنڈرڈ) تصنیفات کی دو چار سو جلدیں بھی سال میں نہیں نکل سکتیں، اور گرد خوردہ اوراق المایوں کی چھپائی کا بوجھ رہتے ہیں، دنیا کی تاریخ میں آپ کوئی قوم دکھا سکتے ہیں جس نے مانگے تانگے کی نہیں،

---

[۱] میری غرض آزاد، سر سید، نذیر احمد، اور حالی و شبلی کی تصنیفات سے ہے، متاخرین میں بھی ارواحِ قدسیہ ہیں جن کو موجودہ لٹریچر کی خلاقی میں جہانتک طبقۂ اعلیٰ کا تعلق ہے، سب سے زیادہ دخل ہے،

اپنی مادری زبان سے بے نیاز رہ کر کبھی ترقی کی ہو، ترقی تو خیر مجھے کہنا چاہیئے دُنیا میں باقی رہی ہو، ان نکات کو آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں، ضرورت جو کچھ ہے، یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھئے، وقت کا فتویٰ کیا ہے، ضائعات کی تلافی گو آسان نہیں لیکن تریاقِ غلط کاری کو آزما دیکھئے، اس گئی گذری حالت میں بھی اگر آپ دل پر رکھ لیں تو اپنی گذشتہ روایات کا زندہ کرنا بڑی بات نہیں،

ذوقِ علمی شراب کا سا چسکا ہے کہ ایک دفعہ جہاں منہ لگی پھر نہیں چھوٹتی، میں آپ کے لئے اسے حلال کئے دیتا ہوں، خود شوق کیجئے اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں اس مذاق کو چمکائیے، صرف شرط یہ ہے کہ ایک کے ہو رہیئے، اور اس طرح اس مشغلہ کو چھیڑیئے کہ اغیار بھی کہہ اُٹھیں :-

خدا اس دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو بے سنبلستاں کا

"خیام" کا "شبلی" ایڈیشن جب شائع ہوگا، ہوگا! اس کے الفاظ یاد رکھئے کہ زندگی آج اور صرف آج کا نام ہے،

"شبلی سوسائٹی" کے مقاصد کی باقاعدہ تفصیل، اس کا نظامِ ترکیبی، اور وہ جزئیات جن سے "خیام کلب" کی طرح ارکانِ سوسائٹی ادبی اخوت کی سلک یکجہتی میں منسلک ہو سکیں "حیدرآباد" کی بزمِ ادب کے لائق افراد کا موضوعِ آئندہ ہوگی،

(معارف ۱۹۱۸ء)

حیدرآباد کی بزم ادب

پیارے ایڈیٹر! میں نے نہایت افسوس کے ساتھ ان مناقشات کو دیکھا، جس کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے، اور مجھے خوف ہے کہ "بعض نادان دوستوں" کی وجہ سے ریاست کے اعزاز کو غیر ذمہ دار اشخاص کی لائق نفرت جنبشِ قلم سے نقصان پہنچے گا،

آجکل بیرونی دنیا پر یہ اثر پڑ رہا ہے کہ اگر کسی نے وہاں یہ کہہ دیا کہ "طائر شب رنگ" کان لے گیا، تو ایک دم سے نگاہیں فضائے آسمان پر اُٹھ جاتی ہیں، لیکن پاس کے پاس دستِ شوق اپنے اپنے کانوں کا جائزہ نہیں لیتے،

مسٹر عبدالماجد پر جو لے دے رہی، وہ قطعِ نظر اس کے کہ قومی بدنصیبی کی ایک نمایاں مثال ہے، اس کا ایک رُخ تاریک یہ بھی ہے کہ سوسائٹی کے اونچے طبقات کو علمی مذاق سے ایک حد تک ناآشنا ثابت کیا جائے، لگاؤ بجھاؤ کا اثر اسی وقت ہوتا ہے جب سننے والے میں مادۂ اجتہادی کی کمی ہو یعنی وہ تشکیلِ رائے پر قادر نہ ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ ایک یا چند آوازِ مخالف کرنے کی کائیں کائیں سے زیادہ باوقعت نہیں ہے،

ماجد صاحب کا سوا اس کے کچھ قصور نہیں ہے کہ انہوں نے فلسفہ کی ایک شاخ یعنی "نفسیات" پر جو کچھ لکھا خالی الذہن ہو کر لکھا، بیشک ایک ایسی قوم میں جو مذہب سے علیحدہ کر کے کسی چیز کے دیکھنے کی عادی نہ ہو، یہ ایک نئی آواز تھی، لیکن بیسویں صدی میں بھی اگر عقلیات کو ہم خارجی متاثرات سے آزاد نہ کر سکے تو یہ ایک ایسی ہی غلطی ہو گی جیسی خلفائے عباسیہ کے وقت میں مسلمانوں سے اس سے پہلے ہو چکی ہے،

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد زرین میں بھی عقلیات پر خالص علمی حیثیت سے توجہ نہیں کی، یا اس قدر کم توجہ کی کہ اس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے، میں متکلمین کی جدت آمیز نکتہ آفرینیوں سے ناواقف نہیں ہوں لیکن جن عقائد و خیالات کی بنیاد تمامتر جذبات پر ہے، ان کی تردید یا تائید دلائلِ عقلی سے کہانتک ہو سکتی تھی، جس طرح عقل ان کی تخلیق میں بے بس تھی، اسی طرح ان کے کسی حصہ کو زائل نہیں کر سکتی تھی، یہ وہ نازک نکتہ ہے جو آجتک کسی کی سمجھ میں نہ آیا، لحاف کے جھول کی طرح کچھ استر سے لیا اور کچھ ابرہ سے، اور دونوں کو کھینچ تان کر برابر سرابر کر دیا، مذہب اور فلسفہ کی تطبیق اسی اصول پر کم و بیش ہوتی رہی، کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے وقت میں عقلیات پر مٹے ہوئے تھے، لیکن تاریخ بتائے گی مذہب کے مقابلہ میں ان کے یہاں فلسفہ کا کیا درجہ تھا؟ برا نہ مانئے تو میں کہونگا بس اتنا ہی جتنا لونڈی کا بیوی کے مقابلہ میں ہوا کرتا ہے! لونڈی بانکی، ترچھی اور نئی نئی جوبنوں پر آئی ہوئی لیکن پھر بھی نوخیز تھی، بڑی بی کے چہرے کی جھریوں نے جو بیکار نہیں جا سکتی تھیں، قدامت کی بات رکھ لی، اور لونڈی کو ہمیشہ دب کر رہنا پڑا، یہ نکتہ آرائی

نہیں بلکہ واقعۂ تاریخی ہے کہ علمائے اسلام نے مذہب سے علیحدہ ہو کر کبھی عقلیات پر نظر نہیں ڈالی یعنی وہ علم کے اُس حصّہ کو بیکار سمجھتے تھے، جو کسی نہ کسی حیثیت سے کھینچ تان کر تعلیمات قرآنی کے تحت میں نہ آجائے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فلسفہ کو مذہبی تسلّط سے کبھی آزاد نہ کر سکے، اور جیسا کہ میرے ایک لائق دوست کا خیال ہے، علم کلام کی بھول بھلیاں میں پھنسکر رہ گئے! یہی وہ نکتہ ہے جس کی فروگذاشت نے ہم کو فلسفہ سے حقیقی معنوں میں قطعاً محروم رکھا، اور آج جبکہ زندگی کی کشمکش اور بقائے حیات کے لئے حکمیات سے ہماری بیگانہ وشی خودکشی کا مرادف ہو رہی ہے، ہمارے ابتدائی اسباق پر کفر کا اطلاق ہوتا ہے! کسی محکمۂ احتساب کی طرف سے نہیں، کسی جمع العلماء کی طرف سے نہیں، یا وش بخیر! موجودہ "شیخ الاسلام دکن" کی طرف سے نہیں، بلکہ ایک بازاری پریس کی طرف سے جس کا وجود ریاست کے لئے، ریاست کے مختلف طبقات کے لئے، بلکہ خود اس کیلئے باعث شرم ہے،

کسی بات کا نہ جاننا چنداں لائق اعتراض نہیں لیکن یہ بھی نہ جاننا کہ وہ نہیں جانتا، ایسا جہلِ مرکب ہے جو کسی طرح لائقِ معافی نہیں "فلسفۂ اجتماع" کے مصنف نے کسی مذہبی موضوع پر قلم آزمائی نہیں کی ہے، بلکہ فلسفہ کی ایک شاخ یعنی علم النفس سے اردو لٹریچر کو پہلے پہل مانوس کیا ہے، یہ ایسا دقیق موضوع ہے جس پر خود یورپ میں باوصف عقلی ترقیات کے معلومات کا سرمایہ محدود ہے، "ڈاکٹر لیبان" غالباً پہلا شخص ہے جس کی حکیمانہ موشگافیوں نے نفسیات کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے جلوہ گر کیا، اور آیندہ میرا خیال ہے اس کی نقش آرائیاں جہاں تک انسان کے قوائے

ذہنی کا تعلق ہے تاریخ انسانی کا رُخ پھیر دینگی،

لیکن یہاں مَیں "فلسفۂ اجتماع" پر تنقید کرنے نہیں بیٹھا ہوں، میری غرض صرف یہ ہے کہ اس میں مذہب اور پیشوایانِ مذہب کا جو کچھ ذکر آیا ہے وہ محض نفسیاتی حیثیت سے اور لائق مصنف نے دُنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ مختلف پہلوؤں سے بانیانِ مذہب کے مظاہرِ نفسی پر نظر ڈالی ہے جس سے انکی دماغی فوقیت کے راز کی عقدہ کشائی منظور ہے، بہرحال اس کیلئے مجھ کو مصنف کی طرف سے معذرت (اپالوجی) کی ضرورت نہیں، کسی فلسفیانہ تصنیف میں اگر چشمِ سخن مذہب کی طرف بھی کچھ اشارے کرے تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اظہارِ خیال کے سلسلہ میں مذہب اور بانیٔ مذہب کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے ان میں مستشرقانہ حیثیت سے کافی سنجیدگی اور ادب ملحوظ رکھا گیا ہے یا نہیں، میری غرض ایسے لب و لہجہ سے ہے جو دُنیا کے کسی مذہب کے لئے نامناسب نہ ہو اور جس میں مصنف کے ذاتی عقائد (خیالات) کی جھلک کا کوئی شائبہ نہ پایا جاتا ہو، مصنف کی طرف سے اس اصول کی خفیف سے خفیف خلاف ورزی، عام احساسات کے مقابلہ میں دراصل ایک متعلّمانہ سبک ظرفی ہوگی، اور میں یہ فیصلہ جہاں تک کتابِ زیرِ بحث کا تعلق ہے اہلِ نظر پر چھوڑتا ہوں،

اخبارِ دکن کو مایوسی ہوگی کہ گردن زدنی ماجد کی بریت میں گراں وزن علمائے ملک کو فتوے شائع کرنے پڑے لیکن اگر آپ یہ فرمائیں کہ "ضمیرِ متکلم کے گلے پر چھری" تو مَیں اپنی مجتہدانہ رائے (!) بھی پیش کرنا چاہتا ہوں، یعنی:-

"کوئی مسلم کسی حالت میں کافر ہو ہی نہیں سکتا"

اس خیال کی رفعت و وسعت دیکھئے، اغیار تنگ نظری کے ساتھ سطح خاک ہی پر رہے، اور میں کہاں پہنچا، جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں، تیرہ سو برس کے دفتر کا غلاصہ ایک فقرہ ذرا ماجد کے کفر کی شان دیکھئے گا،

آئیے میں آپ کو ایک زبردست کافر ادبی کا پتہ دیتا ہوں، جو بہ لحاظ فن ماجد کا ہم ردیف ہے، میری غرض پروفیسر "عیاری" سے ہے جو علوم قدیمہ کے ساتھ علوم عصریہ کا بھی عالم ہے، اور اس قدر قابل قدر ہے کہ اگر قوم زندہ ہوتی تو "فلک نما" کے ایک گوشہ میں نہ سہی کسی زاویہ عالی (اکیڈمی) کی زینت بڑھا رہا ہوتا، اسے میرے حسن ظن کی افراط نہ سمجھئے گا، میں ان کے معرکۃ الآرا تالیفات کو اس وقت پیش کرنا نہیں چاہتا، صرف ایک آدھ مضمون کو لیتا ہوں، جو "تصوراتِ کلیہ" اور "مادیت" پر انھوں نے لکھا ہے اور جو میرے خیال میں فتوحاتِ ادب میں سر فہرست ہونے کے لائق ہے، یہ اس شخص کی رائے ہے جس کے دائرۂ نظر سے اردو لٹریچر کا کوئی حصہ جو جاننے کے لائق ہے باہر نہیں ہے، یہ ایک فقرۂ معترضہ تھا، مجھے سلسلۂ بیان میں باوصفِ کوششِ اختصار ابھی کچھ اور لکھنا ہے،

اس طوفانِ بے تمیزی میں سب سے بڑی حق تلفی جو قوم کی ہو رہی تھی وہ انجمن ترقیٔ اردو کے کارنامہ پر پانی پھیرنا تھا، مسلمانوں کی یہی ایک انجمن ہے جس سے اردو لٹریچر کی ترقی نہ سہی، اس کی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں، قوم کی عام بے التفاتی معلوم ہے، سوسائٹی کے کسی طبقہ کو اپنی زبان سے عملی دلچسپی نہیں ہے، ایسی حالت میں مولوی عبدالحق مختلف موانع کے ساتھ جس طرح کام چلا رہے ہیں، ان ہی کا ظرف

ہے، اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ بھی نہ رہا تو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سناٹا ہوگا، اور محرکات میں جب کوئی چیز باقی نہیں رہے گی تو کون کہہ سکتا ہے اس کے نتائج آیندہ کیا ہوں گے، مولوی عبدالحق اس لائق تھے کہ اگر علی گڑھ کی "مرکزیت" کا کوئی مفہوم ہوتا تو ہم خود ان کو سستانہ کرتے، یعنی یہ کہیں سے وقف اغیار ہونے کی چیز نہیں تھے، اُردو کے جو کچھ وہ خدمت کر رہے ہیں ناانصافی ہوگی اگر اس کا اعتراف نہ کیا جائے،

میں نے ایک زمانہ میں ان کو نہایت سختی سے ٹوکا تھا، اور ایک یوروپین مستشرق کے مشورہ سے ان امور کی طرف ان کو توجہ دلائی تھی جو اُردو کی ترکیب و ترویج کے مقدماتِ اساسی تھے، مثلاً میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ایک اُردو لغت کی ضرورت ہے، اس سے میری غرض لغات المتعلم سے ہے یعنی میں چیمبرس کا پیمانہ چاہتا ہوں، ویبسٹر کا نہیں "امیر اللغات" اور "فرہنگِ آصفیہ" کی ناکامی کا راز یہی ہے کہ ایک دم سے بڑا پیمانہ اختیار کیا گیا، اسی طرح ہم کو لغات الاصطلاحات کی سخت ضرورت ہے، محاورات، اور مترادفات کو بھی علیحدہ علیحدہ اسی ذیل میں رکھئے، جس طرح انگریزی کی تکمیل بغیر "لیٹن" اور "گریک" کے نہیں ہو سکتی، اردو کے لئے عربی، فارسی ناگزیر سی ہیں، کم سے کم اُردو کے اغراض کے لئے ہم کو فارسی اور عربی لغات کو بھی نئے سرے سے ترتیب دینا ہے، انجمن نے حال میں جس قدر ترجمے شائع کئے ہیں، ان میں "تاریخ اخلاقِ یورپ" ایک قیمتی اضافہ ہے، تاہم وہ اپنی ادبی تبلیغ میں قاصر رہے گی، اگر تدوینِ لغات کے بارِ گراں سے سبکدوش نہ ہو سکی،

میں "دارالمصنفین" کو اس سلسلہ سے علیحدہ رکھنا چاہتا ہوں جو اپنے مختص النوع، عالمانہ مشاغل کے لحاظ سے "خاصہ کی چیز" (کلاسیکل) ہے، اس کا تخیل اس قدر اونچا ہے کہ میں نہیں جانتا بحیثیت موجودہ قوم کا دماغی افق کہاں تک اس کا ساتھ دے سکے گا، لیکن جس سطحِ فائقہ پر وہ لٹریچر کو لانا چاہتا ہے اس کا اقتضائے اضطراری یہ ہے کہ مذاقِ عام کی رعایت سے کوئی دوسرے درجہ کی حرکت نہ کیجائے، تاریخ الاسلام، قصص الاسلام، لغات الاسلام، ادب العرب، شعر العرب، ادب الہند، شعر الہند، دائرۃ المعارف (اردو انسائیکلو پیڈیا) اور جانے کیا کیا، "یک سر و ہزار سودا" بہتیری چیزیں ہیں جن کو آج ملک میں رفقائے دارالمصنفین کے سوا کون ہاتھ لگا سکتا ہے، متوکلین ادب، دل و دماغ صرف کر سکتے ہیں لیکن ضرورت ہے "الدین کے چراغِ زرپاش" کی جو حیدر آباد یا بھوپال کے جواہر خانوں میں نہ سہی، قوم کا کوئی گھر اس سے خالی نہیں! یہ خواب پورا ہو یا نہ ہو، مگر حصولِ آرزو کی حسرت بھی لذت سے خالی نہیں، یہ کیا کم ہے کہ ذکر تو آگیا،

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انجمن اردو کے خوابِ شیریں کی سب سے بڑی تعبیر "عثمانیہ یونیورسٹی" ہو سکتی ہے، یہی یونیورسٹی اگر قاعدہ سے چل نکلی تو آیندہ مسلمانوں کا پیمانۂ تقدیر ہوگی، انجمن اور دارالتراجم اسی یونیورسٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں، کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک طرف حیدر آباد کا جامعہ مشرقی مسلمانوں کا بڑے سے بڑا تخیل ہے، جس کی اس دنیا میں ان کو امید ہو سکتی ہے، دوسری طرف ان منتخب افراد کی (جو یونیورسٹی کے ارکانِ اساسی ہیں اور جنھوں نے اپنی زندگیاں ایک شریفانہ مشغلہ

کے لئے وقف کر رکھی ہیں)، دل شکنی اور تذلیل بے سبب کے لئے اغیار کی پوری قوت صرف ہوتی رہی،

آج ایک معمولی مہمان بھی آجاتا ہے تو اخلاق و شائستگی کا اقتضا یہ ہے کہ اس سے اچھی طرح پیش آئے، قوم کے ہونہار بچے جن کے بچپن کی لوریاں حیدرآباد کے حوصلہ افزا روایات رہے ہیں، اور جن کے لئے دولت آصفیہ "خواب طفلی اور آرزوئے شباب" کی حیثیت رکھتی ہے، کس قدر مایوس کن اثرات میں گھرے ہوئے ہیں، مشرقی اخلاق اور اس کے عوائد رسمیہ کا اقتضا تو کچھ اور تھا، خاصکر جب دارالتراجم کے افراد شاہی مہمان کی حیثیت رکھتے ہوں،

شرر اور ظفر علی خان گویا کھڑی سواری گئے اور واپس آئے، آجکل کے دور حریت میں فرمانروائے وقت کی مرضی کے خلاف کوئی خارجی مداخلت ایک غیر آئینی حرکت تھی، جس پر چوشتے کہ بعد از جنگ "کی طرح کف افسوس ملنا ہے،

کل کی بات ہے، علامہ نذیر احمد، حالی و شبلی دربار آصفیہ کے وظیفہ خوار تھے لیکن کبھی ان کی متفقہ قوت سے کام نہیں لیا گیا، ورنہ آج کم سے کم "قاموس الاسلام" کی ضخیم جلدوں کیلئے ہماری نگاہیں یورپ کی طرف نہ اٹھتیں،

اس فروگذاشت کی تلافی تو اب ہو چکی لیکن موجودہ وسائل سے بھی بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ کام لینے والوں میں سلیقہ ہو اور انجمن اور دارالتراجم کے اعزاز نفس کے خلاف کسی کو غیر ضروری جنبش لب کا موقع نہ دیا جائے، بہ حفظ مرتبت دونوں نظامات ادب (انسٹی ٹیوشن) کی وفاداری کی بہترین ضمانت ہوگا،

اور دنیا آگے چل کر دیکھ لے گی کہ "عثمانیہ یونیورسٹی" جو شہرت کے اعتبار سے آج بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ "صحیفۂ دکن" کے گھر کا گھروندا نہیں ہے کہ بنتا اور بگڑتا رہتا ہے، یہاں سید راس مسعود کی نسبت کچھ لکھنا نہیں چاہتا، ان کا درجہ اس سے بہت ارفع ہے کہ دوم درجہ کی غلغلت کو ان کے مقابلہ میں مخاطب کیا جائے، اس لئے اغیار کے خیالات و مقالات کا نظر انداز کرنا ان کے لائق ادب جد امجد کی سنت کی پیروی ہوگی، علی گڈھ کے گہوارۂ ادب کا آغوشِ شفقت ان کے لئے ہمیشہ کھلا ہوا ہے جہاں وہ اونچے سے اونچے پیمانہ پر مشغلۂ علمی جاری رکھ سکتے ہیں جس کے وہ بالطبع شائق ہیں،

(مشرق ۱۹۱۸ء)

حالی و شبلی

کی

معاصرانہ چشمک

جدّتِ موضوع چاہتی تھی کہ جہاں تک ہماری آخری بزم کا تعلق ہے اس لپیٹ میں کوئی چھوٹنے نہ پائے، لیکن افسوس ہے مواد ترکیبی کی کمی نے زیادہ پھیلنے کا موقع نہ دیا، اور گو "چشمک" کا دائرۂ اطلاق خالص حالی و شبلی کی شوخیِ قلم سے آگے نہیں بڑھتا لیکن میں ضمناً اوروں کا اندازِ طبیعت (کیرکٹر) بھی دکھاؤنگا، اور بکھرے ہوئے موتیوں کو جہاں جہاں سے ہاتھ آئیں گے، سلسلۂ بیان میں پروتا جاؤں گا،

سرسید کی "بزمِ ادب" بچے کھچے پرانے لائق پرستش بزرگوں کا گویا نچوڑ تھی، لیکن جس طرح خیمہ کے ساتھ طنابیں بھی اکھڑ جاتی ہیں، ان کے رفقا بھی ایک ایک کر کے آگے پیچھے ہم سے رخصت ہوتے گئے، ان کی نکتہ سنجیاں اور روشن خیالیاں بوڑھے غمزے اور لطائف و ظرائف، قدیم اسلامی سوسائٹی کے تبرکات تھے جن سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھے، اور اب ان اصحاب کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے، جنہوں نے جما جمایا نقشہ یعنی پچھلے پہر کا خواب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے،

ان میں سے ہر فرد اپنے اپنے دائرہ کا مالک تھا، اور مستقل ہستی رکھتا تھا، آج "وقار الملک" اور "محسن الملک" کی یادگار میں چند سطریں بھی کوئی لکھنے والا نظر نہیں آتا، اور "رجال العصر" کے سلسلہ میں ان کی ضمنی کھپت ان کا بہترین حق ہے جو ہمارے ہاتھوں ان کو مل سکتا ہے، میں ان دونوں لائق افراد کی زندگی کا وہ رُخ دکھانا نہیں چاہتا جس کے لحاظ سے کبھی یہ سالار جنگ اعظم کے نفسِ ناطقہ بنے ہوئے تھے، نہ محسن الملک کے اس کارنامہ کو یاد دلانا چاہتا ہوں جب ان کے قیام لندن میں وزیر انگلستان کو اعتراف کرنا پڑا کہ ہندوستان میں اتنا بڑا "عالی دماغ" موجود ہے، اسی طرح دونوں صاحبوں کی سیاسی اور قومی خدمات بھی میرے موضوع کیلئے حیثیت اضافی رکھتی ہیں لیکن یہ بات بھولنے کے لائق نہیں ہے کہ جہانتک سرسید کی ادبی تبلیغ کا تعلق ہے یہ دونوں گویا ان کے دست و بازو تھے، سرسید کے ساتھ "محسن الملک" کی نوک جھونک، ادبی راز و نیاز جس کا ایک خاکہ مراسلات دلچسپ میں دکھایا گیا ہے اور جس کے عالمانہ اور سخن گسترانہ شواہد مرحوم "تہذیب الاخلاق" کے سیزدہ سالہ فائل میں بکثرت ملیں گے، فتوحاتِ ادب کا بہترین سرمایہ ہیں جن پر مستقلاً اظہارِ خیال کی ضرورت ہے، میرے موضوع کے صفحات محدود ہیں ان کے پھیلانے کی گنجائش نہیں، یہاں صرف چشمِ سخن کے اشارہ پر قناعت کرنی ہوگی،

بہرحال کس کس کو یاد کروں محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، حالی، شبلی وغیرہ وغیرہ، سبھی سجائی محفل تھی جو دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہوگئی، "سرسید کی بزم ادب" ایسا وسیع موضوع ہے کہ اگر مولوی وحید الدین سلیم نے اپنی عمر ضائع نہ کی ہوتی اور سرسید

اوران کے رفقاء کے ساتھ جو وابستگی ان کو رہی ہے اور جس کے آثار "معارف" کے نقشِ اوّل ہیں بافراط موجود ہیں، وہ افسانہ یارانِ کہن کی حیثیت سے ایک ضخیم الاوراق اور نہایت دلچسپ کتاب تیار کر سکتے تھے، اگر یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی فوقیت کا راز دراصل اسکی پاکیزہ سوسائٹی میں مضمر ہوتا ہے تو "سیر الصحابہ" کی طرح علی گڈھ کی یہ آخری بزمِ ادب ہمارے لئے وقت کی چیز اور نتیجہ خیز رہی،

خیر! ان تصریحات کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹئے، سر سید نے ہمیشہ معاصرینِ ادب کی حوصلہ افزائی کی، ان کی با اثر شخصیت خاموش تصرف کے ساتھ دوسروں کی قلبِ ماہیت کرتی رہتی تھی، شبلی نے "مولویت" علی گڈھ میں پہنچکر چھوڑی، ان کے خیالات کی کایا پلٹ، مذاقِ تصنیف اور وسیع النظری غرض یہ جو کچھ ہوئے سر سید کے دامنِ تربیت کا اثر تھا، شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سر سید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی ان کی شرافتِ ادبی کا پتہ دیتا ہے، اسی طرح حالی کی نیچرل شاعری خیالات کے لحاظ سے سر سید کے فیضِ صحبت کی ممنون ہے، ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ حالی کی روشِ جدید نے پروفیسر آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل یعنی ان کے نتائجِ فکر سے کہانتک فائدہ اٹھایا، جن کو تاریخی حیثیت سے کم سے کم اولیت کا شرف حاصل ہے، مختصر یہ کہ متاخرینِ ادب کے ساتھ سر سید کا درجہ متناسبہ صرف مربیانہ تھا، اس لئے ایسی باوقار ہستی سے چشمک تو خیر اسکی کسرات بھی بمشکل ہاتھ آئیں گی،

پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور استادانہ دل و دماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہانتک معاصرین کا تعلق ہے "چشمک" کا گذر نہیں، ایک واقعہ دلچسپ اہلِ ذوق

کی ضیافتِ طبع کے لیے لکھتا ہوں، لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے، گو دماغ کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا، نذیر احمد ملنے کے لئے گئے، حالی اور غالباً شبلی بھی ساتھ تھے، نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا، جو چھپا ہوا اُن کے ہاتھ میں تھا، آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نذیر احمد نے یہ کہکر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے، کانفرنس میں پیش کرتا ہے، آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کر دی، نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوشِ محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں، ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک "بوڑھے بچہ" کی مشقِ سخن پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے،

"حالی" بھی آزاد کی استادی کا لوہا مانتے تھے، ان کی مخلصانہ عقیدت کیشی کیلئے وہ تقریظ و تنقید دیکھئے جو "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" پر حالی نے لکھی ہے اور جس میں ضمناً یہ طے کر دیا ہے کہ نیچرل شاعری دراصل آزاد کی صنعتِ فکر کا نقشِ اولین اور ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے، حالی لکھتے ہیں:-

"نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے، یعنی لٹریچر کے رقبہ کا طول و عرض بڑھ گیا لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا، یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی، لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی" نیرنگِ خیال" کی بہت کچھ داد دی ہے، کیونکہ آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذباتِ انسانی کی تجسیم و تشخیص کی، اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں، اور خصائلِ انسانی کے فطری خواص ایسے مؤثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں، جن سے اُردو لٹریچر

اب تک خالی تھا"

شبلی بھی آزاد کا ادب کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے "آزاد اردوئے معلی کا ہیرو ہے، اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے" تاہم ایک ہلکی سی چشمک لیجئے!

"ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے" اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ خود نشہ میں چور تھا، ایک عورت صاحب جمال (نور جہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی، اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی، وہ جو کچھ دیکھتا اس کے نور جمال سے دیکھتا تھا، اور جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک فرد کاغذ کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا، یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چونکہ دولت اسکے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا، اسلئے بدمست بھی نہیں ہوتا تھا جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا"

"تزک جہانگیری" کے ریویو میں شبلی فرماتے ہیں "آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے؟ ہمارے انشا پرداز نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آنے کا جو کارنامہ بتایا ہے وہ اس کی کتاب "تزک جہانگیری" ہے" اس کے بعد شبلی نے جو کچھ لکھا ہے، ناقدانہ اور سخن گسترانہ ہے، یعنی یہ ضرب چشمک کی ایک خوبصورت مثال ہے، جو عنوان زیر بحث کے تحت میں آسکتی ہے،

"شعر العجم" جس زمانہ میں لکھی جارہی تھی میں نے شبلی کو توجہ دلائی کہ آزاد کی تالیف

موعود پر نگاہ رکھے گا جو موضوعِ مشترک پر نکلنے والی ہے، وہ سمجھے میرا مطلب "سخندانِ فارس" سے ہے، ایک دوست کو لکھتے ہیں:-

"آزاد کا سخندانِ فارس حصہ دوم نکلا، سبحان اللہ لیکن الحمد للہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

مجھے تحریر فرماتے ہیں "آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم اِدھر اُدھر کی کہیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا، بارہویں میں یہ میدان میں اُترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا، یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔"

میں نے لکھا "میری غرض سخندانِ فارس سے نہیں، بلکہ آزاد کے تذکرہ شعراء سے تھی"، اس پر تحریر فرماتے ہیں "میں آزاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا تھا لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا، مجھ کو پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا، یہ جزئیات جو دکھا رہا ہوں خارج از موضوع نہیں ہیں، ان سے پتہ چلے گا کہ شطرنج کی اصطلاح میں بساطِ ادب کے یہ شاطر حریف آپس میں کس طرح کٹتے ہوئے تھے،

"نذیر احمد بھی تنقیص پسند نہیں تھے، انکی لے دے زیادہ تر سرسید پر رہتی تھی لیکن اس طرح کہ

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

خلوص تھا کہ حرف حرف سے ٹپکا پڑتا تھا، طبیعت میں مقلدانہ رنگ غالب تھا، اس لئے شروع شروع سرسید کے اجتہادات سے ان کو جھجک سی تھی جو رفتہ رفتہ گئی، اور اس طرح گئی کہ سرسید کے عقیدت کیشانِ باصفا میں یہ کسی سے پیچھے نہیں تھے، اور اس پر فخر

کرتے تھے، یہ فراخدلی جس کے شواہد ان کے لٹریچر میں کثرت سے نظر آئیں گے، سرسید تک محدود نہ تھی، اوروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا، ایک آدھ واقعہ استشہاداً لیجئے، علی گڈھ کے اسٹریچی ہال میں کانفرنس کی مقتدر جماعت کا اجلاس ہے، اطراف ملک سے پڑھے لکھے اور روادار لوگ آآکر جمع ہوئے ہیں خطیبانہ بلند آہنگی کے سلسلہ میں ایک آواز یوں گویا ہوتی ہے "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی، اب تو ایسا ذہول ہوگیا کہ مولوی "شبلی" ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں"۔ ان فقروں کا نکلنا تھا کہ اس زمانہ کے مولوی شبلی جو نئے نئے علی گڈھ آئے تھے ہزاروں نگاہوں کے نقطۂ شعاعی بنے ہوئے تھے، اور یہ انکی قابلیت کا پہلا اعتراف تھا جس کا اثر بجلی کی طرح ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گیا،

اسی طرح نذیر احمد لکچر سے پہلے کبھی کبھی اپنی نظم سنایا کرتے تھے، ایک موقع پر فرماتے ہیں:-

"جس طرح یحییٰ پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی منادی کرتے تھے کہ میرے بعد مجھ سے ایک بہت بڑا پیغمبر آنے والا ہے، اسی طرح میری نظم گویا نداے عام ہے کہ میرے بعد مولوی الطاف حسین حالی اپنی نظم پڑھیں گے، اور میں اپنی پندار انکی نظم کی رونق کا باعث ہوتا ہوں"۔ اخلاقاً ایک ہم عصر کی شاعرانہ فوقیت کے اعتراف کا یہ کتنا بلیغ اور خوبصورت پیرایہ ہے، !

اب میں نفس مطلب سے قریب ہوتا جاتا ہوں، یہانتک صرف بیانات اضافی تھے، اصلی کام "حالی" و "شبلی" کو باہم ٹکرانا ہے لیکن ترتیباً پہلے یہ دیکھئے کہ حالی نے شبلی کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں "چشمک" کا کوئی عنصر موجود ہے یا نہیں؟

"معارف" میں نامہ حالی و شبلی کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے، ان خطوں میں حالی شبلی کو جس خلوص اور حسن اشتیاق سے یاد کرتے ہیں، انکی ایک ایک تصنیف کا جس شوق و ذوق سے نام گناتے ہیں، وہ اس آرزو کے ساتھ کہ کوئی کتاب ان کی لائبریری کے آغوش میں جگہ پانے سے رہ نہ جائے، اخلاص کی آخری حد ہے، خط دیر سے ملتا ہے تو کہتے ہیں "اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کیا جو پیراہن یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا" جس خط کو دیکھئے درد و محبت اور ایک خاص طرح کی صدق مقالی جو بڑے بوڑھوں کا حصہ ہوتی ہے لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے، شبلی کے پاؤں کا واقعہ پیش آتا ہے تو گھبرا کر ان کے فرزند رشید یعنی "حامد شبلی" سے خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں، اور باوصف اس کے کہ آنکھوں نے جواب دے دیا ہے، قویٰ ہیں باقتضائے سن عام اضمحلال ہے، پھر بھی اعظم گڈھ کے سفر کی آمادگی ظاہر کرتے ہیں، یہانتک کہ "الندوہ" میں شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر حالی کو خیال آتا ہے کہ وہ مولانا (شبلی) کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کریں، اسلئے ایک رباعی موزوں کر کے بھیجتے ہیں کہ "الندوہ کے کسی آیندہ نمبر میں اسے بھی جگہ دیدیجئے گا"۔

"سیرۃ نعمان" جب شائع ہوئی تو حالی نے اسپر ریویو لکھا، فرماتے ہیں "انھوں نے (یعنی شبلی نے) اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپکو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں انکی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے، اور جہانتک میری نگاہ پہنچتی ہے "سیرۃ النعمان" کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں" کتاب کی ترتیب اصول استنباط اور طرز اجتہاد کے لحاظ سے شبلی کو حالی نے فاضل، ادیب، محقق، اور راگر

وہ منظور کریں تو منشی اور شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور دکھایا ہے کہ جس طرح حُسنِ تناسبِ اعضاء
کا نام ہے "سیرۃ النعمان" میں روایت و درایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے
اور قیاس سے کام لیا گیا ہے، اس طریقہ استدلال سے فلسفہ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور
مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں،

شبلی "دستۂ گل" ہدیۃً بھیجتے ہیں تو حالی جواباً لکھتے ہیں:-

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق
اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کا ہے کو ہیں شرابِ دو آتشہ ہے
جس کے نشہ میں خمارِ چشمِ ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی اور
بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر
خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں"

آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصودِ اصلی
یعنی "چشمک" کا اب بھی پتہ نہیں لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اصلی نکتہ سے قریب تر
ہوتا جاتا ہوں، اصولاً اخلاق کے ساتھ تھوڑی سی کج ادائی بھی ہو تو زیادہ اجاگر ہوتی
ہے، جو آنکھیں روشنی کی عادی ہوتی ہیں انکو تاریکی گراں گذرتی ہے، اسی طرح نفسِ انسانی کا
رُخِ روشن اسکے دوسرے رُخ کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے، اسلئے میری اضافی تصریحات بیکار
نہیں ہیں، بہرحال اظہارِ خلوص کی حد ہو چکی، اچھا اب موضوع یعنی "چشمک" کی مثالیں لیجیے،
"حیاتِ جاوید" میں ایک موقع پر حالی فرماتے ہیں: "اعلیٰ تعلیم کی حمایت کے جوش میں
"سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی

قائم کرنے کو وہ اپنی غلطی تسلیم کرتے تھے، اور اسی بنا پر شمس العلماء مولنا شبلی نے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میں اس غلطی کا جس کو سرسید ۶ - ۷ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کرچکے تھے ذکر کیا ہے، اور اس بنا پر کہ مغربی علوم وفنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعوی پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔"

"حالی" کہتے ہیں کہ "اگر مولنا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ انہوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے، اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشاء ظاہر کرنا ہے، حالی نے ایک ایک کرکے اعتراضات کی تردید کی ہے، اور نہایت تفصیل کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ شبلی کے اعتراضات[1] کا زیادہ تر حصہ خود سرسید کے خیالات سے ماخوذ ہے "چشمک" کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت نسبتی اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے اور جس میں ناقدانہ اظہار خیال کے سوا در پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے۔

یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ حالی کا شبلی کے ساتھ کیا رنگ تھا لیکن یہ شراب اب تیز ہوا چاہتی ہے، اب یہ دیکھیے شبلی کے خیالات ومقالات کا جہاں تک خوش صفات حالی کا تعلق ہے، کیا حال ہے، شبلی نے ابھی "المامون" نہیں لکھی ہے، یا لکھی ہے، لیکن

---

[1] جس مضمون کا حوالہ حالی نے دیا ہے رسائل شبلی کے طبع جدید میں اس کے دو ٹکڑے ہوگئے ہیں یعنی قدیم تعلیم اور تراجم جدید معلومات کے اضافہ کیساتھ وہ حصہ نکال ڈالا گیا ہے جس میں سرسید پر کچھ اعتراضات تھے۔

لکھنے سے پہلے حیاتِ سعدی پیشِ نظر ہے، ایک عزیز کو لکھتے ہیں: "ایک کتاب حال میں مولوی "حالی" صاحب نے لکھی ہے، اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے۔ "شیخ سعدی" کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانحعمری ہے، میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا، اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیجدیں۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے" لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شبلی جب خود تصنیفات کے مالک ہوئے تو حالی کے ساتھ یہ حسنِ ظن کہاں تک قائم رہا؟

"سوانح مولانا روم" میں شبلی یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں: "تمام اہلِ تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا، وہ "سعدی"، "عراقی" اور "مولانا روم" ہیں، اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے، اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں، اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں اسلئے مذاقِ حال کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دیجاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرائض کے بالکل خلاف ہے۔"

اگر تھوڑی کیلئے بھی یہ مان لیا جائے کہ شبلی کا روئے سخن "حیات سعدی" یا "یادگار غالب" کی طرف [illegible] تو چشمک کی یہ نہایت ہی چبھتی ہوئی مثال ہوگی جو ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے لیکن ایک نکتہ سنج پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہی طریقہ نمایاں طور پر "موازنہ انیس و دبیر" میں، اور ایک کافی حد تک "شعر العجم" میں اختیار نہیں کیا گیا؟ "کلیاتِ خسرو" جس کی تہذیب و ترتیب بزعم علی گڈھ آجکل کے معرکہ

ادب میں پیش پیش ہے، اور جس میں تنقید کے سلسلہ میں معاصرانہ کلام کا موازنہ کیا گیا
ہے، کہاں تک واقعہ نگاری کے خلاف "مذاقِ حال" سے بے نیازی کا دعویٰ کر سکتی ہے،
اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا حالی اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر تھے؟

"چشمک" کی دوسری مثال لیجئے،

"تذکرہ گلشن ہند" کے حاشیہ میں شبلی لکھتے ہیں: "مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان
کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے
لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں
ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ اثر کی مثنوی دیکھی تھی،
اور اس کا طرز اُڑایا تھا، یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں، اس کا فیصلہ خود ناظرین کر
سکتے ہیں، کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

اسی طرح جیسا کہ دیباچہ "گلزار نسیم" کے حاشیہ ذیل میں تصریح کی گئی ہے، شبلی نے لائق
"چکبست" کو لکھا تھا کہ "گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بیرحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے"
میں اس کے متعلق خود کچھ لکھنا نہیں چاہتا، مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی ہوئی
سیاہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے، جس طرح ناممکن ہے کہ کسی ٹکسالی
(اسٹینڈرڈ) کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو، یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی
پاسداری میں شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں، یعنی "چشمک" کے جراثیم ان کے مقدمات
میں اس کثرت سے ملیں گے کہ یہ امر ان کے لٹریچر کے نقائص کا ایک جزو ہو گیا ہے،
پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کے تاک میں رہتے ہیں، اور اظہار خیال سے کبھی نہیں

چوکتے لیکن ہیں اگر غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں، یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی،

یہاں تک تو "چشمک" کی صرف نرم مثالیں تھیں یعنی تلخ گوییاں غلاف شکر میں، اب ذرا قوی تر شواہد لیجیے، مناقب عمر بن عبد العزیز کے ریویو کے سلسلہ میں شبلی فرماتے ہیں،

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا وہ تنقید ہے، یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول و فعل پر نکتہ چینی نہیں کی، لیکن یہ اس زمانہ کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے"

اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"مصنفین اسلام آجکل کے فریب دہ طریقوں سے بالکل آشنا نہ تھے، آجکل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لئے ہیرو پر نکتہ چینی کی جاتی ہے، لیکن اس طرح کہ محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے جاتے ہیں، پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دیئے جاتے ہیں، جس سے در اصل مداحی کو اور قوت دینی مقصود ہوتی ہے، کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے، اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے، ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی، یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے، اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانحعمریوں کا یہی انداز ہے، لیکن یہ طریقہ

قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابلِ اعتراض بلکہ خطرناک ہے، قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور خداعی ہے، جو واقعہ نگاری سے بمراحل دُور ہے۔"

یقیناً ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ شبلی کا روئے سخن کس کی طرف ہے، اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانحعمری سے ممدوح کا مقصود کیا ہے؟ شیش محل میں بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی لیکن کیا دانائی بھی ہے؟ اس کا جواب صفحاتِ زیر تحریر میں مل جائیگا لیکن جلدی نہ کیجیئے اور لیجئے! مآثر رحیمی کے ریویو میں ارشاد ہوتا ہے،

"اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ "خان خانان" کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آجکل کے مذاق کے موافق سوانحعمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے لیکن اس طریقہ کو ہم آجکل کے پُرفریب طریقہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کرکے بھی سوانحعمری کی بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کرکے لکھا جاتا ہے تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے یعنی جب عیب نہیں چھپایا ہے تو محاسن کیوں غلط لکھے ہونگے، بہتر سے بہتر سوانحعمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے اس طریقہ کی عمدہ مثال ہے، ابھی اور لیجیئے،

موازنۂ انیس و دبیر میں اسی خیال کا اعادہ یوں کیا گیا ہے:۔

"ہمارے زمانہ میں جو سوانحعمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعویٰ آزادی کے

تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا، اور اس کا یہ عذر کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں لیکن عذر کرنیوالے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں جس چیز نے ان کو اظہارِ حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا، اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی، اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں، اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔"

اخلاقی حیثیت سے مولانا کی نگاہ جس نکتہ پر بار بار پڑتی ہے، اس کے اہم نتائج سے کون انکار کرسکتا ہے، آپ دیکھیں گے ابھی تک اظہارِ خیال پر ایک نقاب پڑی ہے، مگر یہ نقاب اس قدر ہلکی ہے کہ بار بار ستاروں سے چھن چھن کر چشمک کی شوخیاں آپ کے ذوقِ پردہ دری کو اکسائیں گی لیکن ذرا ٹھہریے، اس کا حسنِ عریانی دیکھنے کے لائق ہے یعنی اس وقت تک تصریحات کی جگہ صرف اشارات و کنایات تھے، اب صاف صاف لیجیے "شبلی" کہتے ہیں:۔

"حیاتِ جاوید" میں مولانا (حالی) نے "سید صاحب" کی یک رُخی تصویر دکھائی ہے، اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بدطینتی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں، پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے، سوائے اس کے کہ وہ

محض دعویٰ کرتے تھے، واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے، بہر حال "حیاتِ جاوید" کو مدلّل مدّاحی سمجھتا ہوں"

اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی، ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں :-

"اختلافِ آرا بھی کیا چیز ہے" حیاتِ جاوید" کو میں لائف نہیں سمجھتا، بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل خیر الناس فیما یعشقون مذاہب"

یہاں یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "آجکل کا پُر فریب طریقہ سوانح نگاری" جو شبلی کے خیال میں ایک طرح کی اور مدّاحی" ہے اور جس پر بار بار بے چینی کے ساتھ زور دیا گیا ہے، دراصل حالی کی ایجاد ہے یا شبلی کی تصنیفات بھی اس دائرہ میں آجاتی ہے، تاریخی تنقید کا یہ ایک نہایت نازک نکتہ ہے، جس پر مولانا نے اگر مزید روشنی ڈالی ہوتی تو دُنیائے ادب کے لئے ایک جدید انکشاف ہوتا،

اسی طرح "حالی" کی یہ صنعت گری جہاں یورپ کے طرزِ تحریر سے ماخوذ بتائی گئی ہے، شبلی یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس پُر فریب طریقہ سے جو ایشیائی شاعری سے ملتا جلتا ہے" موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں گی" لٹریچر کی طرف سے مولانا کی اس فی الوقت دقیقہ رسی اور جوشِ التفات کا شکریہ لیکن ایک نکتہ دان یہ سوال کر سکتا ہے کہ جس خطرے کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے، اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے جس میں محاسن کے ساتھ معائب ابھار کر دکھائے گئے ہوں، کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرۃ (لائف) کی حیثیت سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں وہ اکثروں کے دائرہ نظر میں ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ

"حیاتِ جاوید" کی طرح کسی کتاب سے مولانا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں، یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں "یکے از اقوام جرائم پیشہ" یا "باب الاشرار" کے عنوان سے کسی شخص کے حفظِ غیب کا غیر ضروری خاکہ اڑایا گیا ہو،

ایک ادیب معارضہ بالمثل کی حیثیت سے پوچھ سکتا ہے کہ بلحاظِ فن حالی کے جس اقتصار کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے، خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے، یعنی المامون، سیرۃ النعمان الفاروق، اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں، اس کا جواب مجھے خوف ہے، غیر امید افزا ہوگا، کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے، جو ایک نکتہ سنج مؤرخ کے قلم سے ہو سکتی ہے، کیونکہ عظمت خود "ملک کے سب سے بڑے مؤرخ" کے خیال کے مطابق واقعات کو بدل نہیں سکتی،

بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ "حیاتِ جاوید" کے لیے حالی کی طرف سے اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں، ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگذشت لکھی، اور آشنائے فن ہو کر لکھی، اور یہی اونچے سے اونچا معیارِ تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے،

یہ قطعی ہے کہ "حیاتِ جاوید" کا رئیس التذکرہ فرشتہ نہیں تھا، انسان تھا لیکن

اس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطراری لغزشوں پر جنہیں انسانی کمزوری سمجھے
غالب تھی، یہی مابہ الامتیاز ہے جس کی بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص
کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے، سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی
کو اس قدر اصرار ہے، اور جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے
کام نہیں لیا، دراصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق
کی تکمیل ناممکن ہے، لیکن اس قسم کی اضافی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور
تنقیصی پہلو کا اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی محاسن دب جائیں بالکل ایسا ہی ہوگا
جس طرح "ندوہ" کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے
جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہیں ہوگا، اور جسے شبلی کی علمی "نفسیت"
(سائیکالوجی) سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ غور طلب ہے کہ "غالب" کی طرح "شبلی" کی افراط خودداری معاصرانہ کمالات
کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے، شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک
نہ آیا، حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں، جنہوں نے دورِ جدید میں مذہب کو معقولات
عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی، اور یہ امر بلا اختلاف ان کی اوّلیات میں
محسوب ہونے کے لائق ہے، ہم کو مصر کے مذہبی لٹریچر کی اوقات معلوم ہے،
اس لئے مصطلح جبہ و دستار کی فضیلت سے اگر قطع نظر کر لیجئے، تو سرسید اور
ان کے رفقاء نے جو کچھ لکھ دیا ہے مشکل سے اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے، اور
یہ سرسید کے اختراعی دماغ اور ان کے زبردست اجتہاد کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ

عدم اعتراف دراصل لٹریچر کی خوش ظرفی ہوگی، میں یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں
چاہتا کہ عقائد کو جو جذباتی چیز ہیں معقولات سے بھڑانا جن پر ہمارے متکلمین کو اس
قدر ناز ہے، دراصل کہاں تک "گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" کا مصداق ہے،
میرا منشا صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت لکھا گیا یا آیندہ لکھا جائیگا
وہ محض سرسید کے قلم کی آواز بازگشت ہوگی، یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ
حالی کے ہیرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر "چشمک" کیوں ہے، کیا یہ جامع حیثیات
شخصیت شبلی کے نامورانِ اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ یا جس طرح
ایک خوبصورت عورت دوسری پرکالۂ آتش کو دیکھ نہیں سکتی، دراصل جذبۂ
رشک اس کی تہ میں ہے، ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے
مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ حالی ہیں، اور اس
میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے "سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف نہیں لکھدی"
بلکہ یہ اردو لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہوگیا، لیکن کیا شعر العجم
کے مصنف کو بھی اس پر رشک کرنا چاہیئے، اس کا جواب آگے چل کر تاریخ دیگی،
نہ جاننا بھی کبھی جاننے سے زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے، اس لئے سر دست میں اس
لطف کو کھونا نہیں چاہتا،

لیکن شعر العجم کے ساتھ جو ایک ذوقی چیز ہے میری بڑھی ہوئی حسن عقیدت
اس موازنہ کو جائز نہیں رکھے گی، اس لئے حیات جاوید کے مقابلہ میں شبلی کی صرف
ان تصنیفات کو رکھئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جنس مشترک کی حیثیت رکھتی

ہیں، آجکل کی عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) کی نزاکتیں شایستہ سوسائٹی میں مواخذا و صاف
کو جائز نہیں رکھتیں لیکن مصنفین کے دماغوں کی رگڑ، فن تنقید کا ایک سخن گسترانہ
فرض ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، اس لیے جہاں تک کے عقدہ ہائے سربستہ
جن میں حالی کے مقابلہ میں لائق مصنف شبلی کا پہلو کچھ دبتا ہوا سا ہے کھلے ہوئے راز
کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں،

قبل اس کے کہ میں اسے ختم کروں ایک فقرہ معترضہ بار طبیعت ہو رہا ہے،
جس سے اسی سلسلہ میں نپٹ لینا چاہتا ہوں، چونکہ اس کے متعدد نظائر جہاں تک

لہ میرے مخاطب صحیح وہ حضرات نہیں ہیں جو تنقیص و تنقید میں امتیاز نہیں کر سکتے، یا کرنا نہیں چاہتے،
نہ جاننا جہل، چنداں لائق اعتراض نہیں لیکن یہی نہ جاننا کہ نہیں جانتے (جہل مرکب) قطعاً لائق
معافی نہیں، ایک نیاک نے حال میں لکھا تھا کہ شعر العجم پروفیسر براؤن کی "لٹریری ہسٹری آف پرشیا"
کا سرقہ ہے، شاید لکھنا یہ منظور ہوگا کہ براؤن کی کتاب سے ماخوذ ہے لیکن غریب کو معلوم نہیں کہ براؤن
نے فارسی شاعری کی تاریخ نہیں لکھی بلکہ در اصل وہ اسلامی لٹریچر کی دماغی تاریخ ہے، ایران سے
جو تعلق ہے یہ ہے کہ براؤن ان مصنفین کو الگ کرتا گیا ہے جو اسلام کے ہر دور میں خاک عجم
سے وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے ہیں، اس میں شعراء کا ذکر ضمناً آیا ہے، وہ بھی تاریخی حیثیت سے، ذوقی اور
جذباتی حیثیت سے نہیں کہ براؤن کے بس کی بات نہیں تھی، شعر العجم کا موضوع بالکل جداگانہ ہے،
ہماری زبان پر "فلسفہ"، "ارتقا" اور جانے کیا کیا بے سوچے سمجھے اس بری طرح چڑھ گیا ہے کہ ذخیرہ
معلومات میں تو کچھ اضافہ ہوا نہیں لیکن ان الفاظ کی رہی سہی آبرو بھی جاتی رہی جس ملک میں تنقید
عالیہ (ہائر کریٹی سزم) کا مفہوم صحیح اچھے خاصے پڑھے لکھے نہ سمجھ سکتے ہوں، میں نہیں جانتا شعر العجم
کی نزاکتیں کس طرح ان کے ذہن میں داخل کی جائیں، مجبوراً میں اسی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں جس سے
اوروں کو باز رکھنا مقصود تھا، اور یہ کو کہنا پڑتا ہے کہ شعر العجم تذکرہ شعرا نہیں بلکہ جہاں تک شاعری کی ماہیت

گنجائش تھی بہم پہنچائے گئے ہیں، وراثتِ طبعی کے اثر سے اس کا سلسلہ اور بڑھتا ہے،
ایک زاویۂ علمی کا نوجوان "سید الطائفہ" جسے آگے چل کر نظامِ ادبی کا ایک قوی تر عنصر ہونا
ہے، ایک غیر متعلق تصنیف کے سلسلہ میں یوں اظہارِ خیال کرتا ہے :-

"مولوی نذیر احمد بھی اس گناہ کے مجرم ہیں جس قلم نے مرآۃ العروس، بنات النعش،
توبۃ النصوح، ابن الوقت اور ایامیٰ لکھنے میں زندگی بسر کی ہو، وہ الفرائض، اجتہاد،
ترجمۂ قرآن، امہات الامۃ کے لئے سنجیدگیٔ عبارت، متانتِ کلام، اور ثقاہتِ
بیان کہاں سے لائیگا، مقصود یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور بزرگانِ دین کی تاریخ کے
لئے سنجیدگی چاہیئے، شوخ اور ظریفانہ عبارت اور سخیف محاورات موزوں نہیں"

یہ مولوی نذیر احمد کون ؟ وہی جن کا تصنیفی نام عوام میں "ڈپٹی نذیر احمد" ہے، آیا!

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۹) نفسی کا تعلق ہے، اس کی ارتقائی تاریخ ہو (دیکھئے "ارتقاء" زبان پر آ ہی گیا)
جس طرح ماضی حال کا باوا اور مستقبل کا دادا ہے، بعینہٖ دنیائے ادب میں بھی یہی ترتیبِ عمل جاری
ہے، متقدمین نے متوسطین اور متوسطین نے متاخرین پیدا کئے، بالفاظِ غیر سعدی، حافظ، فردوسی اور
خیام جس زمانہ میں ہوئے اور جو کچھ ہوئے اسی زمانہ میں ان کا ہونا گویا ناگزیر سا تھا، اسی طرح ان کے
کلام کی عصری خصوصیات، در اصل ان کے کمالِ اجتہاد سے زیادہ وراثتِ ادبی کے قدرتی نتائج ہیں،
شعر العجم نے اسی طلسم کی عقدہ کشائی کی ہے، لیکن یہ باتیں ابھی نصف صدی کے بعد ہماری سمجھ میں آئیں گی،
اس وقت تک اس کتاب پر اظہارِ خیال ملتوی رہتا تو اچھا تھا،
شبلی تو لیا برادران کا خاکہ اڑا دینگے لیکن ایک صاحب نے علی گڈھ میں بیٹھ کر ڈنکے کی چوٹ شاعری جیسی جاہلیت
کے ساتھ اظہارِ خیالی کی ٹھہرائی، ایڈیٹر معارف کے سنجیدہ قلم کو اعتراف کرنا پڑا کہ گویا "شعر العجم" سے،
ایک چھوٹے سے لفافے کے زہر کو دیکھئے گا جس کا تریاق ایک دفتر میں بھی نہیں ہو سکتا،

آقائے اُردو، علامہ نذیر احمد ایل، ایل، ڈی ، جو ملک میں السنۂ مشرقیہ کا سب سے بڑا ادیب تھا، جس کی عربیت اس پایہ کی تھی کہ سخت سے سخت منحرف بھی اس کا لوہا مانتے تھے، اور اس کے تبحر علمی سے مرعوب رہتے تھے جس نے اُردو سی کم مایہ زبان کو اپنے خاص طرزِ ادا اور زورِ فصاحت سے ایسا کر دیا کہ آیندہ دُنیا اس پر ادب العالیہ (کلاسیکس) کا اطلاق کرے گی جس کی طبیعت میں قدرت نے عربی کا مذاق اس لیے رکھا تھا کہ وہ عرب کے صحیفۂ آسمانی کا قالب بدل سکے، پہلے ترجمۂ قرآن کا یہ رنگ تھا:۔

"مستی نکالیتاں اور یار کرتیاں چھپ کر"

اب وہ شستہ رفتہ اور فصیح اردو کا ایسا مرقع ہے جس پر انشا پردازی ناز کرسکتی ہے، نذیر احمد نے مرآۃ العروس کے سوا اگر کچھ نہ لکھا ہوتا جب بھی انکے کمالِ انشاپردازی کے ثبوت کے لیئے یہ اکیلی کتاب کافی تھی، ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اس وقت ایک گراں پایہ مصنف تھے، جب ہمارے لائقِ ادب بزرگوں میں بہتیروں نے قلم ہاتھ میں لئے تھے، رہی ان کی ظرافت جو اُن ہی کا حصہ ہے، اور جسے آپ کھانے میں نمک سمجھئے، اور میں لٹریچر کے چہرے کا تبسم کہونگا، جو نئی تحقیقات کے مطابق صرف خوش ادائی نہیں، بلکہ اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ کامل صحت کی دلیل ہے،

صرف ایک مثال لیجئے! نزولِ قرآن کے سلسلہ میں "نذیر احمد" اپنے فصیح لکچر میں ایک جگہ کہتے ہیں:۔

"جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے، وہ ایک وقت تھا کہ عربی لٹریچر کے جوبن پر ایک بہار آرہی تھی، لوگوں میں یہ مادہ ایسا برسرِ ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاقِ شعری سے خالی نہ تھا، یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا، یوں بھی عرب کو اپنی بولی پہ بڑا ناز تھا، انہوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا "عجم" یعنی گونگے یا جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں، ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کہی جاتی، مگر وہ ہوتی حلیۂ فصاحت سے عاری! تو ان کے کان پہ جوں بھی نہ چلتی، یہیں ضرور تھا کہ اسی داؤ سے ان کو پچھاڑا جائے جو ان کو خوب رواں تھا یعنی "فصاحت"، قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے "سید" "محسن الملک"، "سید محمود" اور "حالی"، "شبلی" تھے سب کے چھکے چھوٹ گئے"

یہی بلاغت ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ انشا پرداز کا ایک فقرہ ہزار دل علمی اور تاریخی اوراق پہ بھاری ہوتا ہے، اور یہی تصرفات ہیں جن کے لحاظ سے ایک ادیب کو بڑے سے بڑے فلسفی اور مورخ پر ہمیشہ ترجیح رہے گی،

یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانہ میں "حیدرآباد دکن" کے "بسمارک" کو "نذیر احمد" کا شیدائی بنا رکھا تھا، "سر سالار جنگ" اول اسٹیٹ ڈنر پہ ہیں، طلائی قابوں کا دور چل رہا ہے، چھری کانٹوں کی دھیمی موسیقیت ہیں دفعتہً سرکاری ڈاک کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے "نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے"، ایک منٹ کے بعد جلیل القدر میزبانِ شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے، برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائقِ ادب

امیر الامراء کی نگاہ نقوشِ حرفی پر دوڑ رہی ہے، اور چہرے پر رہ رہ کر وہ
کیفیت طاری ہوتی ہے جیسے تبسم زیرِ لب کی ہلکی لہریں کہئے، نذیر احمد کے
خوانِ ادب کا یہ وہ لقمۂ تر تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی،
لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے، جسے ہم اگلنا چاہتے ہیں، مگر یہ
بے تکی روایات ثقاہت کے لحاظ سے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی، ادب چاہتا ہے
ان کا کمالِ انشاپردازی غیر شائستہ جنبشِ لب سے ہمیشہ بے نیاز رہے گا،

آخر میں مجھے ایک نکتہ صاف کرنا ہے، ابھی حالی کے ساتھ شبلی کی چشمک کے
جو شواہد پیش کئے گئے ہیں، ان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ شبلی کو حالی سے
خلوص نہیں تھا، شبلی حالی کو ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے، فرمایا کرتے
تھے کہ جب تک مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی
کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں، ان کی دقیقہ رسی اور نکتہ سنج طبیعت ایسی
جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا، اور یہ کمالِ
اجتہاد کی دلیل ہے"

پانوں کے واقعہ کے بعد شبلی کو حالی نے وفورِ جوش میں جو رباعی لکھ کر بھیجی
تھی، اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، شبلی "الندوہ" میں "مولانا حالی کی ذرہ نوازی" کے
عنوان سے یوں رقمطراز ہیں :-

"مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے،
وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں، لیکن میری عزت

یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں،
اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے،
خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔"

بہر حال "چشمک" جو کچھ بھی ادبی حیثیت سے تھی، رنج کے تعلقات دونوں
صاحبوں کے اتنے ہی خوشگوار تھے جتنے باوصف اختلاف وکلا کے مقدمہ
کے اجلاس سے باہر ہوا کرتے ہیں، ان چند صفحوں میں خصائص فنی کے مختلف
رُخ سامنے آ گئے ہیں، ورنہ میری غایت محض تنشیطِ ادب یعنی احباب کی
دماغی تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اس حیثیت سے اُردو لٹریچر میں غالباً
یہ ایک نیا مضمون[1] ہے۔

(معارف ۱۹۱۹ء)

---

[1] اس مضمون میں جس قدر اقتباسات لئے گئے ہیں، ان کے لئے اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ
(سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی، اور شبلی) کا پورا دفتر پیش نظر تھا لیکن افسوس ہے کہ سلسلۂ اقتباس
میں میں نے صفحات متعلق کے حوالے محفوظ نہیں رکھے، ختم کرنے کے بعد اس کا خیال آیا، اب یہ
ایک دردسری تھی جسے کسی طرح گوارا نہیں کر سکا، تاہم میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس پیوندکاری
میں میں نے کہیں سے کوئی تصرف یا اضافہ نہیں کیا ہے، اور جس قدر اجزا جہاں جہاں سے
لئے گئے ہیں، علامات اقتباس میں بجنسہ پیش کر دیئے گئے ہیں، جن میں کوئی گھٹ بڑھ نہیں
ہونے پائی ہے،

اردو کے ایک نامور ادیب کی وفات

(از شمع جناب مولوی عبدالماجد صاحب بی اے مؤلف فلسفۂ جذبات)

ہر زبان کے بعض ادیب و انشا پرداز ایسے ہوتے ہیں جن کا رقبۂ تحریر گو محدود و مختصر ہوتا ہے، تاہم ان کا وجود اس زبان و ادب کے لئے مایۂ ناز ہوتا ہے،

ایم مہدی حسن (افادی الاقتصادی) کے نام کے ساتھ آج "مرحوم" لکھتے ہوئے قلم کا جگر شق ہوا جاتا ہے، اسی قبیل کے بزرگوں میں سے تھے، شاید ابھی تک بہت کم لوگوں کو اطلاع ہوگی اردو کا یہ نامور ادیب ۱۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو ہمیشہ کے لئے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؀

مرحوم نے کوئی مستقل تصنیف یا تالیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی ہے، ایک زمانہ میں جرمن مستشرق، وان کریمر کی "تاریخ اسلام" کا اردو ترجمہ شروع کیا تھا، اور کچھ اجزا مخزن (لاہور) میں شائع کئے تھے، مگر تمام کرنے کی نوبت نہ آئی، مرحوم کی تصنیفی زندگی کی کل کائنات وہ چند مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً صلائے عام (دہلی)، نقاد (آگرہ) علی گڑھ منتھلی اور معارف (اعظم گڈھ) وغیرہ میں تحریر فرماتے تھے، ان مضامین کا مجموعہ گو حجم میں قلیل ہے لیکن ادبیت میں اسی نسبت ممتاز و بلند ہے،

جناب "مہدی" ادب و انشا کا ایک غیر معمولی ذوقِ سلیم لے کر آئے تھے،

سرکاری ملازمت کے ہجوم افکار میں بھی ان کا ذہن جدید الفاظ و جدید تراکیب کی
وضع و تراش میں لگا رہتا تھا، فارسی، انگریزی اور اُردو کے پاکیزہ لٹریچر کے عاشق
تھے، ان کا کتب خانہ ان تینوں زبانوں کے بہترین لٹریچر کا عطر تھا، اُردو طرزِ
انشا میں کسی کے پیرو نہ تھے، خود ایک مخصوص طرز (اسٹائل) کے موجد تھے، جو
بظاہر ان ہی کے ساتھ ختم بھی ہو گیا،

قاموس الاسلام، فلسفۂ حسن و عشق، نقد شعر العجم، حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک،
شبلی سوسائٹی، ادبِ اُردو کے عناصر خمسہ وغیرہ ان کے مضامین ادب اُردو کا مذاق
صحیح رکھنے والوں کی نظر میں ایک مستقل زندگی رکھتے ہیں، جو وقتی مقبولیت و ہنگامی
گرمجوشی سے بلند و برتر ایک شے ہے، اُردو نثر نویسوں کی صف اوّل میں عموماً
ایسے حضرات نکلیں گے جنہوں نے اپنا اصل موضوعِ تحریر تاریخ یا فلسفہ یا معلومات
رکھا ہے اور ادب سے محض چاشنی کا کام لیا ہے، لیکن مرحوم مہدی خالصۃً
ادب کے شیدائی تھے، ان کی تحریریں اس شے کا نمونہ ہوتی تھیں جس کیلئے انگریزی
میں بھی کوئی موزوں لفظ موجود نہیں، البتہ فرنچ میں اسے بل لیٹر" کہتے ہیں، اُردو میں
خود مہدی مرحوم اسے ادبِ عالیہ کہتے تھے،

مرحوم اُردو کے تمام مشاہیر مصنفین سے تعلق و نیاز رکھتے تھے، مولانا شبلی
کے ساتھ یہ تعلق خاص طور پر گہرا تھا، ادھر سے بھی ان کے ساتھ دلی شیفتگی تھی فرمایا
کرتے تھے کہ نئے لکھنے والوں میں ادبی حیثیت سے کوئی مہدی کے پاسنگ برابر
بھی نہیں، ایک مکتوب میں انکے ایک مضمون کی داد ان لفظوں میں دیتے ہیں :-

"کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرہ بھی لکھنے نصیب ہوتے"

(مکاتیب شبلی جلد ۲ صفحہ ۲۵۹)

ایک دوسرے مکتوب میں ان کے ایک اور مضمون کا ذکر کر کے فرماتے ہیں :-

"مضمون دیکھا، نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے، حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے، کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھلاتا رہا" (ص ۲۳۵)

جو لوگ مولانا شبلی کے معیارِ نقد کی بلندی سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے قلم سے ایسی داد کا نکلنا کتنی بڑی بات ہے،

مزاج میں لطافت و نفاست حد سے زیادہ تھی، کاغذ، کتاب، لباس، غذا، ہر شے اعلیٰ سے اعلیٰ چاہتے تھے، بیش قیمت سوٹ پر خفیف سی شکن بھی گوارا نہ ہوتی تھی، کتاب خریدتے تو اس کی جلد بندی میں وہ اہتمام کرتے جو خود مصنف سے بھی نہ بن پڑتا، آمدنی کا بیشتر حصہ ان ہی تکلفات کی نذر ہو جاتا، مکان کی ایک ایک چیز خوش سلیقگی و نفاست کا نمونہ ہوتی تھی، اربابِ ذوق کے لئے ان کے مضامین سے بھی بڑھ کر قیمتی ان کے خطوط ہوتے تھے، ایک ایک سطر ادب و انشا کی جان ہوتی تھی، اپنی بصیرت و علم کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ دورِ موجودہ کے ادیبوں میں شاید بلا استثنا کسی کے بھی

خطوط اس قدر دلچسپ و پُر لطف نہیں ہوتے تھے، جن خوش نصیبوں سے سلسلۂ مراسلت قائم تھا وہ شوق و اشتیاق کے ساتھ جدید مکتوب کے منتظر رہتے، اور پچھلے گرامی نامہ سے ہفتوں لطف اندوز ہوا کرتے،

وطن گورکھپور تھا، زیادہ تر الٰہ آباد میں ملازم رہے، اب ادھر کئی سال سے ضلع کانپور کی ایک تحصیل میں تحصیلدار تھے، انگریز افسر نے انگریزی دانی کی بارہا داد دی، جرمنی کے شاہزادۂ ولیعہد جب سیاحت کے لئے ہندوستان وارد ہوئے ہیں تو الٰہ آباد میں ان کے قیام وغیرہ کے انتظامات میں مرحوم مہدی نے بھی کام کیا، اور حسنِ خدمت اور خوش سلیقگی کے اعتراف میں ایک طلائی تمغہ بھی جرمنی شہزادہ کے ہاتھ سے پایا،

صحت کا بہت خیال رکھتے تھے، بیمار شاذ و نادر ہی ہوتے تھے، گذشتہ اگست میں بیمار ہوئے، سوءِ تنفس و ورمِ جگر تجویز ہوا، ستمبر سے لکھنؤ میڈیکل کالج میں علاج کے لئے مقیم ہوئے، درمیان میں طبیعت بہت سنبھل گئی تھی، ۱۶ نومبر کو یعنی وفات سے چھ روز پیشتر میں ملا تھا، اس وقت بہت افاقہ تھا، البتہ ضعف بے انتہا تھا، حسب معمول خندہ روئی و زندہ دلی کے ساتھ مختلف ادبی، قومی، ذاتی معاملات پر گفتگو فرماتے رہے، معارف و دار المصنفین کے حالات تفصیل سے پوچھتے رہے، مولانا سید سلیمان، مولوی عبد السلام مولوی عبد الباری ندوی، ایک ایک کے حالات بڑے اشتیاق سے

دریافت کئے، دورانِ گفتگو میں کہا کہ "بعد صحت سب سے پہلے اعظم گڈھ ہی کا قصد کروں گا" اس وقت یہ کسے خبر تھی کہ ایک ہفتہ کے اندر سفرِ آخرت درپیش ہو جائے گا،

عمر پچاس کے اندر تھی، اور صورۃً چالیس سے زائد نہیں معلوم ہوتے تھے، امید تھی کہ پنشن کے بعد ساری فرصت اردو ادب کی خدمت گذاری میں صرف کریں گے، قبل اس کے کہ یہ فرصت نصیب ہو، خود کشمکشِ حیات ہی سے فرصت حاصل ہو گئی، آہ، جس وقت یہ خیال آتا ہے کہ کل تک جو جسم زیبائش و آراستگی کی تصویر تھا، اور جس کی ایک ایک سانس لطافت و نفاست کی عطر بیزیوں میں بسی ہوئی تھی، وہ آج ایک تیرہ و تار گڑھے میں، ایک مہیب تودۂ خاک کے نیچے دبا پڑا ہوا ہے، تو ہم غافلوں کا بھی دل عبرت سے لرز جاتا ہے،

لیکن نہیں! جو اس وقت زیرِ زمین ہے، وہ مہدی کا اترا ہوا محض ایک جامۂ کثیف ہے، اور خود مہدی اپنے جوہرِ لطیف کے ساتھ گلگشتِ جناں میں مصروف ہے،

مرنے والے مہدی الوداع! اور ایک نا معلوم مدت کے لئے الوداع! تیری زندہ دلی، تیری بذلہ سنجی، اور تیرا خلوص زندگی میں دوسروں کے لئے سامانِ لطف و انبساط تھا، مرنے کے بعد تیری نیکیاں، تیری

خوبیاں، اللہ کا فضل و کرم تیرے حق میں آیۂ رحمت و مایۂ انشراح ثابت ہوں،

صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

(منقول از ھمدم لکھنؤ)

قطعاتِ تاریخ رحلت

نتیجہ طبع وقاد جناب معلی القاب نواب حاجی سید محمد جعفر علی خان صاحب بہادر رئیس اعظم شمس آباد ضلع فرخ آباد

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۔ اِنَّهٗ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ

۳۱ ۵۶۶ ۹۰ ۲۵۳ ۶۶ ۔ ۵۶ ۲۵۸ ۲۰

۱۰۰۶ ۔ سنہ ۱۳۴۰ھ ۔ ۳۳۴

قطعہ

نثارِ اردو، شوخ طبع و خوش مزاج ۔ شیریں زبان، معجز بیان، دانائے فن

بستِ ربیع اوّل امسال شد ۔ زیبِ جناں، رنگین سخن، مہدی حسن

۱۹ ۱۰۴ ۳۳۰ ۷۱۰ ۵۹ ۱۱۸

سنہ ۱۳۴۰ھ

قطعہ

نثارِ اردو، نکتہ رس، پاکیزہ دل، عالی دماغ ۔ شیریں زبان، معجز بیان، دانائے فن نیکو اساس

بستِ ربیع اوّل و ماہِ نومبر بست و یک ۔ زیبِ جناں، رنگین سخن، مہدی حسن، معنی شناس

۱۲۳ ۱۰۴۰ ۱۷۷ ۵۸۱

سنہ ۱۹۲۱ء ۔ سنہ ۱۳۴۰ ہجری ۔ ۵۸۱

قطعات تاریخ طبع کتاب ہذا

نتیجہ فکر رسا عالیجناب معلی القاب نواب حاجی سید محمد جعفر علی خان صاحب بہادر رئیس اعظم شمس آباد ضلع فرخ آباد

قطعہ

امسال پس شہرہ از مرضی با نولیش — مطبوع شد این نسخہ محبوب دل مہدی

در عیسوی و ہجری اسے ماہر فن حاجی — بیگو سے بہاں سالش مرغوب دل مہدی

۵۰۲ ۱۳۴۱ھ

۱۹۲۳ء

قطعہ

مطبوع[1] ہوا ریاضِ[2] مہدی — فردوسیِ طبع یوں ہے گلچیں

غنچہ نقطے ہیں، پھول الفاظ — تاریخ ہے "گلشنِ مضامین"

۱۳۴۱ھ

---

[1] "مطبوع" ذو معنیین ہے: [2] "ریاض" جمع روضہ ہے مگر شعرا میں واحد مستعمل ہے،

فہرست مضامین

افاداتِ مہدی